اکادمی ادبیات پاکستان
پاکستانی ادب کے معمار
PAKISTAN ACADEMY OF LETTERS
مسعود مفتی: شخصیت اور فن
ڈاکٹر مقصودہ حسین

پاکستانی ادب کے معمار

مسعود مفتی
شخصیت اور فن

ڈاکٹر مقصودہ حسین

اکادمی ادبیات پاکستان

نگرانِ اعلیٰ	افتخار عارف
منتظم	ظہیر الدین ملک
تدوین و طباعت	سعید درانی
تصحیح	احمد حبیب
اشاعت	2008ء
تعداد	500
ناشر	اکادمی ادبیات پاکستان، H-8/1، اسلام آباد
مطبع	پوسٹ آفس فاؤنڈیشن پریس، اسلام آباد
قیمت	مجلد: -/270 روپے
	پیپر بیک: -/280 روپے

ISBN: 978-969-472-162-6

پیشِ نظر کتاب ہمارے واٹس ایپ گروپ کے سکالرز کی طلب پہ سافٹ میں تبدیل کی گئی ہے۔ مصنفِ کتاب کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ سافٹ بنانے والوں کے حق میں دعائے خیر کی استدعا ہے۔

زیرِ نظر کتاب فیس بک گروپ "کتب خانہ" میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔
گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

میر ظہیر عباس روستمانی

03072128068

فہرست

پیش نامہ

اکادمی ادبیات پاکستان نے 1990 میں پاکستانی زبانوں کے ممتاز تخلیق کاروں کے بارے میں "پاکستانی ادب کے معمار" کے عنوان سے ایک اشاعتی منصوبے پر کام شروع کیا تھا۔ معماران ادب کے احوال و آثار کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کے لیے یہ کتابی سلسلہ بہت مفید خدمات انجام دے رہا ہے۔ اکادمی، پاکستان کی تمام زبانوں کے نامور ادیبوں، شاعروں، افسانہ نگاروں اور نقادوں کے بارے میں کتابیں شائع کر رہی ہے۔

مسعود مفتی اردو کے عہد ساز افسانہ نگار، ممتاز ڈرامہ نگار، رپورتاژ نگار، ناول نگار، انشائیہ نگار اور کالم نگار کی حیثیت سے بے حد نمایاں شناخت کے حامل ادیب ہیں۔ خاص طور پر افسانہ نگاری اور رپورتاژ نگاری کے میدانوں میں متعدد ادبی انعامات حاصل کر چکے ہیں۔ ان کی تحریریں جہاں اپنی مٹی سے جڑی ہوئی ہیں وہیں عالمی ماحول کے کامل فہم و ادراک سے بھی پوری طرح منسلک ہیں۔ ان کے ہاں انسانی نفسیات کے تجزیے جس مہارت سے کیے گئے ہیں معاصر ادب میں اس کی مثال کم کم ملتی ہے۔ مسعود مفتی کے ہاں حقیقت نگاری کا غیر معمولی اہتمام ہے جب کہ اپنی قومی اور عالمی تاریخ سے آگہی ان کا امتیازی وصف ہے۔ وہ معاصر تقاضوں سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ احترام آدمیت کے ساتھ ساتھ ملی اور قومی دردمندی کی فراوانی کے سبب مسعود مفتی معاصر ادبی منظرنامے میں بے حد معتبر مقام و مرتبے پر فائز ہیں۔

ڈاکٹر مقصودہ حسین اردو کی معروف محقق اور نقاد ہیں۔ انہوں نے اکادمی ادبیات پاکستان کی درخواست پر "مسعود مفتی: شخصیت اور فن" تحریر کر کے ادب کی غیر معمولی خدمت سرانجام دی ہے۔

مجھے یقین ہے کہ اکادمی ادبیات پاکستان کا اشاعتی منصوبہ "پاکستانی ادب کے معمار" ادبی حلقوں کے علاوہ عوامی سطح پر بھی پسند کیا جائے گا۔

افتخار عارف

پیش لفظ

اکادمی ادبیات نے "پاکستانی ادب کے معمار" کے سلسلے میں ایک میگا پروجیکٹ 1990 میں شروع کیا تھا جو نہ صرف اردو ادب کے طالبعلموں کے لئے بلکہ عام قاری کے لئے بھی انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔اسی سلسلے کی یہ کتاب مسعود مفتی کی شخصیت اور فن کا احاطہ کرتی ہے۔ مسعود مفتی اعلیٰ پائے کے افسانہ نگار ہیں۔قومی ادب کے حوالے سے انہیں عہد حاضر کے نثر نگاروں میں ممتاز مقام حاصل ہے۔

انہوں نے اپنی عملی زندگی کے دوران گردو پیش کے حقیقی واقعات کو افسانوی رنگ میں پیش کیا۔ مشرقی پاکستان کے سانحے کے حوالے سے انہوں نے اردو زبان اور پاکستانی قوم کی خدمت اس طرح کی کہ اردو زبان کو دو رپورتاژ "ہم نفس" اور "چہرے" اور ایک ڈائری "لمحے" کا تحفہ بخشا جبکہ پاکستانی قوم کو وہاں پیش آنے والے حقیقی واقعات کی جھلک دکھا کر انہیں ان سے سبق حاصل کرنے کی نصیحت کی بقول پروفیسر فتح محمد ملک:

> ''مسعود مفتی ہم سب کو یہ گھڑی یاد دلانے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں اور گذشتہ پندرہ برس سے ہمیں اس مقام عبرت کی سیر کرانے میں مصروف ہیں''

جب اکادمی ادبیات کی طرف سے چند ماہ پیشتر مجھے مسعود مفتی کی شخصیت اور فن پر کتاب لکھنے کو کہا گیا تو میں نے اسے اپنے لئے اعزاز سمجھا۔میں محترم مسعود مفتی کی تصانیف کی باقاعدہ قاری ہوں۔''چہرے'' اور "ہم نفس" میری پسندیدہ کتابوں میں سرفہرست ہیں۔ میں مشرقی پاکستان کے سانحہ کی چشم دید گواہ ہوں کیونکہ اس المیہ سے میرا قومی تعلق ہونے کے ساتھ ساتھ ذاتی تعلق بھی ہے۔ میرے والد مرحوم کرنل محمد اکبر بھی سقوط ڈھاکہ کے وقت مشرقی پاکستان میں تعینات تھے۔وہ اڑھائی سال تک ہندوستان میں جنگی قیدی رہے۔ بعدازاں وہ قید سے رہائی تو پا گئے مگر یہ اذیت کی گرفت ان پر اتنی مضبوط تھی کہ وہ چند برس بعد دماغی رگ پھٹ جانے سے انتقال کر گئے۔

مسعود مفتی کے فن اور شخصیت پر لکھنے کے دوران میری ان سے اور ان کی بیگم سے گاہے بگاہے ملاقات ہوتی رہی۔ پہلی دفعہ جب میں مسعود مفتی کے گھر گئی تو ایک بے حد شائستہ، دھیمے لہجے کی حامل اور انتہائی

باوقار خاتون محترمہ بشریٰ مسعود مفتی سے ملاقات ہوئی۔ پہلی ہی نظر میں وہ اپنی اپنی سی لگیں۔ نپا تلا انداز، نہ ایک لفظ کم نہ ایک لفظ زیادہ۔ ان کو دیکھ کر اس مقولے پر ایمان لانا پڑا کہ ہر کامیاب مرد کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔ مسعود مفتی نے بھی بکمال مہربانی ہماری ہر درخواست پر ہمیں وقت دیا۔ اور اپنی کتابوں کا مکمل سیٹ بھی عنایت فرمایا بمع اپنے دستخطوں کے۔ اس کے ساتھ انہوں نے تین طویل نشستوں میں اپنا انٹرویو بھی ریکارڈ کروایا۔ اس انٹرویو سے ان کے خاندانی پس منظر، اہلِ خانہ، حالات زندگی، (جس میں ان کی دفتری مصروفیات بھی شامل ہیں) سے واقفیت ہوئی۔ ساتھ ہی یہ امر میرے لئے باعثِ مسرت ہے کہ اس کتاب میں بیان کردہ تمام اطلاعات مصدقہ ہیں کیونکہ "میری کہانی میری زبانی" والا معاملہ ہے۔ مجھے اس بات کو بیان کرتے ہوئے بھی انتہائی مسرت ہو رہی ہے کہ اس کتاب کے مسودے کا بھی مسعود مفتی نے مطالعہ کیا ہے اور کچھ واقعات کی تصحیح بھی کی ہے۔

یہ پیش لفظ نامکمل رہے گا اگر اس میں ان ادیبوں اور شاعروں کا شکریہ ادا نہ کیا جائے جنہوں نے میری درخواست پر مسعود مفتی کے فن اور شخصیت کے بارے میں اپنی آراء سے نوازا۔ ان میں، آصف فرخی، آفتاب اقبال شمیم، احمد فراز، امجد اسلام امجد، ڈاکٹر انور سدید، عذرا اصغر، عطاء الحق قاسمی اور ناصر زیدی شامل ہیں۔

جناب افتخار عارف کا میں خصوصی طور پر شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں کہ میری یہ کتاب انہی کی سرپرستی اور رہنمائی کی بدولت پایہء تکمیل کو پہنچی ہے۔ اور میں اس کتاب کو بہتر ادبی اسلوب کے ساتھ پیش کر سکی ہوں۔ میری یہ کاوش بھی گویا انہی کی ادبی خدمات کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ انہوں نے نہ صرف اس کتاب کی ترتیب کے سلسلے میں میری رہنمائی کی بلکہ اپنی قیمتی رائے سے بھی نوازا۔ میں اپنی انتہائی عزیز دوست سعیدہ درانی کی بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے کتاب کی ترتیب اور تزئین کے ہر ہر مرحلے پر میری رہنمائی کی۔ میں محترمہ سلمیٰ سعید کی بھی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میری معاونت کی۔ میرے خاص شکریے کے مستحق میری ہم کار محترمہ یاسمین اختر اور اسسٹنٹ محترم غلام حسین سید ہیں جنہوں نے کتاب کی پروف ریڈنگ اور کمپوزنگ میں میری مدد کی۔

یہاں میں ایک اور بات کی وضاحت بھی کرتی چلوں کہ مسعود مفتی نام کے دو ادیب ہیں۔ میں نے جس مسعود مفتی کی شخصیت اور فن پر کتاب تحریر کی ہے ان کی تمام کتب کی تفصیل اس کتاب میں موجود ہے اور اس کے علاوہ انہوں نے اور کوئی کتاب تحریر نہیں کی۔

امید کرتی ہوں کہ میری یہ کاوش اردو ادب کے شائقین کے لئے معاون ثابت ہوگی اور اردو ادب کا ہر طالب علم اس سے بہرہ مند ہوگا۔

مقصودہ حسین

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اکثر اوقات بعض چیزیں نسبتوں اور حوالوں سے بھی معتبر اور اہم ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ یہ نسبتیں اپنے اندر صدیوں کی تاریخ رکھتی ہیں۔ یہ حوالے مختلف اوقات میں مختلف ہو سکتے ہیں۔ لیکن ان سب میں سے معتبر اور مستند حوالہ انسانی شخصیت کا حوالہ ہے۔ جس کے کارناموں کے دم سے سرزمینیں سرفراز ہوتی ہیں اور پھر یہی سرفراز زمینیں کسی بھی معتبر و منفرد شخصیت کے لیے حوالہ بن جاتی ہیں۔ 'مسعود مفتی' کی شخصیت بھی گجرات اور اہل گجرات کے لیے ایسا ہی ایک مستند حوالہ بن چکی ہے۔

شہر بے مثال، گجرات

شہر ہوں یا دیہات۔ مقامات تو بے جان ہوتے ہیں۔ یہ تو وہاں کے باشندے ہیں جو ان کو اہم بناتے ہیں۔ اور انہی شخصیات کے حوالے سے کوئی جگہ دوسری جگہوں سے ممتاز ہو جاتی ہے۔ گجرات، صوبہ پنجاب، پانچ دریاؤں کی حسین سرزمین کا ایک اہم شہر ہے۔ دریائے چناب کے کنارے آباد یہ شہر، اہل پاکستان کے لئے کئی حوالوں سے معتبر ہے۔ اس مردم خیز خطہ نے وقتاً فوقتاً ایسی شخصیات کو جنم دیا جو قومی اُفق پر روشن ستارے بن گئیں۔ اپنی تابانیوں اور ضیا پاشیوں سے انہوں نے نمایاں خدمات انجام دے کر ملک وملت کے لئے آفتاب روشن کی حیثیت اختیار کر لی۔

شجاعت و بہادری کی لازوال داستانیں رقم ہوں اور میجر عزیز بھٹی شہید، نشان حیدر کا نام لبوں پر نہ آئے، صنعت وحرفت کا تذکرہ ہو اور گجرات شہر کا نام ذہن میں نہ آئے، ملک کی اقتصادی ترقی بیان کی جائے اور گجرات کی برآمدات کو نظر انداز کر دیا جائے یا پھر عشق ومحبت کے خوبصورت جذبوں کی داستان ہو اور کسی کو 'سوہنی' کا خیال نہ آئے، ممکن نہیں ہے۔ اسی شہر کے ایک ہونہار سپوت کا نام مسعود مفتی ہے جنہوں نے اپنی فطری صلاحیتوں، خداداد ذہانت اور محنت سے ملک گیر شہرت حاصل کی۔ انہوں نے نہ صرف اعلیٰ پائے کے منتظم کے طور پر اپنا لوہا منوایا بلکہ ادب کی دنیا میں بھی انہوں نے بہت اونچا مقام حاصل کیا۔ وہ بہت بڑے ادیب اور دانشور ہیں۔ بہت پُرکشش شخصیت کے مالک ہیں جنہیں اپنے وطن، اس کی مٹی اور اس کے باسیوں سے بے انتہا پیار ہے۔ ان کا یہ پیار جغرافیائی حدود وقیود سے آزاد ہے۔

خاندانی پس منظر

مسعود مفتی سے پہلی نسل کا زمانہ بیسویں صدی کا آغاز تھا جب دنیا میں مشینوں، کارخانوں اور کاروبار کا آغاز ہوا۔ اس دور میں ان کے آباؤ اجداد نے بھی کاروبار کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ وہ تدریس کے پیشے سے منسلک ہوگئے۔ مسعود مفتی کا کہنا ہے:۔

''ہم لوگ کاروباری ذہنیت نہیں رکھتے یہی وجہ ہے کہ بعد میں سب کے سب سروس سے وابستہ ہوگئے۔''

کاروبار میں ناکامی کی وجہ مزاج کی ناموافقت کے ساتھ سرمائے کی کمی بھی تھی۔ یہ لوگ زمین دار تو تھے نہیں۔ اس خاندان کا کل سرمایہ تعلیم ہی تھا اور کاروبار کے لئے صرف تعلیم کا ہونا شاید ناکافی ہے۔ اس کے ساتھ کاروباری ذہن اور کثیر سرمائے کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔

ان کے گھرانے کا پس منظر تعلیمی، علمی اور مذہبی تھا اس گھرانے کے مرد شعبہ تعلیم سے وابستہ تھے۔ ان کے والد محکمہ تعلیم میں اعلیٰ انتظامی عہدے پر فائز تھے۔ یہ وہ دور تھا جب تدریس کے پیشے کو بہت معزز سمجھا جاتا تھا، معاشی طور پر بھی یہ شعبہ اچھا شمار کیا جاتا تھا۔ کیونکہ زندگی اتنی آسائشوں کی طلبگار بھی نہ تھی۔ ان کا کہنا ہے:۔

> ''اس وقت معاشرے میں استاد اور شاگرد کا روحانی تعلق بھی اتنا نہیں بگڑا تھا۔ اگر ایک طرف شاگرد اپنے اساتذہ کرام کا دل سے احترام کرتے تھے تو دوسری طرف استاد بھی ایسی ہی عزت وتوقیر کے مستحق تھے۔ وہ واقعی استاد کے بلند مقام ومرتبہ پر فائز تھے جن کو ہر لمحے اپنے شاگردوں کی بہتری اور تربیت کا خیال رہتا تھا۔ زندگی آسان اور سادہ تھی۔ Status کے پیچھے بھاگنے کا رجحان ابھی معاشرے میں پیدا نہ ہوا تھا۔ مختصراً اس وقت تک تعلیم کے شعبے میں وہ برائیاں نہ تھیں جو فی زمانہ آچکی ہیں۔ اساتذہ کو شرفاء میں شمار کیا جاتا تھا اور اچھے گھرانوں کے نوجوان بھی اس شعبے سے منسلک ہونے کی خواہش رکھتے تھے۔''

مسعود مفتی کا تعلق ایک پڑھے لکھے متوسط گھرانے سے ہے۔ ان کے تایا مفتی عزیز الرحمٰن قیام پاکستان سے قبل پشاور میں گورنمنٹ اسلامیہ کالج اور کنگ ایڈورڈ کالج کے پرنسپل رہ چکے ہیں۔ ان کے صاحبزادے انوار مفتی اے پی پی میں منیجر تھے جن کا عین عالم شباب میں انتقال ہوگیا۔

ان کی خاندانی جائیداد جو رہائشی مکانوں، چند دکانوں یا چھاپہ خانہ کی شکل میں تھی، مقدمہ بازی کی نذر ہوگئی۔ سرکاری ملازمتوں میں سب بکھرتے چلے گئے اور جہاں جہاں جس کو موزوں لگا، وہیں مستقل مقیم

ہوتا گیا۔ اور یوں یہ سب گجرات سے دور ہوتے ہوتے بالکل ہی دور ہو گئے اور انہوں نے اسلام آباد میں اقامت کو پسند کیا۔ بقول مسعود مفتی:۔

> ''گجرات سے اب ہمارا تعلق محض کاغذی ہی رہ گیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جب میرا کمشنر راولپنڈی کی حیثیت سے گجرات جانا ہوا تو نہ میں وہاں کسی کو جانتا تھا اور نہ کوئی مجھے۔''

والدین

مسعود مفتی کے والد مفتی محمد زمان کا تعلق محکمہ تعلیم سے تھا۔ وہ نہایت بااصول، راسخ العقیدہ اور دین دار مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ ایک روشن خیال ذہن کے مالک تھے۔ ان کی ذات اپنے بچوں کے لئے ایک ''رول ماڈل'' تھی۔ وہ جو کچھ کہتے اس کا عملی نمونہ بھی اپنے کردار سے پیش کرتے۔ اصول پرست ہونے کی وجہ سے ان کے گھر میں نظم وضبط کو ایک خاص دخل تھا۔ والدہ محترمہ کنیز فاطمہ بھی بااصول اور محنتی خاتون تھیں۔ اگرچہ مسعود مفتی کے والد اور والدہ کے آپس کے تعلقات کچھ زیادہ مثالی نہیں تھے۔ تاہم اس بات پر دونوں کا اتفاق تھا کہ اولاد کی تربیت میں نرمی اور سختی کا مناسب امتزاج ضرور ہونا چاہیے۔

مسعود مفتی کے والد کو ملازمت کے سلسلے میں مختلف جگہوں پر رہنا پڑا لیکن جب ان کے بچے بڑے ہوئے تو انہوں نے تعلیم کی خاطر بچوں کو لاہور میں ہی رکھا۔ اس لحاظ سے بھی محترمہ کنیز فاطمہ بڑی باہمت اور جرأت مند خاتون نظر آتی ہیں جنہوں نے اپنے بچوں کی تمام ذمہ داریاں بہ حسن وخوبی نبھائیں۔

بہن بھائی

مسعود مفتی، نو بہن بھائی ہیں۔ جن میں سات بھائی اور دو بہنیں ہیں۔ ایک بھائی کا کم سنی میں انتقال ہوگیا۔ باقی چھ بھائیوں میں مسعود مفتی پانچویں نمبر پر ہیں۔ سب سے بڑے بھائی مجیب الرحمٰن مفتی تھے جو جائنٹ سیکرٹری کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ ان کا راولپنڈی میں کار کے حادثے میں انتقال ہوا۔ وہ شگفتہ نثر لکھتے تھے۔ ان کے مضامین کا ایک مجموعہ ''فی سبیل اللہ'' کے نام سے مطبوعہ صورت میں یادگار ہے۔ دوسرے نمبر پر سعید الرحمٰن مفتی ہیں جو 'MET' آفس سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ تیسرے نمبر پر جمیل الرحمٰن مفتی ہیں۔ وہ واہ آرڈیننس فیکٹری سے ورکس منیجر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ ان کے بعد قمر الرحمٰن مفتی ہیں جو پنجاب گورنمنٹ سے بطور چیف انجینئر ریٹائر ہوئے

ہیں۔ پھر مسعود مفتی ہیں جن سے چھوٹے ڈاکٹر عتیق الرحمٰن مفتی Nuclear سائنسدان ہیں یہ بھی آج کل ریٹائرڈ زندگی گزار رہے ہیں۔

مسعود مفتی کی دو بہنوں میں سے بڑی بہن زبیدہ مفتی (جو سب بہن بھائیوں بڑی ہیں) کا 82 برس کی عمر میں 2005ء میں انتقال ہو گیا۔ کئی برس وہ ایک انڈسٹریل ہوم چلاتی رہیں۔ انہوں نے شادی نہیں کی۔ انکی تمام عمر فلاحی کاموں میں گزری۔ اپنے ادارے میں لڑکیوں کو دستکاری کے ہنر سکھاتیں پھر انہی سے کام کرا کے مارکیٹ میں بھیجتی تھیں۔ ان کے پاس زیادہ تر لاہور کے گردونواح کی غریب لڑکیاں آتیں وہ ان غریب بچیوں کو مفید ہنر سکھا کر ان کے ذریعہ آمدن کا بندوبست کرتی تھیں۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ یہ پورا ادارہ محترمہ زبیدہ مفتی تن تنہا بغیر کسی سرکاری گرانٹ کے کئی برس چلاتی رہیں۔ دوسری بہن جن کا بہن بھائیوں میں چوتھا نمبر ہے، ان کی شادی اپنے کزن (خالہ زاد) سے ہوئی تھی، جو چیف انجینئر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ ان کی اولاد اس وقت جوان ہے اور سب ہی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔

موجودہ نسل میں بھی ان کے خاندان کے کسی فرد کا رجحان تجارت کی طرف نہیں ہے۔ کثیر العیال ہونے کے باوجود والدین کی مثالی شخصیت اور خصوصی تربیت ہی کا اثر تھا کہ ان کی اولاد نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے۔ خود مسعود مفتی نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ:-

> "اکثر اوقات میں نے اپنے دوستوں سے اس بات پر بحث کی کہ گو ہمارے والد نے کبھی بھی بظاہر وعظ و نصیحت سے کام نہیں لیا پھر بھی ان کی شخصیت ہماری زندگیوں پر بہت اثر انداز ہوئی۔ گو ہم سب بھائی گورنمنٹ کے مختلف شعبوں اور مختلف عہدوں پر کام کرتے رہے جن میں سول سروس، پی ڈبلیو ڈی، سیکرٹریٹ، ڈیفنس اور سائنس کے شعبہ جات شامل ہیں، مگر ہم سب کا طرزِ عمل، ہماری عملی زندگیوں میں تقریباً ایک جیسا ہی رہا۔"

بلاشبہ یہ ان کے عظیم المرتبت والدِ گرامی کی شخصیت کا اثر ہے کہ ان کی اولاد نے اپنے اپنے شعبوں میں نمایاں کامیابی حاصل کرنے کے ساتھ مثالی زندگیاں گزاریں۔ افکار و کردار کا جو عملی نمونہ والدین کے کردار کی شکل میں بچوں کے سامنے آتا ہے اس کا اثر بہت گہرا اور پائیدار ہوتا ہے۔ بچے والدین کو اپنے لیے ماڈل مانتے ہوئے، شعوری یا لاشعوری طور پر اس کو اپناتے ہیں۔ مسعود مفتی نے بھی اپنے والدین کی تمام خصوصیات سے گہرا اثر لیا۔ بقول ان کے:-

"Somehow or other we followed it"

حالاتِ زندگی

ایک متوسط گھرانہ، بڑا کنبہ، کم آمدن، شوہر انتہائی ایماندار، ان حالات میں خاتونِ خانہ کو مالی مشکلات کا اکثر سامنا رہتا تھا۔ لیکن انتہائی صابر و شاکر خاتون تھیں۔ وہ باقاعدہ بجٹ بنا کر پیسہ خرچ کرتیں۔ ان کی ترجیحات متعین تھیں۔ جس میں پہلی ترجیح خوراک ہوتی جبکہ دوسری ترجیح کتابوں یا تعلیم سے متعلقہ اشیاء کی خریداری تھی۔ نمود و نمائش کی کوئی چیز ان کی نظر میں اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ انہوں نے ہمیشہ ہی قناعت اور کفایت کو اپنا شعار بنایا اور کبھی اپنے خاوند پر گھریلو اخراجات کے سلسلے میں کسی قسم کا ناجائز دباؤ نہیں ڈالا۔

مسعود مفتی کے والد اولاد کی اخلاقی تربیت کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ بچوں کی اخلاقی تربیت پر زور دینا چاہیے اگر یہ اچھے انسان ہوں گے تو ضرور کچھ نہ کچھ بن جائیں گے۔ لیکن اس کے برعکس والدہ ہمیشہ تعلیم حاصل کرنے اور زندگی میں آگے بڑھنے کی تلقین کرتی تھیں۔ اس طرح اگر بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو دونوں ایک دوسرے سے مختلف خیالات رکھتے تھے جن کے ان کی اولاد پر مثبت اثرات مرتب ہوئے۔

اپنے والدین کا ذکر کرتے ہوئے وہ ہمیشہ بہت جذباتی ہو جاتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ دونوں کی شخصیت انتہائی Unique (منفرد) تھی۔ وہ بڑی مضبوط شخصیت کے حامل تھے۔ انہوں نے اپنی اولاد پر مثبت اثرات چھوڑے ہیں۔ بچپن کے واقعات کو دہراتے ہوئے وہ دونوں کی عظمت کو یاد کرتے ہیں۔ والد نے ہمیشہ خودداری اور عزتِ نفس کو ترجیح دی اور اپنی ذات کو بچوں کے لیے مثالی نمونے کے طور پر پیش کیا۔

دلچسپ ترین بات یہ ہے کہ دونوں کی الگ الگ شخصی انفرادیت تھی لیکن ڈسپلن یا تربیت کا معاملہ ہوتا تو والدہ ہمیشہ اپنے خاوند کے تمام سخت اصولوں کو بچوں پر لاگو کرتی تھیں۔ والد درویش صفت انسان تھے۔ اگر ہم ان کی اولاد کے عہدوں اور کردار پر نظر ڈالیں تو محسوس یہ ہوتا ہے کہ دونوں کی سوچ درست تھی جس کی بناء پر ان کی اولاد نے اعلیٰ عہدے بھی حاصل کیے۔ وہ اخلاق و کردار کا عمدہ نمونہ بھی تھے۔ قدیم و جدید کا خوبصورت اور بھرپور امتزاج ان کی شخصیت میں نظر آتا ہے۔

ابتدائی تعلیم

اس دور میں شرفاء اپنے بچوں کی ابتدائی تعلیم کا آغاز عموماً گھروں سے کرتے۔ مسعود مفتی نے بھی تعلیم کا باقاعدہ آغاز اسلامیہ ہائی سکول مری روڈ میں تیسری جماعت میں داخلے سے کیا۔ اس سکول سے ان کی وابستگی قریباً چھ برس رہی۔ اُس زمانے میں ہولی فیملی ہسپتال کے نزدیک اس سکول کی ایک پرائمری برانچ ہوا کرتی تھی۔ اسی برانچ میں انہوں نے 1941 میں داخلہ لیا۔ اپنے بچپن کو وہ یوں دہراتے ہیں:-

"ہمارے گھر میں ہر طرف کتابیں ہی کتابیں نظر آتی تھیں۔ الماریوں میں کتابیں، میزوں پر کتابیں، بوریوں میں کتابیں حتیٰ کہ تاریک کمروں میں کتابیں ہی کتابیں۔ ہمارے گھر کے ساتھ ہی "نذر مُسلم لائبریری" بھی موجود تھی۔"

اپنی فطری ذہانت، محنت اور لگن، کتابوں سے آشنائی کی وجہ سے جلد ہی یہ اپنے ہم جماعتوں میں ممتاز نظر آنے لگے۔ اور ساتھ ہی اپنے اساتذہ کے بھی منظورِ نظر قرار پائے۔ انہوں نے اپنی تمام تر کامیابیوں کا کریڈٹ اپنے والدین اور اساتذہ کو دیتے ہوئے کہا کہ:-

"میں اس معاملے میں بہت خوش قسمت واقع ہوا ہوں کہ مجھے ابتداء ہی سے اچھے گھریلو ماحول کے ساتھ ساتھ بہت قابل، شفیق اور محنتی اساتذہ سے تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا ہے۔ اُس وقت اسلامیہ ہائی سکول میں بہترین اساتذہ موجود تھے جو بطور "رول ماڈل" بھی مجھ پر اثر انداز ہوئے۔"

اسلامیہ ہائی سکول مری روڈ راولپنڈی

پرائمری برانچ سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد یہ اسلامیہ ہائی سکول کی اُس برانچ میں داخل ہوئے جو اس وقت کے کمپنی باغ اور موجودہ لیاقت باغ کے نزدیک تھی۔ یہ بہت پُر فضا مقام تھا۔ اس سکول کو یاد کرتے ہوئے انہوں نے والہانہ انداز میں کہا:-

"اب تو اس جگہ سے گزریں تو اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ یہاں پر کوئی سکول موجود ہے۔ لیکن اس وقت کا نقشہ کچھ یوں تھا کہ اس کے ایک طرف کمپنی باغ تھا۔ دوسری طرف اسلامیہ ہائی سکول کا وسیع گراؤنڈ جس میں بڑے بڑے درختوں کے پیچھے میں اس کی عظیم الشان عمارت ایک پُر شکوہ منظر پیش کرتی تھی۔ عمارت

کے ساتھ ہی سکول کی مسجد بھی تھی۔ بہت اچھا ماحول تھا۔ اب تو چونکہ دیواریں
اور مختلف قسم کی عمارتیں اس کے اطراف میں بن گئی ہیں اس وجہ سے
اسلامیہ ہائی سکول پس پشت چلا گیا ہے۔"

اس سکول میں وہ 1941ء سے لیکر 1944ء تک زیر تعلیم رہے۔ یہ وہ دور تھا جب برصغیر پاک و ہند میں مسلم لیگ کی تحریک زور پکڑ رہی تھی۔ راولپنڈی کے تعلیمی اداروں میں Polarization بہت زیادہ تھی۔ اسلامیہ ہائی سکول مسلمانوں کا مرکز تھا۔ عام طور پر سرکاری ملازمین کے بچے، یا وہ لوگ جو انگریزوں اور انگریز حکومت کے قریب رہنا چاہتے تھے وہ اپنے بچوں کو "ڈینیز ہائی سکول" بھیجا کرتے، ہندوؤں کے بچے ڈی اے وی ہائی سکول، سکھوں کے بچے خالصہ ہائی سکول اور قوم پرست مسلمان یا وہ گھرانے جن کی تحریک پاکستان سے وابستگی تھی، اپنے بچوں کو اسلامیہ سکولز یا اسلامیہ کالجز میں بھیجنا پسند کرتے تھے اور یہ ادارے مسلمانوں کے لیے مرکز کی حیثیت اختیار کرتے جا رہے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ قائداعظمؒ نے بھی کئی بار ان اداروں کا دورہ کیا۔ ان اداروں کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ قائداعظمؒ نے یہاں کئی بار نوجوانوں سے خطاب کیا۔ اُس زمانے میں بقول مسعود مفتی:۔

"اساتذہ کرام بہت اچھے ہوتے تھے۔ اچھے سے میری مراد یہ ہے کہ وہ اپنے
پیشے کے ساتھ انتہائی مخلص (devoted) اور اپنے محکمے میں اچھے الفاظ میں
جانے جاتے تھے۔ عبدالرحمٰن، انتہائی قابل اور شفیق ہیڈ ماسٹر تھے۔ تمام اساتذہ
بہت محنتی تھے۔ لیکن میں خاص طور پر دو اساتذہ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے
میری شخصیت کی نشوونما اور رہنمائی کی۔ یہ سید عبدالرحیم شاہ (جن کا حال ہی میں
انتقال ہوا ہے) اور صُوفی محمد زمان (جو حیات ہیں اور راولپنڈی میں ہی مقیم
ہیں)۔ ان دو حضرات کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ سکول میں جتنی بھی
ہم نصابی اور غیر نصابی سرگرمیاں ہوتی تھیں وہ ان ہی دو حضرات کی
مرہونِ منت تھیں۔ بزم ادب، مشاعرے، ڈرامے وغیرہ، انہیں اگر کسی لڑکے
میں 'Talent' نظر آتا تو اُسے آگے بڑھنے میں مدد دیتے۔"

اسلامیہ سکول کے سالانہ جلسوں کو بہت اہمیت حاصل تھی۔ بنیادی طور پر یہ fund raising یعنی چندہ اکٹھا کرنے کے لیے منعقد کئے جاتے جو مسلسل تین روز تک ہوتے تھے۔ اس میں ہر روز دو مجالس ہوتی تھیں۔ ان جلسوں میں نہ صرف راولپنڈی کی معتبر شخصیات کو مدعو کیا جاتا بلکہ برصغیر

کے مسلمان اکابرین کو تقاریر کے لیے بلایا جاتا تھا۔ان کے زمانہ طالب علمی میں دہلی، امرتسر، پشاور، علی گڑھ اور لاہور سے کئی علمائے کرام نے طلبہ سے خطاب فرمایا۔ ان جلسوں کے کامیاب انعقاد میں بھی سید عبدالرحیم شاہ اور صوفی محمد زمان کی لگن اور ہمت کارفرما تھی۔ اسی طرح کامیاب مشاعرے بھی منعقد کرائے گئے۔جن میں نہ صرف مقامی شاعر بلکہ برصغیر بھر کے شعرائے کرام شرکت فرماتے۔ بعد میں چندہ بھی اکٹھا کیا جاتا۔ایسے ہی کچھ جلسوں کی اور ان میں آنے والی معزز شخصیات کی تفصیل درج ذیل ہے:۔

وائس چانسلر علی گڑھ یونیورسٹی کی آمد

علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی ایک دفعہ سالانہ جلسے میں شریک ہوئے۔اپنی یادوں کو ذہن میں دہراتے ہوئے مسعود مفتی فرماتے ہیں کہ وہ اس وقت بہت کم عمر تھے لیکن وہ جلسہ انہیں آج بھی یاد ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں تلاوت قرآن پاک کی سعادت ان کے حصے میں آئی۔

چوھدری خلیق الزمان

اسلامیہ ہائی سکول کے ایسے ہی ایک جلسے میں نامور مسلم لیگی رہنما چوہدری خلیق الزمان بھی تشریف لائے۔ان کا استقبال کرنے کے لیے طلباء ایک جلوس کی شکل میں ریلوے سٹیشن گئے۔سب کے ہاتھوں میں چھوٹی چھوٹی جھنڈیاں تھیں۔اور بچوں کے لیے وہ دن گویا ایک تہوار تھا۔

سکول کے جلسے میں قائدِاعظمؒ کی آمد

مسعود مفتی فرماتے ہیں کہ میری زندگی کا ایک یادگار واقعہ وہ ہے جب قائداعظمؒ نے ایک جلسے سے خطاب کیا۔وہ کہتے ہیں کہ آج بھی وہ واقعہ ذہن میں ایک انتہائی خوشگوار یاد کی صورت میں روز اول کی طرح تر و تازہ ہے۔اس کا احوال انہی کی زبانی کچھ یوں ہے:۔

> "میرا خیال ہے کہ یہ غالباً 1943ء کا زمانہ تھا جب قائداعظمؒ سکول کے سامنے کمپنی باغ کے جلسے میں تشریف لائے تھے۔لیکن صادق نسیم صاحب نے اپنی کتاب "روشنی چراغوں کی" میں ذکر کیا کہ قائداعظمؒ 26 جولائی 1944ء کو تشریف لائے تھے۔ بعد میں ہم دونوں نے اس پر گفتگو بھی کی اور ثابت ہوا کہ

یہی تاریخ درست ہے۔ قائداعظم کشمیر سے تشریف لا رہے تھے۔ طلباء کے
استقبالی دستوں نے مری روڈ پر "سترہ میل" کے مقام پر جا کر خیر مقدم کیا تھا۔
26 جولائی کی شام کو وہ ایک سپورٹس کار میں جس کی چھت کھلی تھی، کھڑے ہو کر
مری روڈ سے ایک جلوس کی شکل میں گزرے۔ میں اپنے دیگر افراد خانہ کے
ہمراہ اصغر مال پر، جہاں آج کل جیولرز کی دکانیں ہیں کھڑا تھا۔ اگلے روز شام
کے وقت کمپنی باغ میں قائداعظم نے خطاب فرمایا۔ ان کی تقریر انگریزی میں
تھی۔ بعد میں اس کا ترجمہ کیا گیا۔ مجھے اُس وقت اتنی سمجھ تو تھی نہیں، بس اُن
کے الفاظ اپنے ذہن میں لاتا اور سوچتا کہ مطلب کیا ہے؟ میں سٹیج کے بہت
قریب ہونے کی وجہ سے ان کو بہت نزدیک سے دیکھ رہا تھا۔ لیکن اپنے آپ کو
ایک طلسماتی دنیا میں پا رہا تھا۔ کچھ ایسی کیفیت تھی کہ بیان کرنا مشکل ہو رہا
ہے۔ میں خود کو بھول چکا تھا۔"

خاکسار تحریک

جب وہ پرائمری کے طالب علم تھے تو خاکسار تحریک زوروں پر تھی۔ ہندو بڑی حیرت سے مسلمان خاکساروں کی پریڈ دیکھا کرتے کیونکہ اُس میں مسلمان بچے بھی بڑوں کے ساتھ ساتھ حصہ لیا کرتے تھے۔ پانچویں جماعت سے مسعود مفتی نے بھی خاکساروں کی اس پریڈ میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ خاکساروں کے کیمپ اسلامیہ ہائی سکول کے گراؤنڈ میں بھی لگتے رہے خاص طور پر 1941 اور 1942 میں۔ انگریزوں نے اس وقت خاکسار تنظیم پر عسکری تنظیم ہونے کی وجہ سے پابندی لگا دی تھی۔ یہ وہ تنظیم تھی جس نے کسی سے ایک پائی بھی بطور چندہ وصول نہ کیا۔ یہ سب لوگ 'آئیڈلسٹ' تھے۔ ایسے ہی ایک کیمپ میں مسعود مفتی نے بھی شرکت کی۔ وہ فرماتے ہیں:-

"پابندی کی وجہ سے بیلچے تو ہم نہیں اُٹھا سکتے تھے البتہ وردی پہننے کی اجازت تھی۔
یہ کیمپ سات دن کا تھا جس میں بھنے ہوئے چنوں اور سادہ پانی کے سوا کچھ
کھانے کو نہ ملا۔"

خاکسار تنظیم پر پابندی لگنے کے چند سال بعد مسلم لیگ کی مقبولیت نے سیاسی منظر نامہ یکسر تبدیل کر دیا اور وہی لوگ مسلم لیگ کا سبز پرچم اٹھا کر پاکستان زندہ باد کے نعرے لگانے لگے۔ ان کے بچپن کا دور وہ تھا جب برصغیر پر دوسری جنگِ عظیم کے اثرات نمایاں تھے۔ بقول مسعود مفتی :-

"دوسری جنگِ عظیم کا زمانہ سخت نظم و ضبط بلکہ بڑی گھٹن کا زمانہ تھا۔"

دوسری جنگِ عظیم کے دوران 1942 میں کانگریس نے "ہندوستان چھوڑ دو تحریک" کے ساتھ ہی "سول نافرمانی کی تحریک" بھی شروع کر دی۔ کانگریسیوں نے ہندوستان کے طول و عرض میں توڑ پھوڑ، گھیراؤ جلاؤ اور ریل کی پٹڑیاں اکھیڑنا شروع کر دیں۔ اور اس طرح سے ملک بھر میں افراتفری کا دور دورہ ہو گیا۔ انتہائی پُرتشدد دور تھا۔ مسلم لیگ اس دوران مسلمانوں میں بہت مقبول ہو رہی تھی۔ سیاسی بیداری کا زمانہ تھا، برصغیر کے سیاسی حالات نہایت تیزی سے تبدیل ہو رہے تھے اور آزادی کی منزل قریب سے قریب تر ہوتی نظر آ رہی تھی۔

بچپن

مسعود مفتی کے والد ملازمت کے سلسلے میں پاکپتن میں تعینات تھے کہ وہاں پر ان کے ہاں 10 جون 1934ء کو ایک بیٹے کی ولادت ہوئی جس کا نام مسعود الرحمٰن رکھا گیا جنھوں نے دنیائے ادب میں مسعود مفتی کے نام سے شہرت حاصل کی۔ پیدائش تو مسعود مفتی کی پاکپتن کی ہے لیکن ان کے ذہن میں اس شہر کی کوئی یاد محفوظ نہیں اس کے بعد وہ گجرات آئے لیکن یہاں کی یادیں بھی بڑی دھندلی اور غیر واضح ہیں۔ گجرات سے جب ان کے والد کا تبادلہ 1938 یا 1939 میں راولپنڈی بطور ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز ہوا تو ان کا خاندان راولپنڈی منتقل ہو گیا۔ اس وقت غالباً ان کی عمر چار یا پانچ برس تھی۔ اس لیے راولپنڈی شہر کی یادیں ان کے ذہن میں واضح اور صاف ہیں۔

بچپن کا یہ زمانہ دوسری جنگِ عظیم کا زمانہ تھا۔ بقول مسعود مفتی :-

"اوپر جہاز اڑتے تھے اور ہم دیکھا کرتے تھے۔"

راولپنڈی اس وقت برصغیر میں انگریزوں کی افواج کا "نارتھ زون ہیڈ کوارٹر" تھا جس کی وجہ سے یہاں اکثر انگریز اور آسٹریلوی افواج آتی جاتی تھیں۔ مسعود مفتی کے بچپن کا ایک اہم اور دلچسپ مشاہدہ ان افواج کی پریڈ تھی۔ جب کبھی میدان میں پیراشوٹ کے ذریعے جہاز سے چھلانگ لگانے کی مشق ہوتی تو یہ بھی ان کے لیے بہت ہی دلچسپ نظارا ہوتا۔ یہ مشقیں اس وقت کے زرعی فارم میں لگائی جاتیں جو شہر سے کافی دور تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ وہاں جا کر مشاہدہ کرتے۔ یہ ان کی تفریح کا ذریعہ تھا۔ اب یہ جگہ شہر کا گنجان آباد حصہ بن چکی ہے جہاں بارانی یونیورسٹی، اس سے ملحقہ کئی تعلیمی ادارے اور رہائشی آبادیاں ہیں۔

بچپن کے چند واقعات

بھنگڑیل کا دورہ

مسعود مفتی کے والد دوران ملازمت اکثر راولپنڈی کے گرد و نواح میں سکولوں کے دورے پر جاتے تھے۔ اگر دورہ دن بھر کا ہوتا تو کبھی کبھار وہ اپنے بچوں کو بھی ساتھ لے جاتے۔ راولپنڈی شہر اس وقت تک اتنا پھیلا ہوا نہیں تھا۔ موجودہ راول ڈیم کی جگہ ایک آبشار تھی جس کے پاس ایک گاؤں تھا جس کا نام بھنگڑیل تھا جگہ قریب تھی اس لیے وہ ایک بار مسعود مفتی اور ان کے بھائی کو بھی ساتھ لے گئے۔ اس وقت وہ اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز کے عہدے پر فائز تھے۔ یہ دورہ دو دن کا تھا۔ دونوں بچے دن بھر آبشار سے مچھلیاں پکڑنے میں مشغول رہے۔ سکول کا چپڑاسی ان کے ساتھ تھا واپسی پر بچے اپنے والد کے ساتھ تانگے پر بیٹھے ہوئے تھے اور ساتھ ساتھ اس سکول کے ایک ماسٹر صاحب سائیکل پر آ رہے تھے۔ والد کی نظر جب مسعود مفتی کی جیب پر پڑی تو انہیں اندازہ ہوا کہ یہ کچھ پھولی ہوئی ہے۔ پوچھا کیا ہے؟ انہوں نے کہا یہ اُبلا ہوا انڈا ہے جو ماسٹر صاحب نے انہیں دیا ہے۔ والد نے سرزنش کی کہ منع کرنے کے باوجود کسی سے چیز کیوں لی؟ ماسٹر صاحب کے سامنے والد نے وہ انڈا لے کر تانگہ بان کو دے دیا اور خود انہیں سزا کے طور پر ایک زوردار تھپڑ مارا۔ ان کا کہنا ہے کہ آج بھی وہ اس تھپڑ کے درد کو محسوس کر سکتے ہیں اور شاید اسی تھپڑ کے درد نے آگے چل کر عملی زندگی میں ان کے دامن کو صاف رکھا۔ مسعود مفتی کہتے ہیں "والد صاحب ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ اگر راہ میں پڑی ہوئی چونی بھی مل جائے تو اسے وہیں پڑا رہنے دو۔ ایسا نہ ہو کہ جس کی گری ہو وہ واپس آئے اور مایوس ہو۔" اس طرح کے واقعات نے ان کی اور ان کے بھائیوں کی اخلاقی تربیت میں بہت اہم کردار ادا کیا۔

پتنگ بازی

ان کے والد تربیت کے ساتھ بچوں کی دلچسپی اور تفریح کا بھی خیال رکھتے۔ وہ ان کو بچپن کے تمام

معصوم کھیلوں میں شرکت کی اجازت تو دے دیتے تاہم ساتھ ہی کچھ بندشیں بھی لگا دیتے۔ مثلاً بسنت کے موسم میں جب بچے ہر طرف پتنگ اڑا رہے ہوتے خود جا کر بازار سے ڈور اور پتنگ لا کر دیتے مگر اس احتیاط کے ساتھ کہ ڈور مانجھے کی نہ ہو۔ تاکید کرتے کہ پیچ نہ لڑانا اور دوسرے لڑکوں کو اپنی چھت پر نہ لانا۔ اسی طرح وہ کسی بھی کھیل میں شرط لگا کر کھیلنے سے منع کرتے۔ دراصل ان کی تربیت اس اصول پر تھی کہ ہر فرد کو اپنے طرزِ عمل کے لیے خود ہی اپنی حدود مقرر کر لینا چاہیے۔ اور ان حدود سے تجاوز ہرگز نہیں کرنا چاہیے۔ وہ بچوں کو سختی سے منع کرتے کہ وہ کتابوں کے خلاصے نہ پڑھیں۔ وہ ٹیوشن پڑھانے کے بھی سخت خلاف تھے۔ عملی جدوجہد کو زندگی کا مقصد جانتے وہ 'Short cuts' کے شدید مخالف تھے۔ لباس کے معاملے میں بھی خاص خیال رکھتے اور ہمیشہ اچھا لباس پہناتے۔ مسعود مفتی کی بہنیں بچپن میں اکثر فراک میں ملبوس رہتیں۔ ان کی والدہ بتایا کرتیں کہ مسعود مفتی کے ایک تایا نے ان کے گھر آنا جانا اس وجہ سے چھوڑ دیا تھا کہ بچے مغربی لباس یعنی نیکر اور فراک پہنتے ہیں۔ اُس دور میں فراک، پتلون اور نیکر وغیرہ کو مغربیت کی علامت سمجھ کر ناپسند کیا جاتا تھا۔

زندگی کی پہلی فِلم

ان کے بچپن میں ٹی وی تو شروع ہی نہیں ہوا تھا لیکن فلمیں سینما ہاؤس میں لگا کرتی تھیں۔ فلم کا دیکھنا ان کے والد کے خیال میں بُرا نہیں تھا۔ لیکن ان کا یہ کہنا تھا کہ فلمیں ایک خاص عمر کو پہنچ کر ہی دیکھنی چاہییں۔ مسعود مفتی نے پہلی فلم اس وقت دیکھی جب وہ بی۔ایس۔سی کر چکے تھے۔ پہلی دفعہ ان کے والد سب بیٹوں کو خود فلم دکھانے لے گئے۔ یہ فلم "فال آف برلن" تھی۔

کلامِ پاک کا ترجمہ اور علامہ اقبالؒ کے اشعار

اپنے بچپن کی بہت سی باتوں میں سے دو باتیں اپنے والد کی خاص طور پر یاد ہیں۔ جن سے وہ بہت متاثر ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کے والد کا روزمرہ کا معمول تھا کہ صبح جب شیو کرتے تو اپنے اردگرد بچوں کو بٹھا لیتے، ساتھ ساتھ قرآن پاک ترجمے سے پڑھاتے رہتے۔ اس طرح قرآن فہمی کا شعور ان کے بچوں میں اسی زمانے سے پیدا ہوا۔ مسعود مفتی کے والد کو علامہ اقبالؒ سے بھی عشق کی حد تک لگاؤ تھا۔ وہ ان کے سچے اور پکے شیدائی تھے، ان کی باتیں اور اشعار اکثر اپنے بچوں کو سنایا کرتے تھے۔ ان دنوں پیری مُریدی کا بہت رواج تھا، لیکن ان کے والد اس کے بہت خلاف تھے اور شہر کی جس مسجد میں مسعود مفتی نماز پڑھتے تھے اس کے مولوی صاحب بھی جمعہ کے وعظ میں پیری مُریدی کے خلاف تلقین کیا

کرتے تھے۔ان تمام چیزوں نے مسعود مفتی کے ذہن میں مذہب کے تصور کو ایک خاص نہج پر ڈال دیا۔ یہ نہج رواج اور روایت سے ہٹ کر استدلال کی طرف مائل تھی۔آگے چل کر تعلیم نے ان خصوصیات کو مزید جلا بخشی۔اوران کا رجحان بچپن سے ہی روایت سے حقیقت کی تلاش کرنے کی طرف ہوتا چلا گیا۔

اساتذہ کا احساسِ ذمہ داری اور والدین کے مثبت رویے

مسعود مفتی کے اسکول کے زمانے کا ایک واقعہ ان کے گھر کے ماحول اوران کے والد گرامی کی شخصیت کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ ساتویں جماعت میں تھے کہ تعلیمی سال کے دوران کسی مضمون کا کورس مکمل نہ ہوسکا۔متعلقہ استاد، سید عبدالرحیم شاہ نے طلباء سے کہا کہ وہ ہر روز صبح سکول کے مقررہ وقت سے ایک گھنٹہ پہلے سکول آیا کریں۔اگلے روز جب مسعود مفتی صبح سویرے سکول جانے کے لیے تیار ہونے لگے تو ان کے والد نے جلدی جانے کا سبب پوچھا۔جب ان کو وجہ معلوم ہوئی تو یہ کہہ کہ مسعود مفتی کو جانے سے منع کردیا کہ "وہ استاد ہی کیا ہے جو مقررہ مدت میں کورس ختم نہ کراسکے۔" سکول کے ہیڈ ماسٹر عبدالرحمٰن گجرات کے رہنے والے تھے۔ان کے والد چونکہ اس وقت انسپکٹر آف سکولز تھے اور رہنے والے بھی گجرات کے ہی تھی اس لیے دونوں ایک دوسرے کو جانتے تھے۔وہ جب استاد کے حکم کے مطابق سکول نہیں گئے تو انہیں اس روز سزا ملی۔ساتھ ہی جب نہ آنے کا سبب معلوم ہوا تو مسعود مفتی کو یہ کہہ کر ڈانٹ پلادی کہ "یہ میرا حکم تھا یا تمہارے والد کا؟" اب مسعود مفتی کے لیے بڑا کٹھن وقت تھا۔ ایک طرف تو ان کو والد کا خوف تھا، دوسری طرف اپنے ہم جماعتوں کے سامنے استاد کی ڈانٹ کا۔ دوسرے دن وہ اسی فکر اور خوف کی وجہ سے گھر سے جلدی نکل پڑے۔ان کے والد نے انہیں دیکھا، کہا تو کچھ نہیں لیکن ساتھ چل پڑے اور جا کر ہیڈ ماسٹر سے شکایت کردی۔اب ایک اور مصیبت آن پڑی۔ انہیں خوف اور پریشانی کے ساتھ ساتھ پشیمانی بھی تھی کہ ان کی وجہ سے اب ان کے اس استاد کو پریشانی ہوگی جو ان کی نظر میں بہت عظیم تھا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے جب سید عبدالرحیم شاہ کو دفتر میں بلا کر باز پرس کی تو استاد کا جواب یہی تھا کہ طلباء کا کورس مکمل کرانا اس کا فرض ہے۔اوراس کے لیے وہ اپنا فالتو وقت بھی دینے کو تیار ہیں۔وہ کلاس کے کسی بھی لڑکے کو کلاس ڈسپلن سے مستثنٰی قرار نہیں دے سکتا۔ انہیں کلاس روم میں بھیج دیا گیا، لیکن استاد اور ہیڈ ماسٹر کے درمیان خاصی تلخی ہوئی۔ان کے والد نے اگلے روز انہیں کلاس میں جانے کی اجازت دے دی۔اس واقعے سے جہاں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اساتذہ کرام کو اپنے فرائض کی انجام دہی اور طالب علموں کے نصاب کو مکمل کرانے کی فکر دامن گیر رہتی تھی۔ وہ

ڈسپلن کے پابند تھے اور اپنے اصولی موقف کے لیے افسروں سے بھی ٹکر لے لیتے تھے، وہیں والدین کے مثبت رویے بھی عیاں ہیں کہ وہ اپنے ذاتی نظریات کے باوجود اساتذہ کرام کا پورا پورا احترام کرتے تھے۔ دوسری طرف طلباء کو بھی یہ احساس برتری نہ ہوتا کہ وہ کسی افسر کے بیٹے ہیں بلکہ وہ اپنے آپ کو باقی ہم جماعتوں کے برابر سمجھتے تھے۔

مذہبی تعلیم

ان کے گھرانے میں مذہب کو عملی زندگی میں نمایاں مقام حاصل تھا۔ نماز پڑھنے کے بارے میں تو بہت تاکید کی جاتی تھی لیکن وظائف پڑھنے سے ان کے والد ہمیشہ منع کرتے تھے۔ نہ کبھی خود وظیفہ پڑھا نہ گھر میں کسی کو پڑھنے دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ خدا کی 'Arm twisting' نہ کرو۔ وہ ایک آیت کا حوالہ دیتے کہ جب خدا سے کوئی چیز ضرورت سے زیادہ مانگی جائے تو وہ اُسی چیز سے ذلیل کرتا ہے۔ خدا سے دُعا مانگنے کو کہتے اور نصیحت کرتے کہ ہر جگہ اُس سے مانگا جا سکتا ہے۔ اسی طرح ہمیشہ ایمانداری کی تلقین کرتے ہوئے بچوں کو سمجھاتے کہ بے ایمان بننے کے لیے زیادہ بڑی باتوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ چھوٹی سے چھوٹی بے ایمانی کی بھی اتنی ہی سزا ہے جتنی کسی بڑی بے ایمانی کی۔ مثال دیا کرتے تھے کہ دودھ کی بھری ہوئی بالٹی کو ناپاک کرنے کے لیے ایک نجس قطرہ بھی کافی ہوتا ہے اسی طرح رشوت کا ایک پیسہ بھی اگر گھر میں آ جائے تو سارے گھر کی برکت اٹھ جاتی ہے۔

سیاسی بیداری

اس دور میں عام طور پر مسلمان گھرانوں میں مذہبی اور اخلاقی اقدار کا بہت خیال رکھا جاتا تھا۔ اقدار کی گرفت افراد اور خاندانوں پر کافی سخت تھی۔ ان کے گھر میں بھی ایسی ہی پابندیاں تھیں۔ ویسے بھی شرفاء کے گھروں میں مغرب کے بعد گھر سے باہر رہنا یا بلاوجہ رات کو گھر سے باہر جانا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ رات کا کھانا بھی جلد کھانے کا رواج تھا، یوں خاندان کے تمام افراد کو آپس میں مل بیٹھنے کے مواقع مل جاتے تھے۔ خاندان کے افراد کے درمیان علمی، سیاسی اور ادبی بحثیں ہوتی رہتی تھی۔ ملک میں سیاسی بیداری کی لہر ہر طرف آئی ہوئی تھی۔ مسلم لیگ ایک سیاسی جماعت کے طور پر تیزی سے ابھر رہی تھی، یوں کہئے کہ وقت کے اُفق پر بجلیاں سی کوندر ہی تھیں۔ ان کے گھر میں بھی شام کو کھانے کے بعد آپس

میں جنگِ عظیم، ملکی سیاست، کسی اخبار یا کبھی کسی کتاب کے حوالے سے بات چیت ہوتی رہتی تھی۔ گھرانہ کٹر قوم پرست تھا جس میں مسلم لیگ کی تحریک سے ہمدردی، پاکستان کی لگن اور انگریزوں سے نفرت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ یہ تھے وہ حالات جن میں ان کا بچپن گزرا اور جنہوں نے آگے چل کر ان کی عملی اور ادبی زندگی پر انمٹ نقوش چھوڑے۔

ہم نصابی سرگرمیوں میں شرکت

مسعود مفتی نے ابتدائی تعلیم سے ہی سکول کی ہم نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیا۔ وہ فرماتے ہیں:-

> ''ہمارے والد کی ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ ہم لوگ نہ صرف پڑھائی میں اچھے نمبر حاصل کریں بلکہ دیگر ہم نصابی سرگرمیوں میں بھی بھرپور شرکت کریں اور اس وقت اساتذہ کرام کی بھی یہی خواہش ہوتی تھی کہ ان کے طلباء نصاب کے ساتھ ساتھ دوسری سرگرمیوں میں بھی باقاعدگی سے حصہ لیا کریں۔ سکول کا سالانہ جلسہ ہوا کرتا تھا بالکل ایسے ہی جس طرح آج کل سکولوں میں سالانہ یوم والدین ہوتا ہے۔ لیکن اس جلسے کی نوعیت ذرا مختلف ہوتی تھی۔ اس میں تمام برصغیر سے لوگ آتے تھے۔ ایسے ہی جلسوں میں نواب بہادر یار جنگ، چوہدری خلیق الزمان اور ''شاہنامہ اسلام'' کے خالق ابوالاثر حفیظ جالندھری نے بھی (جنہوں نے پاکستان کا قومی ترانہ لکھا) شمولیت کی۔''

ایسی سرگرمیوں سے طلباء کو نہ صرف اپنے عہد کی عظیم ہستیوں کو قریب سے دیکھنے بلکہ انہیں ان کے خیالات کو جاننے کا موقع بھی ملتا۔ اس زمانے کے بڑے لوگوں کی ترجیحات بھی آج کے دور کے بڑے لوگوں سے مختلف تھیں۔ وہ اپنے قیمتی اوقات کو قوم کے نونہالوں کے ساتھ سکولوں میں گزارنے کو مقدم جانتے تھے۔ اور مستقبل کے معماروں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ شاید ان عظیم ہستیوں کی شرکت کا ہی فیض ہے کہ آگے چل کر انہی سکولوں سے طلباء کی وہ کھیپ تیار ہوئی جس نے نہ صرف قیام پاکستان میں ہراول دستے کا کردار ادا کیا بلکہ قیام پاکستان کے بعد بھی اس کی تعمیر و ترقی میں دل و جان سے حصہ لیا۔ ایسے ہی ایک جلسے میں مسعود مفتی نے بھی اپنی زندگی کی پہلی تقریر کی۔

مسعود مفتی کی پہلی تقریر

سکول کا سالانہ جلسہ منعقد ہوتا تھا۔ مفتی محمد زمان نے مسعود مفتی کو بھی کوئی تقریر یا مضمون لکھنے کو کہا اس وقت یہ چھٹی جماعت میں تھے۔ چنانچہ انہوں نے ایک ابتدائی تقریر لکھی جسے بعد ازاں ان کے استاد عبدالرحیم شاہ اور والد نے تصحیح کر کے پختگی بخشی۔ استاد محترم نے یہ تقریر ان کو زبانی یاد کرائی۔ بچوں کے پروگرام عموماً صبح کی نشست میں رکھے جاتے تھے۔ انہوں نے صبح کے جلسے میں لگ بھگ دو ہزار کے مجمع میں تقریر کی تو ہیڈ ماسٹر نے اس کو سراہتے ہوئے کہا کہ شام کے جلسے میں اس تقریر کو دوبارہ کیا جائے۔ اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے اپنے اساتذہ کرام کی محنت، دلچسپی اور لگن کی بے حد تعریف کی۔ اسی طرح "بزم ادب" کے مختلف پروگراموں اور سکول و کالج کے مباحثوں میں بھی وہ باقاعدگی سے شرکت کرتے تھے۔ ان کے بڑے بھائی بھی گارڈن کالج کے بہترین مقرر تھے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اس دور میں تمام سکولوں اور کالجوں میں اس قسم کی سرگرمیوں پر بہت زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ کھیل کود، ورزش، مباحثے اور "بزم ادب" وغیرہ کے پروگرام بھی ٹائم ٹیبل کا باقاعدہ حصہ ہوتے تھے۔

شاندار تعلیمی کارکردگی

دورانِ تعلیم مسعود مفتی کو لکھنے کا شوق نہ تھا البتہ مطالعے کا جنون کی حد تک شغف تھا۔ سکول میں ان کا تعلیمی ریکارڈ شاندار تھا اور وہ ہر درجے میں اپنی جماعت میں اوّل رہے۔ تمام مضامین سے دلچسپی کی بناء پر تعلیمی سال کے اختتام پر سالانہ تقسیم انعامات کے جلسے میں وہ چار پانچ انعام ضرور حاصل کر لیتے تھے۔ اس میں ان کی ذاتی محنت، والدین کی دلچسپی کے ساتھ ساتھ ادارہ کا بھی حصہ تھا جو اپنی نیک نامی کو حاصل کرنے اور قائم رکھنے میں سخت محنت کر رہا تھا۔ چیدہ چیدہ شخصیات کو برصغیر بھر سے بلا کر بچوں کو نہ صرف ان شخصیات سے متعارف کرایا جاتا بلکہ ان کے خیالات، ملک کے سیاسی حالات اور ملّی عزائم سے بھی بچوں کو واقفیت ہوتی۔ ان ہم نصابی سرگرمیوں نے آگے چل کر ان طلباء کی ذہنی صلاحیتوں اور عملی کردار کی تربیت اور نشوونما میں بہت اہم کردار ادا کیا۔

اسلامیہ ہائی سکول راولپنڈی ایک ایسا ادارہ تھا جہاں ان نصابی اور ہم نصابی سرگرمیوں کا اہتمام بطور خاص ہوتا تھا۔ طلبہ کی بھرپور حوصلہ افزائی کی جاتی۔ اگر کوئی لڑکا کسی بھی کھیل کے لیے چند لڑکوں کو تیار کر کے پرنسپل کے پاس جا کر کہتا کہ "سر اس کھیل کے لیے ٹیم تیار ہے اور ہمیں کھیل کے لیے

سامان درکار ہے" تو سکول کی طرف سے فوراً سامان مہیا کردیا جاتا تھا۔ اسلامیہ ہائی سکول میں دو استاد خصوصیت سے ایسے پروگراموں کے روحِ رواں تھے۔ ایک سید عبدالرحیم شاہ اور دوسرے صوفی محمد زمان۔ دونوں ہی خوش کلام، خوش لباس اور خوش ذوق تھے۔

مسعود مفتی کا تعلیمی پسِ منظر

ابتدائی دور میں مسعود مفتی کا رجحان تحریر کی طرف نہ تھا البتہ ان کے بھائی قمرالرحمٰن ادب کی طرف مائل تھے۔ انہوں نے کچھ عرصے تک "زمانہ" کے نام سے ایک ادبی میگزین بھی نکالا۔ بقول مسعود مفتی:-

"میں تو اس وقت بھائی جان کے سائے "Shadow" کے طور پر ساتھ جایا کرتا تھا۔ ادب کے بارے میں لکھنے کا تو اس وقت میں سوچ بھی نہ سکتا تھا لیکن کتابوں سے مجھے عشق ضرور تھا۔"

وہ مختلف رسائل اور ادبی کتب کے مطالعے میں گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ بچپن کے دور کی یادوں میں سے، ان کی ایک بہت ہی قابلِ ذکر اور خوبصورت یاد ادبی رسالہ "ہمایوں" سے وابستہ ہے۔ یہ رسالہ میاں بشیر احمد نکالا کرتے تھے۔ یہ وہی میاں بشیر احمد ہیں جو ترکی میں پاکستان کے پہلے سفیر بھی رہے۔ انہوں نے یہ ماہنامہ اپنے والد جسٹس شاہ دین ہمایوں کی یاد میں جاری کیا تھا اور اس کے سرورق پر شاہ دین ہمایوں کا یہ مشہورِ زمانہ شعر ہر بار چھپا ہوا ہوتا تھا۔

اٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

آٹھویں جماعت تک اردو کا بیشتر کلاسیکی ادب پڑھ چکے تھے۔ ان کتابوں میں بطور خاص "فسانۂ آزاد" کا ذکر کرتے ہیں کہ اس کی چاروں جلدیں انہوں نے آٹھویں جماعت میں داخلہ سے پہلے پڑھ لی تھیں۔ عبدالحلیم شرر، سجاد حیدر یلدرم اور پریم چند کو بھی پڑھ چکے تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس زمانے میں پبلشرز کلاسیکی ادب کی Anthologies بنایا کرتے تھے۔ اس وقت تک ان کو نہ اندازہ تھا نہ ہی احساس کہ ان تمام کتابوں اور ان کے مصنفین کا اردو ادب میں کیا مقام ہے، لیکن وہ ان کے نام اور کام سے واقف ضرور ہو چکے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ان مصنفین کے ادبی مقام و مرتبے سے بھی آگہی ہوتی گئی۔

اسلامیہ ہائی سکول مری روڈ راولپنڈی میں مسعود مفتی نے آٹھویں جماعت تک تعلیم حاصل کی۔

1944 میں جب ان کے والد نے ترقی اور تبادلے کی وجہ سے راولپنڈی چھوڑا مسعود مفتی بھی اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ لاہور منتقل ہو گئے۔ لاہور جا کر انہوں نے میونسپل کارپوریشن کے سکول میں داخل لیا۔ اور میٹرک یہیں سے کیا۔ اسی سال قیام پاکستان کا تاریخی واقعہ ظہور پذیر ہوا اور یوں ایک تاریخی واقعے کے یہ چشم دید گواہ بھی ہیں۔

اسلامیہ کالج لاہور، ایف ایس سی پری میڈیکل

میٹرک کرنے کے بعد مسعود مفتی نے اسلامیہ کالج لاہور میں گھر والوں کی خواہش پر کہ یہ ڈاکٹر بنیں، ایف ایس سی پری میڈیکل گروپ میں داخلہ لے لیا۔ یہ وہ دور تھا جب مسلمان قوم پرستی کے جذبے سے سرشار تھے۔ نیا نیا ملک حاصل کیا تھا اور اس پر جان فدا کرنے کی لگن بھی تازہ تھی۔ ملک اور قوم کی خدمت کو اپنی ذات پر مقدم سمجھا جاتا تھا۔ اسلامیہ کالج یا اسلامیہ سکول میں داخلے کو بھی حب الوطنی کی نشانی سمجھا جاتا تھا۔ اسلامیہ کالج لاہور اُس وقت اپنی شاندار روایات کے عروج پر تھا۔ پاکستان کی جدوجہد میں اسلامیہ کالج کی سرگرمیاں علی گڑھ یونیورسٹی کے ہم پلہ تھیں۔ تقسیم ہند سے پہلے مسلمان گھروں کے لڑکوں کے لیے اس کالج میں داخلہ لینا باعثِ فخر سمجھا جاتا تھا۔ مسعود مفتی کو اس بات پر فخر ہے کہ انہوں نے اس عظیم درس گاہ میں اس یادگار دور میں تعلیم حاصل کی جب قیام پاکستان کا خواب شرمندہ تعبیر ہوا۔
اسی کالج نے ان کے ادبی ذوق کو جلا بخشی جس نے آگے چل کر ان کو ادب میں اعلیٰ مقام دلایا۔
انہوں نے اسلامیہ کالج لاہور میں اپنے داخلے کے واقعے کو کچھ اس طرح رقم کیا ہے:۔

> ''اسلامیہ کالج لاہور میں میرا پہلا سبق شروع ہوا تو پاکستان چند ہفتے پہلے قائم ہو چکا تھا۔ میں کالج میں نو وارد۔۔۔ ملک دنیا کے نقشے پر نو وارد۔۔۔ چنانچہ آغاز سفر والی ہچکچاہٹ، ولولہ اور امید میرے اندر بھی تھے۔۔۔ اور میری ذات سے باہر قومی فضا میں بھی۔۔۔ ہر فرد ربط ملت سے سرشار اور ہر موج دریا کی روانی میں اپنی شرکت پر شادماں۔۔۔ قوم اور افراد کی ذہنی کیفیت میں گویا خود شناسی اور خود اعتمادی کی رسی بٹی جارہی تھی اور آئیڈیل ازم چھلک رہا تھا۔ اس پس منظر میں اسلامیہ کالج کامرانی کا تمغہ ماتھے پر سجائے ایک سربلند ادارہ تھا جس نے گزشتہ چند برسوں میں پاکستان کے لیے بھرپور عملی جدوجہد کی تھی۔''

اسلامیہ کالج کا سربلند اداروں میں اپنا ایک خاص مقام تھا۔ ان کا خیال ہے کہ علی گڑھ نے بلاشبہ ایک عظیم

قومی خدمت انجام دی تھی لیکن اسلامیہ کالج کی خدمات بھی ناقابلِ فراموش ہیں۔ انہیں حیرت ہے کہ ہم علی گڑھ کو تو یاد رکھے ہوئے ہیں اور اس کا احسان مانتے ہیں لیکن اسلامیہ کالج کی خدمات کا نہ جانے کیوں اعتراف نہیں کرتے؟ ان کے خیال میں اسلامیہ کالج نے کہیں زیادہ کام کیا ہے۔ اپنے مضمون "صریرِ خامہ" میں جو "تواریخ اسلامیہ کالج لاہور" کے لیے 1995 میں لکھا گیا۔ یوں رقم طراز ہیں:-

> "اسلامیہ کالج لاہور نے پاکستان کے لیے بھرپور عملی جدوجہد کی تھی۔ پہلے قوم کو ذہنی طور پر پاکستان کی تحریک کی طرف مائل کیا تھا۔ پھر 1947 کے فرقہ وارانہ فسادات میں کالج سے ملحقہ ہندو آبادیوں سے مقابلے کا حوصلہ دیا تھا۔ جب یو۔او۔ٹی۔سی (UOTC) کے طلباء کالج کی چھت پر مسلح پہرہ دیتے اور اردگرد کے علاقے پر نظر رکھتے۔ اس لیے پاکستان بننے کے فوراً بعد کالج اور مسلم سٹوڈنٹس کا ذکر عزت اور الفت سے ہوتا تھا اور شہرت مثالی تھی۔"

گورنمنٹ کالج لاہور

گورنمنٹ کالج لاہور کو ہمیشہ سے بلاشبہ چوٹی کی درسگاہ سمجھا جاتا تھا۔ جس میں عمائدین سلطنت اور اکابرین شہر اپنے بچوں کو داخل کرانا باعث فخر سمجھتے تھے۔ لیکن جب 23 مارچ 1940 کی قرارداد لاہور نے پوری قوم کو ایک نئی منزل کا پتہ بتلایا تو مسلمانوں کے لیے اسلامیہ کالج لاہور کی اہمیت بڑھ گئی۔ وجہ شاید یہ ہو کہ اس کے نام کے ساتھ اسلامیہ کا لفظ تھا اور دوسرے کے ساتھ گورنمنٹ کا۔ اب قوم کو گورنمنٹ سے اپنا حق لینے کی نوید دی گئی تھی۔ گورنمنٹ غیروں کی تھی چنانچہ زیادہ تر مسلمان اکابرین اپنے بچوں کو اسلامیہ کالج لاہور بھیجنے لگے تھے۔ چند سال کے بعد ہوا یہ کہ اسلامیہ کالج لاہور تو بقول مسعود مفتی کے، اولین درجے کی قومی درسگاہ بن گیا جبکہ گورنمنٹ کالج کو دوسرے درجے کی سرکاری درسگاہ قرار دیا جاتا تھا۔

مسلمان علمائے کرام کی کہکشاں

(Galaxy of Muslim Scholars)

آزادی ملنے کے ابتدائی چند برسوں تک اسلامیہ کالج لاہور پاکستان کے ثقافتی افق پر چھایا ہوا نظر آتا

ہے۔ اس وقت اسلامیہ کالج لاہور میں بقول مسعود مفتی 'Galaxy of Muslim Scholars' یا مسلمان علماء و فضلاء کی ایک کہکشاں تھی۔ ڈاکٹر او۔ ایچ ملک اور ڈاکٹر محمد دین تاثیر جیسی نامور شخصیات پرنسپل کے عہدے پر فائز تھیں۔ علامہ علاؤ الدین صدیقی جیسے شعلہ بیان مقرر روزانہ حبیبیہ ہال میں کالج کے تمام طلباء کو قرآن اور پاکستانیت کا درس دیتے تھے۔ امتیاز احمد، عبدالحفیظ کاردار، خان محمد، شجاع الدین اور فضل محمود کرکٹ کے شاہین تھے۔ جو کالج اور یونیورسٹی سے اُبھر کر پہلے قومی اور پھر بین الاقوامی اُفق پر تاروں کی طرح جگمگانے لگے تھے۔

قیام پاکستان کے فوراً بعد اس نوزائیدہ مملکت کو جنگِ کشمیر کا سامنا کرنا پڑا۔ دشمن کا خیال تھا کہ اس نوزائیدہ اسلامی مملکت کے پاس فوج ہے نہ سامانِ حرب، چند دنوں میں ہی شکست کھا کر دوبارہ ان سے جا ملے گی۔ ان کے سیاسی اکابرین کھلم کھلا اس کا اظہار بھی کر رہے تھے کہ بس چند مہینوں کی بات ہے خدانخواستہ پاکستان ختم ہو جائے گا۔ لیکن ان کی تمام امیدیں خاک میں مل گئیں۔ کہاں تو ان کا کشمیر میں فوج اتار کر جنگ کا آغاز اور کہاں یہ عالم کہ خود انہیں ہی اقوام متحدہ میں جا کر جنگ بندی کی درخواست کرنی پڑی۔ اسلامیہ کالج لاہور میں طلباء کو اس جنگ کی تیاری کے لیے سخت جسمانی مشقت کی تربیت دی جانے لگی جس میں صبح سویرے پی ٹی اور پریڈ شامل تھی۔ رائفل کلب اور اے آر پی کلب اس میں پیش پیش تھے۔

ان حالات میں اسلامیہ کالج لاہور کی یہ بات بھی تاریخ کا ایک روشن حصہ ہے کہ جنگ بندی کے بعد جنوری 1949 میں تمام طلباء کا حبیبیہ ہال میں اجتماع ہوا۔ ڈاکٹر محمد دین تاثیر، علامہ علاؤ الدین صدیقی، مولانا علم الدین سالک اور خواجہ محمد اسلم نے پُر جوش تقاریر کیں۔ ایک ریزولیوشن پاس کیا گیا جس میں استصواب رائے کے لیے کالج کے اساتذہ اور طلباء کی خدمات حکومت پیش کی گئیں۔ یہ تھے اس وقت کے ملکی حالات کے پس منظر میں اسلامیہ کالج لاہور کے چند واقعات یقیناً انہوں نے مسعود مفتی کی شخصیت پر قوم پرستی کے گہرے نقوش مرتب کیے۔

میڈیکل کالج میں داخلے میں ناکامی

ان کے والدین کی خواہش تھی کہ وہ ڈاکٹر بنیں۔ انہیں بھی دوسرے مضامین کا اتنا علم نہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے پری میڈیکل گروپ میں ایف ایس سی کیا۔ مسعود مفتی صریرِ خامہ میں فرماتے ہیں:۔

"ہمارے ملک کا دستور ہے کہ جس طرح بچے ہوا میں رنگدار غبارے اڑاتے
ہیں اسی طرح والدین اپنی خواہشات کے غباروں پر بچوں کو بٹھا کر پروان
چڑھاتے ہیں۔ میں نے بھی ہوش سنبھالتے ہی ایک ہی خواہش کی گونج سنی تھی
"یہ ڈاکٹر بنے گا۔" بچپن لڑکپن اسی لکڑی کے گھوڑے پر اڑتے گزرا جب زمین
پر اترا تو اسلامیہ کالج میں ایف ایس سی (میڈیکل گروپ) میں داخل ہو گیا۔"

ایف ایس سی کے امتحان میں صرف تین نمبروں کے فرق سے یونیورسٹی میں دوسری پوزیشن حاصل کی۔ یوں کالج سے میڈل حاصل کرنے اور یونیورسٹی سے وظیفہ پانے کے حقدار ٹھہرے۔ میڈیکل کالج میں داخلے کے لیے یوں بظاہر حالات بڑے سازگار تھے لیکن داخلے کے لیے مقررہ عمر سے ان کی عمر تقریباً ڈیڑھ برس کم تھی۔ وہ داخلے کے لیے اپنی کم عمری کی وجہ سے نااہل قرار پائے۔ کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے پرنسپل کرنل الہی بخش کسی زمانے میں ان کے والد کے شاگرد رہ چکے تھے اور کالج کے پراسپکٹس کے تحت شرائط داخلہ میں کمی کرنے کے وہ مجاز بھی تھے۔ انہوں نے جب اپنے والد کی توجہ اس امر کی طرف دلائی اور درخواست کی کہ وہ پرنسپل سے مل کر داخلہ کرانے کی کوشش کریں۔ تو ان کے والد کا جواب تھا

"بیٹا میں کوئی چالیس برس سے انہیں کبھی نہیں ملا، اب اگر ملوں بھی تو سوالی بن
کر یا غرض لے کر جانا مناسب نہیں۔ فی الحال تم بی۔ ایس۔ سی کر لو، عمر کی حد بھی
پوری ہو جائے گی اور تمہارے علم میں بھی اضافہ ہو جائے گا۔"

اپنے والد کے فرمان کے مطابق مسعود مفتی نے بی۔ ایس۔ سی میں داخلہ تو لے لیا۔ لیکن اب انہوں نے نان میڈیکل مضامین رکھے۔ انہوں نے بی ایس سی میں اختیاری مضامین کے طور پر فزکس اور کیمسٹری کا انتخاب کیا۔ اس وقت اسلامیہ کالج کے پرنسپل مشہور ریاضی دان ڈاکٹر او۔ ایچ ملک تھے جو ملک گیر شہرت کے حامل تھے۔ اسی طرح انگریزی کے استاد پروفیسر حمید احمد خان اور مرغوب صدیقی تھے۔ ڈاکٹر محمد دین تاثیر بعد ازاں کالج کے پرنسپل بنے۔ مسعود مفتی اکثر ہم نصابی سرگرمیوں میں حصہ لیا کرتے تھے جن میں قابلِ ذکر تقریری مقابلے تھے جن میں اعلیٰ کارکردگی کی وجہ سے وہ پرنسپل کے منظورِ نظر بن گئے۔ بی ایس سی میں داخلے کے بعد کا ایک دلچسپ واقعہ بیان کرتے ہوئے مسعود مفتی کہتے ہیں کہ پروفیسر عبدالحمید بیگ فزکس کے پروفیسر تھے۔ پہلے ہی دن یہ جب ان کی کلاس میں داخل ہوئے تو انہوں نے پوری کلاس سے پوچھا کہ:۔

"Is there any student who has done F.Sc Pre-Medical?" (کیا کوئی ایسا لڑکا ہے جس نے ایف ایس سی پری میڈیکل کیا ہے؟)"

مسعود مفتی نے ہاتھ کھڑا کر دیا کہ "جناب میں ہوں" جب پروفیسر صاحب نے وجہ پوچھی تو انہوں نے بتایا کہ میڈیکل میں داخل ہونے کے لیے عمر کی مقررہ حد کو حاصل کرنے کے لیے بی۔ ایس۔ سی میں آئے ہیں۔ اس جواب کو سن کر وہ غصے میں آ گئے اور فوراً کہنے لگے:۔

"Get out of the class. Why have you taken Physics?"

(میری کلاس سے نکل جاؤ۔ تم نے فزکس کیوں لی ہے؟ ریاضی تو تم نے ایف ایس سی میں پڑھی نہیں۔ اب فزکس کیسے سمجھ سکو گے؟)'' مسعود مفتی نے ان کو یوں قائل کیا کہ 'جناب میرے بڑے بھائی مجھے گھر میں ریاضی پڑھا رہے ہیں اور میں بہت جلد آپ کی جماعت کے معیار پر آ جاؤں گا'۔ یہ پروفیسر عبدالحمید بیگ جن کو شاید آج کل بہت کم لوگ جانتے ہوں گے، پاکستان کے سب سے پہلے اور سب سے بڑے کوہ پیما تھے۔

اسلامیہ کالج کا کوہ پیما کلب

اسلامیہ کالج لاہور کی ایک وجہ شہرت پروفیسر عبدالحمید بیگ صاحب کے کوہ پیما کلب کی وجہ سے بھی تھی۔ قیام پاکستان کے بعد ابتدائی دور میں یہ وادی کاغان، سوات کا فرستان وغیرہ کی حسین وادیوں میں ہر سال اپنے طلباء کو لے جاتے تھے۔ انہوں نے ان تمام خوبصورت مقامات کے بارے میں اخبارات میں مضامین بھی لکھے۔ ان کے ساتھ پروفیسر قیوم قریشی کی ''فلم سوسائٹی'' بھی ان مہمات کی فلمیں بناتی اور واپس آ کر کالج کے فزکس تھیٹر میں یہ فلمیں طلباء کو دکھانے کا بندوبست کیا جاتا۔ بعض اوقات فرمائش پر دیگر مقامی کالجوں میں بھی یہ فلمیں دکھانے کا اہتمام کیا جاتا۔ حیرت کی بات ہے کہ ان دنوں جب نہ تو ذرائع آمدورفت اتنے ترقی یافتہ تھے نہ سڑکوں کی حالت اچھی تھی اور نہ ہی وسائل اتنے میسر تھے، وہ محض اپنے شوق اور لگن سے ان مہموں کو سر کرتے تھے۔ ان کی ان مہمات میں پروفیسر قیوم قریشی ان کا ساتھ دیا کرتے تھے۔ یہ وہی پروفیسر قیوم قریشی ہیں جو بعد میں سیکنڈری بورڈ راولپنڈی کے چیئرمین بھی رہے۔ یہ امر بھی باعث دلچسپی ہوگا کہ پروفیسر قیوم قریشی نسبتاً جوان آدمی تھے جبکہ پروفیسر عبدالحمید بیگ کی عمر اس وقت قریباً ساٹھ برس تھی لیکن وہ اس عمر میں بھی ذہنی اور جسمانی دونوں طرح چاق و چوبند تھے اور جوانوں سے زیادہ باہمت تھے اگر یہ کہا جائے کہ پاکستان میں کوہ پیمائی کے بانی کہلانے کے یہی دو حضرات مستحق ہیں، تو غلط نہ ہوگا۔ پروفیسر عبدالحمید بیگ 1950 میں ناروے سے آنے والے کوہ پیماؤں کے ساتھ کوہ ہندوکش کی 25203 فٹ اونچی چوٹی پر چڑھے۔ کاغان کی مہمات کی فلموں میں وہ ہرنوں کی طرح قلانچیں بھرتے نظر آتے تھے۔

ٹیوٹوریل گروپ

مسعود مفتی نے بی ایس سی میں داخلہ تو لے لیا لیکن بقول خود ان کے "گڑبڑ وہیں سے شروع ہوگئی" اور جب پروفیسر حمید احمد خان نے انہیں کالج میگزین کا اسسٹنٹ ایڈیٹر بنا دیا تو گویا پٹڑہ کر دیا۔ ہوا یوں کہ جب نئی تھرڈ ائیر کے طلباء کی فہرست نوٹس بورڈ پر لگی تو مسعود مفتی کا نام پروفیسر حمید احمد خان کے ٹیوٹوریل گروپ میں ڈالا گیا۔ پروفیسر حمید احمد خان بی اے (آرٹس) کے طلباء کو انگریزی تنقید، ڈرامہ اور شاعری پڑھایا کرتے تھے۔ یہی پروفیسر حمید احمد خان بعد میں اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل اور پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے۔ مسعود مفتی چونکہ سائنس کے طالب علم تھے اس لیے براہ راست ان کے شاگرد تو نہ تھے۔ لیکن پچھلے دو برسوں میں کالج کے مباحثوں میں حصہ لینے کی وجہ سے وہ انہیں سرسری طور پر جانتے ضرور تھے۔ اس کے علاوہ سالانہ کانووکیشن پر انہوں نے متعدد انعامات بھی جیتے تھے اس لیے بھی وہ تھوڑے بہت ان سے واقف تھے۔ لیکن پہلا براہ راست رابطہ دونوں کا اسی ٹیوٹوریل گروپ میں ہوا۔

اسلامیہ کالج لاہور کی یہ ایک اور اچھی روایت تھی کہ کالج کے تمام طلباء کے مختلف ٹیوٹوریل گروپوں میں بٹے ہوئے تھے اور ہر گروپ کسی نہ کسی پروفیسر کے زیرِ نگرانی اپنی ہم نصابی اور غیر نصابی سرگرمیاں جاری رکھتا تھا۔ یوں طلباء میں نہ صرف صحت مند مقابلے کا مثبت رجحان نشوونما پاتا بلکہ ان کی ذہنی صلاحیتوں کی آبیاری بھی ہوتی تھی۔ ان ٹیوٹوریل گروپس نے بچوں کی کردار سازی میں اہم کردار ادا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامیہ کالج سے فارغ التحصیل طلباء اس وقت زندگی کے ہر میدان میں ممتاز نظر آتے تھے۔ ایسے ٹیوٹوریل گروپوں میں ہر جمعہ کو کلاسوں کی بجائے ہفتہ وار ثقافتی مجالس ہوتی تھیں۔ جن میں طلباء مختلف قسم کے پروگرام تیار کر کے پیش کرتے تھے۔

اسلامیہ کالج کی خدمات

اسلامیہ کالج کی شاندار علمی، ادبی اور قومی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے مسعود مفتی فرماتے ہیں:-

> "محض کریسنٹ کے ذکر سے یہ غلط فہمی نہ ہو کہ اس وقت کالج میں اور کوئی سرگرمی نہ تھی کیونکہ معاملہ اس کے برعکس تھا اور اسلامیہ کالج سپورٹس، غیر نصابی علمی سرگرمیوں اور وطن دوستی کے جذبوں سے بھرے برتن کی طرح چھلک رہا تھا۔ بزم فروغ ادب کے روح رواں چند متحرک اور سیماب صفت لڑکے تھے۔ مثلاً نیاز سیلانی (جو بعد میں نیاز عرفان بنے) ابوالحسن نغمی، سید مظفر ضیاء، ذاکر حسین،

سلیم قادری، سلیم احمد خان گی، محمد عظیم خان اور خان محمد وغیرہ، لئیق احمد اچھے شاعر تھے۔اور عبدالباقی بلوچ (جو بعد میں سیاستدان بنے) خوش کلام بھی تھے اور خوش گلو بھی۔جن کے ترنم سے مشاعرے جاگ جاتے تھے۔کل پاکستان مباحثے اور کل پاکستان مشاعرے بڑے قصے کے ہوتے تھے۔

اپریل 1950 میں کانووکیشن پر مشیرِ تعلیم نسیم حسن آئے تو ڈاکٹر تاثیر نے کالج کی تاریخ میں پہلی دفعہ تمام کارروائی سمیت اپنا خطبہ اردو میں پیش کیا جس کا اخباروں میں چرچا ہوا۔1951 کے کانووکیشن میں پرنسپل غلام حسین نے اپنی اردو تقریر میں پہلے مسلمان گورنر سردار عبدالرب نشتر کو خوش آمدید کہا تو ہال دیر تک تالیوں سے گونجتا رہا۔کشمیر کی جنگ ذرا لمبی ہوتی دکھائی دی تو رائفل کلب اور اے آر پی کلب طلباء کو ٹریننگ دے کر جہادِ کشمیر کے لیے تیار کرنے لگے۔ نئے ملک کی ہر نئی چیز کا اسلامیہ کالج اس پُرجوش انداز میں خیر مقدم کرتا جیسے اس کالج نے خود ایک ماں کی طرح اس بچے کو جنم دیا ہو۔"

مسعود مفتی نے 1951 میں بی ایس سی کی اور پنجاب یونیورسٹی میں دوسری پوزیشن بھی حاصل کی۔ اس بناء پر انہیں کالج کی جانب سے "رول آف آنر" ملا اور یونیورسٹی کی طرف سے وظیفے کی نوید بھی ملی مگر سائنس کے مضامین چھوڑنے کی وجہ سے یہ وظیفہ انہیں نہ مل سکا۔اب یہ پرائیویٹ طور پر پولیٹیکل سائنس کے ساتھ بی اے کے امتحان کی تیاری کرنے لگے۔اور اس کا سرٹیفکیٹ لینے کے بعد یہ میڈیکل کالج میں داخلے کی بجائے پنجاب یونیورسٹی کے پولیٹیکل سائنس کے ڈیپارٹمنٹ میں "انٹرنیشنل افیئرز" (International Affairs) کی کلاس میں داخل ہو گئے۔یہ ڈپلومہ کورس تھا جو 1950 میں شروع کیا گیا تھا۔جرمن نژاد پروفیسر ڈاکٹر جی ایم فریٹرز DR.G.M.Fritters پولیٹیکل سائنس ڈیپارٹمنٹ کے صدر تھے جو بہت محنت اور لگن سے کام کر رہے تھے۔انہوں نے اس شعبے کا معیار بلند رکھنے کے لیے کورس کے امتحانی پرچوں کے لیے بیرونی ممتحن آکسفورڈ اور کیمرج یونیورسٹیوں کے اساتذہ مقرر کیے ہوئے تھے۔اس ایک سالہ کورس کے اختتام پر 1953 میں اول آنے کے بعد ان کا اعتماد اور بڑھا اور انہوں نے پنجاب یونیورسٹی کے جرنلزم ڈپلومہ میں داخلہ لے لیا۔بعد ازاں اسے ایم اے کے برابر کر دیا گیا۔اس کورس کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم اے انگلش میں داخلہ لے لیا۔گورنمنٹ کالج کے میگزین "راوی" میں اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں لکھا۔علاوہ ازیں کالج کی زندگی کے متعلق کارٹون بھی بناتے رہے جو باقاعدگی سے پہلے تو اسلامیہ کالج کے میگزین "Crescent" اور بعد میں گورنمنٹ کالج کے میگزین "راوی" میں شائع ہوتے رہے۔

سائنس اور آرٹس کے مضامین میں یکساں مہارت

1956ء میں ایم اے انگلش امتیازی حیثیت سے پاس کیا اور یونیورسٹی میں تیسری پوزیشن حاصل کی۔ مختلف علوم سے واقفیت آگے چل کر ان کی عملی زندگی میں کام آئی۔ اس کے علاوہ انہوں نے جرنلزم میں پنجاب یونیورسٹی سے ڈپلومہ بھی حاصل کیا۔ آج کل وہ اخباروں میں ملکی حالات اور سیاست پر جو کالم لکھ رہے ہیں کیونکہ ان کا جرنلزم سے بھی واسطہ رہا ہے۔

ان کی عملی زندگی ایک طویل عرصے پر محیط ہے جس میں ان کو نہ صرف ملک بلکہ بیرون ملک بھی ملازمت کے مواقع ملے۔ مختلف علوم سے واقفیت اور معاشرتی بصیرت نے عملی اور ادبی زندگی میں انہیں منفرد اور ممتاز حیثیت عطا کی۔ جہاں اسلامیہ کالج لاہور کا کریسنٹ رکھنا باعث اعزاز ہے وہاں یہ بات بھی قابلِ ستائش ہے کہ اسلامیہ کالج لاہور کے آنر بورڈ پر آج بھی ان کا نام کندہ ہے۔

سی ایس ایس کی تیاری اور جرنلسٹ بننے کی خواہش

تعلیمی میدان میں کامیابیوں اور اعزازات کے باوجود گھر والوں کو ان کے ڈاکٹر نہ بننے پر دکھ تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اپنے گھر والوں کو خوش رکھنے کے لیے ایم۔اے کے بعد وہ سی۔ایس۔ایس کی تیاری کرنے لگے۔ ان کی کوشش تھی کہ سی۔ایس۔ایس کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کریں تا کہ فارن سروس کے لیے منتخب ہو جائیں تا کہ والدین اور گھر والے خوش ہو جائیں۔ مسعود مفتی نے اس بات کا اقرار کیا ہے کہ یہ سوچتے ہوئے بھی ان کی نگاہ جرنلزم پر ہی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ کچھ عرصہ ملازمت کرنے کے بعد یہ ملازمت چھوڑ کر بیرون ملک جرنلسٹ بن جائیں۔

ایم اے کے بعد انہوں نے دیال سنگھ کالج لاہور میں بحیثیت انگریزی لیکچرار کام شروع کیا۔ اسی دوران گرمیوں کی چھٹیوں میں انہوں نے "سول اینڈ ملٹری گزٹ" میں بطور اپرنٹس کے بھی تقریباً دو ماہ کام کیا۔ اس زمانے میں صحافت کی دنیا میں اقبال سنگھ کا نام بہت مشہور تھا کہا جاتا تھا کہ اس کے کالم تقریباً ہر دوسرے اخبار میں چھپا کرتے ہیں۔ اس کی شہرت نے بھی مسعود مفتی متاثر کیا۔

"سول اینڈ ملٹری گزٹ" کی ملازمت کے دوران ان کو بڑے تلخ تجربات ہوئے۔ یہ ایم اے انگلش کرنے کے بعد وہاں آئے تھے اور باقی لوگوں کی نسبت زیادہ تعلیم یافتہ تھے۔ وہاں کے لوگوں نے انہیں

دل سے خوش آمدید نہ کہا۔ اب وہ اپنے ماضی پر نظر ڈالتے ہیں تو محسوس کرتے ہیں کہ شاید ان کا یہ رویہ میرے حق میں بہتر تھا کہ اس کی وجہ سے وہ اس شعبے سے نکل آئے۔ ایک میٹنگ کے دوران جس میں یہ طے پانا تھا کہ مسعود مفتی کو ان کی اپرنٹس شپ کے بعد نئی ذمہ داری کیا دی جائے۔ ٹیلی پرنٹر پر سول سروس کے کامیاب امیدواروں کے نام آنے لگے۔ اپنا نام پڑھنے کے بعد انہوں نے میٹنگ میں شامل حضرات کو بتا دیا کہ ان کا نام زیرِ غور نہ رکھیں۔ ان کا نتیجہ آ گیا ہے اور اب وہ یہاں سے چلے جائیں گے۔ اس طرح جرنلسٹ بننے کی خواہش تو پوری نہ ہو سکی لیکن ملک کو ایک محبِ وطن اور قابل بیوروکریٹ ضرور مل گیا۔ لیکن ان کو فارن سروس میں نہ لیا گیا۔

مسعود مفتی کی زندگی میں جو بات سب سے نمایاں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ بہت سے علوم میں دسترس کے ساتھ ساتھ ان کی منزل بھی تبدیل ہوتی رہی۔ یہ بات بڑی نمایاں ہے کہ وہ جتنا کچھ چاہتے تھے اور بن کچھ گئے میٹرک کے بعد داخلہ تو لیا پری میڈیکل گروپ میں پہنچ گئے بی ایس سی میں پھر جرنلسٹ بننے کی خواہش کی تو ایم اے انگلش کر کے نکلے۔ اب جبکہ فارن سروس کی خواہش رکھتے ہوئے سی ایس ایس کا امتحان اعزازی حیثیت سے پاس کیا تو ہوا یہ کہ اس سال فارن سروس کے لیے کل تین آسامیاں ہونے کی وجہ سے صرف تین لڑکوں کو منتخب کیا گیا۔ یوں ان کی یہ خواہش بھی پوری نہ ہو سکی۔

مسعود مفتی کے اهل خانه

ان کی بیگم بشریٰ مسعود ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ، انتہائی سلجھی ہوئی اور دھیمے مزاج کی خاتون ہیں۔ جنہوں نے فائن آرٹس میں ایم اے کیا ہوا ہے۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ "خاوند کی دفتری معروفیات کے ساتھ ساتھ گھر میں ان کی علمی و ادبی معروفیات کیسی لگتی ہیں؟" تو انہوں نے اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا کہ اپنے خاوند کا پڑھنا لکھنا انہیں اچھا لگتا ہے جس میں انہوں نے کبھی دخل اندازی نہیں کی۔ جب بچے چھوٹے تھے تو یہ ان میں مصروف رہیں اور جب بچے بڑے ہو گئے تو ان کا چونکہ فائن آرٹس کے شعبے سے تعلق ہے اس لیے انہوں نے اپنے آپ کو ہمیشہ کسی نہ کسی تخلیقی کام سے وابستہ رکھا اور مصروف رہیں۔ مسعود مفتی کا کہنا ہے "شادی سے پہلے ان کو اپنی والدہ کی ہر طرح سے مدد حاصل تھی جنہوں نے ان کے آرام کا ہمیشہ ہی خیال رکھا اور شادی کے بعد ان کی بیوی نے ان کے ساتھ ہر طرح سے تعاون کیا۔" انہوں نے ہمیشہ اپنے خیالات کو اپنی بیگم کے ساتھ discuss کیا اور ان کی بیگم جو خود بھی تخلیقی صلاحیتوں کی حامل با ذوق خاتون ہیں وہ نہ صرف اپنے خاوند کو اپنے نکتہ نظر سے آگاہ کرتیں بلکہ مجموعی طور پر ہمیشہ ان کی بہترین معاون بھی ثابت ہوئیں۔ ایک اور دلچسپ بات یہ ہے کہ دونوں کے ستارے ایک ہیں یعنی دونوں Pices ہیں۔ جس کی وجہ سے بھی دونوں کی عادات اور مزاج ملتے جلتے ہیں۔ مزاج کی موافقت اور ہم آہنگی نے ہی مسعود مفتی کو ذہنی آسودگی مہیا کی۔ جس نے ان کی عملی زندگی میں ان کو کامیابیوں سے ہمکنار کیا۔

مسعود مفتی کی اولاد میں چار بیٹے ہیں۔ یہ چاروں بیٹے ابھی سکول ہی میں پڑھ رہے تھے کہ 1980 میں انہیں منیلا میں Asian Development Bank میں ڈیپوٹیشن پر جانا پڑا۔ اس وقت ان کا سب سے بڑا بیٹا فیصل مفتی آٹھویں جماعت میں جبکہ سب سے چھوٹا بیٹا آفاق مفتی تیسری جماعت میں تھا اور جب یہ پاکستان واپس آئے تو چاروں لڑکے ایم۔ اے کر چکے تھے۔ سب سے

بڑے بیٹے فضیل نے امریکہ سے کمپیوٹر سائنس میں ایم ایس سی کیا ہے۔ وہ بی۔ایس۔سی کے دوران وطن واپس آئے اور والد سے کہا کہ وہ بی۔ایس۔سی چھوڑ کر انگلش لٹریچر پڑھنا چاہتے ہیں۔ والد نے منع کیا اور سمجھایا کہ پہلے اپنا کورس مکمل کریں پھر لکھنے کا شوق پورا کرتے رہیں۔ امریکہ میں قیام کے دوران اس نے اپنی ایک امریکی کلاس فیلو سے شادی کر لی۔ یہ پہلے ملازمت اور پھر سافٹ ویئر کے کاروبار سے منسلک رہے۔ جذبہ حب الوطنی کی وجہ سے وہ اپنا کاروبار پاکستان تک وسیع کرنا چاہتے ہیں۔

دوسرے نمبر پر بابر مفتی ہیں۔ جنہوں نے الیکٹریکل انجینئرنگ کے ساتھ ساتھ ایم بی اے بھی کیا ہوا ہے اور امریکن ایکسپریس بنک میں ملازمت کرتے ہیں۔ انہیں بھی جنون کی حد تک مطالعے کا لگاؤ ہے۔ مسعود مفتی کہتے ہیں کہ میرے اس بیٹے کا مطالعہ اس وقت بھی میری ساری عمر کے مطالعے سے زیادہ ہے۔ یہ جب بھی اسلام آباد آتے ہیں تو ان کا زیادہ وقت سیکنڈ ہینڈ کتابوں کی دکانوں میں نایاب کتابوں کو تلاش کرنے میں گزرتا ہے۔ کتابوں اور مطالعے کے شغف سے گمان کیا جا سکتا ہے کہ کسی مرحلے پر یہ بھی ضرور لکھنے کی طرف راغب ہوں گے۔

شہاب مفتی پیشے کے اعتبار سے کیمیکل انجینئر ہیں۔ ان کا انگریزی ادب کا مطالعہ خاصا وسیع ہے۔ لیکن ان کا رجحان سپورٹس کی طرف ہے۔ انہیں لکھنے کا بھی شوق ہے۔ سب سے چھوٹے صاحبزادے آفاق مفتی ہیں۔ انہوں نے بھی امریکہ سے ایم بی اے کیا ہے۔ کالج کے زمانے میں ان کی انگریزی نظمیں کالج میگزین میں شائع ہوئیں۔ پاکستان واپس آنے کے بعد ان کی یہ نظمیں مع اردو ترجمے کے ڈاکٹر وزیر آغا کے رسالے 'اوراق' میں چھپیں۔ ان کو موسیقی کا بھی شوق ہے۔ بچپن سے پیانو اور آرگن بجاتے تھے۔ اب غزل گائیکی بھی سیکھ چکے ہیں۔

اگرچہ مسعود مفتی کے بیٹوں نے زیادہ عرصہ ملک سے باہر گزارا لیکن اب تین بیٹے وطن میں سکونت اختیار کر چکے ہیں جبکہ بڑے بیٹے فضیل مفتی فی الحال امریکہ میں قیام پذیر ہیں۔ بابر مفتی اور شہاب مفتی کی شادیاں بھی پاکستان میں ہوئی ہیں۔ ان کی اولاد میں اپنے وطن اور ثقافت سے محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ بچپن سے ہی ان سب کو اس بات کی تعلیم دی گئی کہ جتنا مرضی ہے پڑھ لو۔ جہاں سے مرضی ہے پڑھو۔ جو بننا چاہتے ہو بنو۔ لیکن وطن لوٹ کر آنا ہے۔ چاروں بیٹوں کا مشترکہ شوق کتب بینی ہے۔

مسعود مفتی کے تمام بیٹے چھوٹی عمر میں ہی ملک سے باہر چلے گئے تھے اور پھر امریکہ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے لوٹے ہیں۔ باہر کی تعلیم و تربیت میں بہت ساری اچھی عادتیں سیکھ کر آئے ہیں۔ مثلاً سب

لڑکے اپنے کام خود کرتے ہیں۔ اپنے وقت کی باقاعدہ منصوبہ بندی کرتے ہیں اور کبھی انہوں نے اپنے وقت کو فضول کاموں میں ضائع نہیں کیا۔ مسعود مفتی کا بحیثیت والد اپنے بیٹوں کے ساتھ رویہ بڑا لبرل (Liberal) ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ انہیں اس بات کا ہمیشہ احساس رہا کہ ان کے بیٹوں کی پرورش بیرونِ ملک ہو رہی ہے اس لیے ملک میں اگر وہ سخت رویہ اختیار کریں اور باہر جا کر یہ آزادانہ ماحول میں پڑھیں گے تو ان کی شخصیت تضادات کا شکار ہو کر کہیں منفی اثر قبول نہ کر لے۔ اس لیے انہوں نے بہتر جانا کہ انہیں وقت اور حالات کے ساتھ چلنے دینا چاہیے۔ ان کو اچھائی اور برائی کی تمیز سکھا دی۔ اور پھر فیصلہ ان کے ہاتھ میں دے دیا۔ ان کے تمام بیٹے پابندِ صوم وصلوٰۃ ہیں اور بقول مسعود مفتی "میرے بچے مجھ سے زیادہ مذہبی ہیں۔" تاہم اس رجحان میں روشن خیالی اور وسعت نظری بھی شامل ہے۔ ان کے خاندانی پس منظر کے باوجود یہ واقعہ ان کی روشن خیالی ظاہر کرتا ہے کہ جب وہ لائلپور (حال فیصل آباد) کے ڈپٹی کمشنر تھے تو انہوں نے سیٹلائٹ ٹاؤن کی بڑی گراؤنڈ کے عین درمیان قبضہ گروپ کی ایک ناجائز زیرِ تعمیر مسجد کے انہدام کا حکم دیا۔ بات دراصل یہ ہے کہ مساجد کا احترام اور علمائے کرام کا مقام اپنی جگہ باعث تقدس سہی۔ مگر محض زمینوں پر قبضہ کرنے کے لیے ڈیڑھ اینٹ کی مسجدوں کی تعمیر کسی بھی دینی، فقہی اور مذہبی نکتہ نظر کے مطابق درست قرار نہیں دی جا سکتی۔ بلکہ ایسی مسجدیں بھی جن میں بیٹھ کر فساد کی سازشیں تیار کی جا سکتی ہوں، یا ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو کافر قرار دیتا ہو، انہدام کے لائق ہیں کہ حضور ختمی مرتبت حضرت محمد ﷺ نے خود "مسجد ضرار" کو ڈھا دینے کا حکم دیا تھا جس میں بیٹھ کر منافقین مسلمانوں اور خود حضور ﷺ کے خلاف سازشیں کرتے تھے!

عملی زندگی

مسعود مفتی کی عملی زندگی میں ایک بات بڑی واضح نظر آتی ہے کہ ان کی منزل ہر قدم پر تبدیل ہوتی رہی جس کا تفصیلی جائزہ ذیل میں بیان کیا گیا ہے۔

دیال سنگھ کالج لاہور ، ستمبر 1956 - دسمبر 1958

ایم اے انگلش کے بعد مسعود مفتی نے دیال سنگھ کالج میں انگریزی کے لیکچرار کے طور پر ملازمت کا آغاز کرتے ہوئے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا۔ اسی دوران 1958ء میں موسم گرما کی تعطیلات کے دوران وہ چند ہفتوں کے لئے سول اینڈ ملٹری گزٹ میں سب ایڈیٹر کی تربیت لیتے رہے۔ یہاں ان کا تجربہ کچھ خوشگوار نہ رہا۔ بقول مسعود مفتی:۔

"انہوں نے مجھے خوب رگیدا۔ گو میرا قیام وہاں صرف تین ماہ کا ہی تھا لیکن اس قیام کی تلخ یادیں ابھی تک میرے ذہن میں نقش ہیں۔"

ان کا کہنا ہے کہ فارن سروس میں جانے کی خواہش کے پیچھے ان کی جرنلسٹ بننے کی خواہش کچھ اس طرح چھپی بیٹھی تھی کہ ان کا خیال تھا کہ وہ فارن سروس میں شامل ہو کر بیرون ملک جائیں گے تو کسی مگر کچھ عرصہ ملازمت کرنے کے بعد پھر جرنلزم کو اختیار کر لیں گے۔ یوں ماں باپ کی خواہش بھی پوری ہو جائے گی اور ان کی بھی جو خواہش ہے، وہ حاصل کر لیں گے۔

اسی طرح عملی زندگی کا آغاز انگریزی کے لیکچرر کی حیثیت سے کیا۔ پھر سول اینڈ ملٹری گزٹ میں اپرنٹس شپ اور آخر کار سول سروس کا امتحان پاس کرنے کے بعد سول سروس میں شمولیت، عملی کارکردگی بھی ہمیشہ قابلِ رشک رہی۔ اس سلسلے میں وہ فرماتے ہیں:۔

"ہمارے والد نے شروع ہی سے کسی قسم کے خلاصے یا گائیڈ پڑھنے سے سختی سے

منع کیا ہوا تھا گھر میں ہم صرف درسی کتابیں پڑھتے اور خود ہی پڑھتے۔ ہمارے والد ٹیوشن کے بھی سخت خلاف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم سب بہن بھائیوں کو شروع ہی سے محنت اور اپنا کام خود کرنے کی عادت پڑ گئی۔ جس کا ہمیں اپنی عملی زندگیوں میں فائدہ ہوا۔ اور میرے اندر بھی یہ صلاحیت پیدا ہو گئی کہ "I could switch on easily from one subject to other" (میں ایک مضمون پڑھنے کے بعد دوسرے مضمون کی طرف بڑی آسانی سے مائل ہو جاتا) اور اس طرح بہت سارے علوم سے واقفیت ہونے کی وجہ سے مجھے اپنی سروس کے دوران بھی ہمیشہ فائدہ ہوا کیونکہ میری عملی بنیاد دوسروں کی نسبت زیادہ مستحکم تھی جس نے آگے چل کر اوب میں بھی میری مدد کی۔"

ٹریننگ کے مراحل، دسمبر 1958 تا فروری 1961

سول سروس کا امتحان پاس کرنے کے بعد وہ تربیت کے لیے سول سروس اکیڈمی گئے۔ عام طور پر یہ ٹریننگ نو ماہ کے عرصے پر محیط ہوتی تھی۔ لیکن اُس سال سی ایس ایس کے نتائج میں کچھ تاخیر ہونے کی وجہ سے اس کا دورانیہ مختصر کر دیا گیا تھا اور یوں یہ تربیت بجائے نو ماہ کے چھ ماہ کے لیے ہوئی۔ اس کے بعد چار ماہ انہوں نے چٹاگانگ (حالیہ بنگلہ دیش کا ایک شہر) میں گزارے۔ چٹاگانگ سے انہیں مزید ٹریننگ کے لیے کیمبرج یونیورسٹی انگلستان بھیجا گیا۔ جہاں سے انہوں نے پبلک ایڈمنسٹریشن میں دو سالہ پوسٹ گریجویٹ ڈپلومہ حاصل کیا۔ جولائی کے سخت گرم ترین مہینے میں لندن کے پُر فضا مقام سے پاکستان کے نسبتاً گرم علاقے بہاولپور میں آئے جہاں ان کو اسسٹنٹ کمشنر کی حیثیت سے تعینات کیا گیا۔ ان کی یہ پہلی تعیناتی آٹھ مہینوں کی تھی۔ یہ بھی دراصل ایک طرح کی ٹریننگ کی پوسٹ تھی۔ ان کو ڈپٹی کمشنر کے ساتھ لگایا گیا تھا۔ دیگر کاموں کے علاوہ ڈپٹی کمشنر کے ساتھ جاتے اور اس کے کام کا بغور مشاہدہ کرتے۔

بہاولپور کے بعد اگلی تعیناتی بحیثیت سب ڈویژنل مجسٹریٹ (SDM) کے ایک پسماندہ تحصیل پنڈدادن خان ضلع جہلم میں ہوئی۔ یہ ایک دور افتادہ اور پسماندہ قصبہ تھا اور ان کا دیہات کے ساتھ پہلا رابطہ۔ بقول ان کے:۔

"It was my first taste of village life"

اس سے بیشتر مسعود مفتی نے جہاں پہلی ملازمت کی تھی یعنی بہاولپور وہ ایک فیوڈل علاقہ تھا ۔ پنڈدادن خان کا علاقہ بہاولپور سے قدرے مختلف تھا ۔ یہاں کے لوگ زیادہ تر فوجی ملازمت کرتے ہیں

1962-63 میں ان کی تیسری پوسٹنگ پنڈی گھیب ہوئی ۔ یہاں بھی وہ سب ڈویژنل مجسٹریٹ بن کر آئے تھے ۔ اس وقت تحصیل پنڈی گھیب اور تحصیل تلہ گنگ دونوں کو ملا کر ایک سب ڈویژن تھا۔

پنڈی گھیب سے تبادلے پر ان کی لاہور سیکرٹریٹ میں بطور سیکشن آفیسر تقرری ہوئی۔ کچھ ہی عرصے کے بعد ان کی ترقی ہوگئی اور سیکشن افسر سے ڈپٹی سیکرٹری ہو گئے ۔ لاہور آنا ان کی زندگی کا اہم موڑ یوں بھی ثابت ہوا کہ یہاں ان کی منگنی محترمہ بشریٰ خان سے ہوگئی اور جلد ہی رشتہ ازدواج سے منسلک ہوئے اس کے بعد لاہور میں ہی فنانس ڈیپارٹمنٹ لاہور میں بطور ڈپٹی سیکرٹری فنانس مقرر ہوئے ۔ اس عہدے پر انہوں نے اگست 1963 سے اپریل 1964 تک کام کیا۔ اپریل 1964 میں یہ ڈپٹی سیکرٹری اسٹیبلشمنٹ ہوئے جہاں پر انہوں نے ستمبر 1964 تک کام کیا۔ لاہور کے بعد ان کی تعیناتی لورالائی میں بطور ڈپٹی کمشنر ہوئی۔

لورالائی میں قیام کے دوران ان کو مختلف قسم کے تجربات سے گزرنا پڑا۔ انہوں نے یہاں پر بہت کچھ سیکھا۔

عوامی فلاح کے منصوبے

لورالائی میں دور دراز کے ان مقامات پر جہاں طبی سہولتوں کا فقدان تھا، انہوں نے دس ڈسپنسریاں بنوائیں ۔ یہاں انہوں نے ایک لائبریری کی تعمیر کی بھی منظوری دی جس میں خواتین اور بچوں کے لیے علیحدہ علیحدہ سیکشن بنایا گیا۔ ان کے بعد ہر آنے والے ڈپٹی کمشنر نے اس میں اضافہ ہی کیا۔ بارہ برس بیشتر، اپنے قیام کے تقریباً 30 برس بعد جب مسعود مفتی لورالائی گئے تو انہیں یہ دیکھ کر بے حد مسرت ہوئی کہ ان کا لگایا ہوا ننھا پودا اب تناور درخت بن چکا ہے ۔ 42 سال پہلے لورالائی جیسے علاقے میں عورتوں کے لیے علیحدہ کمرے پر مشتمل لائبریری کا حصہ بنانا قابلِ ستائش بات تھی ۔ انہوں نے جہاں بھی سروس کی، عام لوگوں کی بہتری کے لیے کام کیا۔ کیونکہ یہ روایت سے ہٹ کر کام کرتے تھے اس لئے سروس کے دوران جتنے تبادلے بذریعہ ٹیلی گرام ان کے ہوئے ہیں، کم ہی لوگوں کے ہوئے ہوں گے ۔ ہر جگہ کوئی نہ کوئی بڑا آدمی ان کی راہ میں حائل ہوتا رہا اور ان کو قاعدے قانون کے تحت کام کرنے سے روکنے

کی کوشش کرتا رہا۔

1967 میں اُن کی پوسٹنگ لورالائی سے ضلع لائل پور (بعد ازاں فیصل آباد ڈویژن میں) ہوئی۔ یہ وہ دور تھا جب ون یونٹ ٹوٹ رہا تھا۔ مسعود مفتی کی خواہش تھی کہ ان کو واپس ان کے صوبے میں بھیج دیا جائے۔ چنانچہ اگلی ٹرانسفر پر 1970 میں ڈپٹی کمشنر لاہور کے عہدے کا چارج لیا جہاں انہوں نے مئی 1971 تک کام کیا۔

لاہور کے بعد ان کی تعیناتی بطور سیکرٹری تعلیم مشرقی پاکستان ہوئی۔ مشرقی پاکستان کے حالات اس وقت تک بہت خراب ہو چکے تھے۔ ملک میں خانہ جنگی کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ اور فوجی ایکشن ہو رہا تھا۔ سیاسی تصفیئے کا اس وقت تک بظاہر کوئی امکان نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایسے حالات میں مشرقی پاکستان کی پوسٹنگ کوئی حوصلہ افزا بات نہ تھی۔ محمد طفیل مدیر "نقوش" نے ایک خط میں انہیں لکھا:۔

> برادرم!
>
> جب آپ لاہور کی ڈپٹی کمشنری چھوڑ کر ڈھاکہ جانے لگے تو میں نے آپ کی سیکرٹری تعلیمات والی نوکری کو پسند نہیں کیا تھا بلکہ کہا تھا کہ کسی اسکول کی ہیڈ ماسٹری کر لیں مگر وہاں نہ جائیں لیکن آپ نے میری بات کا جواب یہ دیا تھا "فرض پکار رہا ہے۔ مجھے جانا چاہیے۔"!
>
> محمد طفیل

اس وقت تک مسعود مفتی خود کو بطور ایک ادیب کے نہ صرف متعارف کرا چکے تھے۔ بلکہ ان کی اپنی الگ شناخت بھی واضح ہو چکی تھی۔ ان کی چند کتابیں شائع ہو کر مقبولیت کی سند حاصل کر چکی تھیں اور "رگِ سنگ" پر ادبی انعام بھی مل چکا تھا۔ مشرقی پاکستان سیکرٹری تعلیم کے عہدے کے لیے انتخاب کو انہوں نے حق المقدور صحیح ثابت کیا۔ 1970 میں جب مسعود مفتی ڈپٹی کمشنر لاہور تعینات ہوئے تو علامہ علاؤالدین صدیقی پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ طلباء کے مسائل کی وجہ سے مسعود مفتی کا ان سے رابطہ رہا۔ مشرقی پاکستان جانے کے بعد بھی انہوں نے استاد محترم سے نہ صرف رابطہ رکھا بلکہ ان کے مشوروں سے اصلاحِ احوال کی حتی الامکان کوشش بھی کی۔ وہ فرماتے ہیں:۔

> "جب میں 1971 میں مشرقی پاکستان میں سیکرٹری ایجوکیشن تعینات ہوا تو دو مرتبہ لاہور آ کر پروفیسر حمید احمد خان صاحب سے تعلیم کے متعلق مشورے کیے وہ ان دنوں پنجاب یونیورسٹی کے سابقہ وائس چانسلر تھے اور انہوں نے بہت

اچھے مشورے دیے جن پر میں نے عمل بھی کیا۔ مگر یہ ہماری بد قسمتی تھی کہ دسمبر
1971 کی جنگ نے ان سب اصلاحات پر پانی پھیر دیا۔"

سقوطِ ڈھاکے کے آخری لمحوں میں وہاں پر متعین مغربی پاکستان کے اعلیٰ عہدوں پر تعینات سول افسران اور غیر ملکی سفارتکاروں کو عالمی ریڈکراس نے پرل کانٹی نینٹل ہوٹل ڈھاکہ میں منتقل کر دیا تھا، مسعود مفتی بھی ان میں شامل تھے۔ پرل کانٹی نینٹل کے چندروزہ قیام پر کیا قیامتیں تھیں جو ان پر نہ گزریں۔ ان چند دنوں کی روداد "چہرے" اور "لمحے" کے نام سے نہ صرف اردو ادب میں امر ہو چکی ہے بلکہ آنے والے مؤرخ کے لیے بھی یہ بہترین دستاویز ہیں۔

جنگی قیدی، دسمبر 1971 - جنوری 1974

1971 سے لے کر 1974 تک وہ ہندوستان کے کیمپ نمبر 29 میں بطور جنگی قیدی رہے۔ یہ کیمپ بریلی میں تھا۔ جس میں مغربی پاکستان کے اعلیٰ سول افسروں کو رکھا گیا تھا، بھارت اس کیمپ کے اسیروں کے اہل خانہ کو مسلسل اذیت میں مبتلا رکھنے کے لیے بار بار ریڈیو آکاش وانی سے یہ پراپیگنڈہ کر رہا تھا کہ اس کیمپ میں جو لوگ رکھے گئے ہیں ان پر "جنگی جرائم" کے سلسلے میں مقدمے چلائے جائیں گے۔ میں خود اس عذاب سے اچھی طرح واقف ہوں کیونکہ میرے والد مرحوم کرنل محمد اکبر بھی بریلی میں ہی واقع فوجی افسروں کے کیمپ میں اسیر تھے۔ مسعود مفتی کے گھر والوں پر جو کچھ بیتی، وہ بھی قیامت سے کم نہ تھی ایسی قیامت ہر قیدی کے اہل خانہ پر گزر رہی تھی۔

ہندوستان کی قید سے رہائی پانے کے بعد، مسعود مفتی 1974 میں جب وطن واپس آئے تو اس وقت بھٹو صاحب وزیرِاعظم تھے۔ وطن واپسی کے بعد ان کی پوسٹنگ پہلے مرکزی حکومت کی اکنامک افیرز ڈویژن میں مگر چندروز بعد بطور کمشنر راولپنڈی ہوئی۔ راولپنڈی میں ان کی ملازمت کا دور 1975 تک رہا۔ ایک دلچسپ اتفاق یہ ہے کہ انہوں نے بطور ڈپٹی کمشنر جتنے بھی اضلاع میں سروس کی وہ سب حرف 'ل' سے شروع ہوتے ہیں یعنی لاڑکانہ، لورالائی، لاہور اور لائلپور (موجودہ فیصل آباد)۔

1975 سے 1980 تک انہوں نے وفاقی حکومت میں جائنٹ سیکرٹری کے عہدے پر کام کیا۔ اسی دوران ان کو ایشین ڈویلپمنٹ بنک منیلا۔ فلپائن سے پیش کش ہوئی تو یہ ڈیپوٹیشن پر وہاں چلے گئے۔ 1980 سے لے کر 1991 کے اوائل تک اُن کا قیام فلپائن میں رہا۔ واپسی پر نیشنل ہائی وے اتھارٹی میں ممبر فنانس مقرر ہوئے۔ آخری پوسٹنگ بطور مینیجنگ ڈائریکٹرز کواٹا فاؤنڈیشن اسلام آباد تھی۔ یہیں

10 جون 1994 میں بخیر و خوبی سبکدوش ہوئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انہیں پنجاب پبلک سروس کمیشن میں بطور ممبر نامزد کیا گیا جس پر انہوں نے معذرت کر لی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد سے اب تک اسلام آباد میں ہی قیام پذیر ہیں اور نسبتاً خاموش اور پرسکون زندگی گزار رہے ہیں۔ البتہ ملکی حالات کے حوالے سے انگریزی اور اردو اخبارات میں کالم باقاعدگی سے لکھ رہے ہیں۔ گویا جہاں سے آغاز کیا تھا۔ انجام کار بھی اسی ڈگر پر ہے۔ ایک سیاسی پارٹی "پاک جمہور" کے نام سے بھی قائم کر رکھی ہے۔!

مسعود مفتی: بحیثیت ادیب

مسعود مفتی ابتداء سے ہی ادبی فن پاروں سے شغف رکھتے تھے۔تا ہم تحریری کاوشوں کی طرف ان کا دھیان نہ گیا اس کی وجہ اُن کی مصروفیات تھیں۔صریرِ خامہ میں وہ یوں رقم طراز ہیں:۔

''ضمناً یہ بھی عرض کروں کہ بزم ادب یا کالج کی دیگر سرگرمیوں میں شرکت کی کبھی فرصت نہیں ملی تھی۔میڈیکل گروپ کے طلباء طلوع آفتاب کے فوراً بعد پی ٹی کرنے کالج پہنچتے بعدازاں کالج سے ملحق دکانوں میں جا کر ناشتہ کرتے دوپہر تک کلاسوں اور بعد دوپہر پریکٹیکل میں مصروف رہتے۔اور بمشکل غروب آفتاب تک گھر پہنچ پاتے۔کشمیر کی جنگ کی وجہ سے رائفل ٹریننگ شروع ہوئی تو صبح وشام اس میں بھی مصروف رہتے۔اس لیے میرا غیر نصابی شغل صرف اردو اور انگریزی کے مباحثوں میں شرکت کرنے تک محدود تھا ویسے ادب سے لاشعوری اور غیر منظم تعلق ضرور تھا۔''

ایف ایس سی کے بعد میڈیکل کالج میں داخلہ نہ ہونے کے سبب انہوں نے بی ایس سی میں داخلہ لے لیا۔اس وقت اسلامیہ کالج میں تمام طلباء مختلف ٹیوٹوریل گروپ میں شامل ہوتے تھے۔اور ہر گروپ کا انچارج ٹیوٹر بہت اہم شخصیت ہوتا تھا جو کہ اپنے گروپ کے تمام طلباء کی ہم نصابی سرگرمیوں کا براہ راست انچارج ہوتا۔مسعود مفتی نے بھی جب فہرست دیکھی تو اپنا نام اس گروپ میں شامل پایا جس کے انچارج پروفیسر حمید احمد خان تھے۔بعدازاں کالج میں ان کی زیر نگرانی ادبی مجالس میں حصہ لیا اور اسی نے ان کی زندگی کا رُخ ہی تبدیل کر دیا۔

پہلی ادبی کاوش

پہلے انہیں بزم ادب یا کالج کی دیگر ادبی سرگرمیوں میں پری میڈیکل کا طالب علم ہونے کی وجہ سے شرکت کے لیے کبھی فرصت نہ ملی تھی۔ان کا ہم نصابی شغل صرف اردو اور انگریزی کے مباحثوں میں شرکت

تک ہی محدود تھا۔ انہوں نے نہ تو لکھنے کی کبھی کوئی خواہش کی تھی اور نہ ہی ادیب بننے کی۔ بلکہ بقول مسعود مفتی "یہ گناہ تو تصور نے بھی نہیں کیا تھا۔" اردو اور انگریزی کے مباحثوں میں انعام لینے کے علاوہ تعلیمی کارکردگی کی بناء پر کئی انعام حاصل کر چکے تھے اس لئے کالج کے طلباء ان کو جانتے اور پہچانتے تھے۔

ٹیوٹوریل گروپ کی پہلی ہفتہ وار نشست میں الیکشن کے بعد انہیں سیکرٹری چنا گیا۔ اگلی نشست میں انہوں نے بھی ایک مضمون پڑھا۔ جو کالج ریڈیو سے خبروں کی شکل میں کالج کے حالات پر مزاحیہ تبصرہ تھا۔ حمید احمد خان کو یہ مضمون اس قدر پسند آیا کہ اسی وقت انہوں نے مسعود مفتی کو "کریسنٹ" (کالج میگزین) کے انگریزی سیکشن کا اسسٹنٹ ایڈیٹر مقرر کرنے کا اعلان کر دیا۔ وہ خود اس کے انچارج تھے۔ فروری 1950 کے کریسنٹ کے شمارے میں یہ خبریں شائع ہوئیں جو اس وقت تک ان کی پہلی ادبی کاوش تھی۔ مسعود مفتی فرماتے ہیں:-

"گو یہ ایک چھوٹا سا واقعہ تھا مگر مجھے علم نہ تھا کہ اس تل کی اوٹ میں ایک پہاڑ چھپا ہے۔"

یوں ان کے قدم اپنی پرانی منزل سے ہٹ کر اپنی نئی منزل یعنی "بطور ایک ادیب" کی طرف اٹھنے لگے اور اپنی پہلی ادبی کاوش کے ظہور کے ساتھ بطور اسسٹنٹ ایڈیٹر انگلش سیکشن ان کا ادب وصحافت سے براہ راست تعلق پیدا ہو گیا۔

اسسٹنٹ ایڈیٹر۔ کریسنٹ

مارچ 1949 میں گورنر پنجاب سر فرانس موڈی جب کالج کے سالانہ کانووکیشن پر آئے تو اپنے خطبہ استقبالیہ میں کالج کے پرنسپل ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر نے تنگیٔ داماں اور 1300 طلباء کے انبوہ کثیر کی دہائی دی۔ ان حالات میں کریسنٹ کے لیے الگ دفتر کا تو سوال ہی نہ پیدا ہوتا تھا، بلکہ تحریروں کی ترسیل کے لیے کوئی پوسٹ بکس قسم کا آشیانہ بھی نہ تھا۔ ایک دوسرے سے رابطہ کرنا اور مضامین کا اکٹھا کرنا بہت کٹھن تھا۔ چنانچہ حمید احمد خان کے اعلان کے بعد مسعود مفتی کو یہ مرحلہ درپیش تھا کہ وہ دیگر مدیروں سے کیسے اور کہاں رابطہ کریں!

کالج میں سائنس اور آرٹس کے طلباء کا آپس میں رابطہ نہیں تھا جس وجہ سے مسعود مفتی بھی دیگر مدیروں سے واقف نہ تھے۔ صرف دھندلی سی یاد تھی کہ کانووکیشن کے موقع پر چند ماہ بیشتر عبدالعزیز خالد (اردو سیکشن کے انچارج) کو میڈل کے ساتھ رول آف آنرز اور عبدالحمید خیال (انگلش سیکشن کے انچارج) کو علمی مضامین کے انعامات لیتے دیکھا تھا۔ اور ان دونوں سے ان کی واحد

پہچان وہی دھندلی سی یاد تھی۔ عبدالعزیز خالد کا قیام تو ہاسٹل میں تھا مگر قدم نہ معلوم کہاں کہاں تھا۔ کیونکہ جب بھی ان سے رابطے کی کوشش کی جاتی وہ کمرے میں موجود نہ ملتے۔ عبدالحمید صاحب کا تو نام بھی خیال تھا۔ خیال کو ایک جگہ باندھنا جوئے شیر لانے کے برابر تھا۔ ان ہی دنوں کی روداد خود مسعود مفتی کی زبانی کچھ یوں ہے:-

''عبدالحمید صاحب کا تخلص بھی خیال تھا اور وہ غالب کے خیال کی طرح بیاباں نورد بھی تھے۔ اس لیے لائبریری، کاریڈور، کمروں، کھیل کے میدانوں، باغیچوں میں تلاش جاری رہی۔ کئی دن بعد فرداً فرداً رابطہ ہوا۔ مگر ردعمل دونوں کا یکساں طور پر مدبرانہ تھا۔ یعنی ''کریسنٹ'' کے متعلق استفسارات دخل در معقولات تھے۔ تاہم بعدازاں کھل گئے۔ پرچہ نکالنے کا پروگرام بنا۔ نوٹس بورڈ کی وساطت سے مضامین کی درخواست کی گئی۔ جو خزاں میں اڑنے والے زرد پتوں کی طرح کسی ٹک شاپ میں مل جاتے۔ کبھی کسی کاریڈور میں چلتے چلتے یا کبھی باغیچے میں دھوپ سینکتے ہوئے کوئی پتہ میرے سر پر آن گرتا۔ کوئی عبدالعزیز خالد کی جھولی میں جا گرتا۔ کوئی خیال ذوالفقار کے کانوں میں اٹک جاتا۔ اسی طرح فروری 1950 میں پہلا شمارہ شائع ہو گیا۔ پہلے ادھر اُدھر سے ملنے والے سادے کاغذوں پر ٹیڑھے میڑھے رسم الخط۔ کالی نیلی رنگا رنگ روشنائی۔ پھر دھات کے حرف حرف جوڑ کر بنے قالب۔ پھر پریس کے گھومتے ہوئے رولر میں سے چھپتے ہوئے اوراق کی بارش۔ پھر منتشر اوراق کی یکجائی کا حاصل پلندہ۔ اس پر رنگین ٹائٹل کی حسین پوشاک۔ بالآخر سفید ماتھے پر لال بندی کی طرح چمکتا ہوا اپنا نام۔۔۔ نیست سے ہست تک کریسنٹ کی ولادت کا کرشمہ اتنا سحر انگیز تھا کہ بقول غالب طبعیت نے زیست کا مزہ پایا۔''

''کریسنٹ'' کا یہ صرف پہلا شمارہ ہی نہ تھا بلکہ ان کی سب ایڈیٹری کی بھی پہلی کوشش تھی گزشتہ دو برس میں ''کریسنٹ'' کے صرف دو ہی شمارے شائع ہو سکے تھے۔ اب چونکہ ایڈیٹری منہ کو لگ چکی تھی اور طبعیت نے زیست کا مزہ بھی چکھ لیا تھا۔ لہٰذا انہیں خواہش ہوئی کہ ایک شمارہ اور بھی شائع ہو۔ اس وقت تک ان کا خیال تھا کہ شاید میگزین سالانہ ہے۔ ڈرتے ڈرتے اپنے استاد محترم کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ سال رواں میں ایک اور شمارہ شائع کرنے کی خصوصی اجازت دی جائے۔ پروفیسر حمید احمد خان کا جواب خود مسعود مفتی کی زبانی یوں ہے:-

''عینک اتار کر اس کی کمانی ہونٹوں میں تھامے وہ میری طرف دیکھنے لگے۔ پھر ذرا

وقفے کے بعد اپنے مخصوص دھیمے انداز میں سنجیدگی سے بولے "برخوردار ہمارے
پاس کافی فنڈز ہیں۔ آپ میں اگر ہمت ہے تو سال میں بارہ پرچے شائع کریں۔"
چنانچہ پوری ٹیم نے اس کو اپنے لیے ایک چیلنج سمجھا۔ کمر کس لی اور پھر چند ہی ہفتے کے بعد "کریسنٹ"
کا دوسرا شمارہ آ گیا۔ یوں

سمند شوق کو اک اور تازیانہ ہوا

جب 1949-50 کا تعلیمی سال ختم ہوا تو عبدالعزیز خالد اور عبدالحمید خیال کالج سے رخصت ہو گئے۔ موسم گرما کی چھٹیوں کے بعد کالج کھلا تو انگریزی سیکشن کی ایڈیٹری ان کا مقدر بنی جبکہ اردو سیکشن کے ایڈیٹر مظفر ضیاء بنے۔ اس دوران انہیں جان لیوا قسم کا ٹائی فائڈ بخار ہوا جس کی وجہ سے ان کے تین چار ماہ ضائع ہو گئے۔ مگر اس کے باوجود 1950-51 کے تعلیمی سال کے دوران انہوں نے "کریسنٹ" کے چار شمارے شائع کیے۔ پہلا شمارہ جولائی 1950، دوسرا شمارہ دسمبر 1950، تیسرا شمارہ فروری اور مارچ 1951 اور چوتھا شمارہ "تاثیر نمبر" کی صورت میں شائع ہوا۔ مضامین تاخیر سے ملنے کی وجہ سے اس کے چھپتے چھپتے جولائی 1951 ہو چکا تھا (تاریخ فروری ہی کی تھی) جب یہ شمارہ شائع ہوا تو اس وقت تک مسعود مفتی بھی کالج سے بی ایس سی کرنے کے بعد رخصت ہو چکے تھے۔ اس شمارے کی ایک اور خاص بات یہ تھی کہ تمام کام پروفیسر حمید احمد خان نے خود ہی کیا تھا اور لڑکے صرف پروف ریڈنگ اور طباعت کا کام کر رہے تھے اور یہ کام مسعود مفتی کالج چھوڑنے کے بعد بھی کرتے رہے اور یوں ان کی کاوش سے "کریسنٹ" کے چھ شمارے تو شائع ہو گئے لیکن ان کی اپنی بات بگڑ گئی۔

یہ پہلا موقع تھا کہ انہوں نے ادب لکھنے کا آغاز کیا۔ مطالعہ تو ان کا پہلے ہی کافی تھا۔ اب "کریسنٹ" کے ان شماروں میں اردو اور انگریزی کے دونوں حصوں میں شرکت کرنے سے انہیں لکھنے کا ایسا چسکا پڑا کہ ان کی اور ان کے گھر والوں کی ڈاکٹر بننے کی خواہش اس طرح بخارات بن کر "کریسنٹ" میں شامل ہو گئی جیسے دھوپ میں گیلا کپڑا سوکھتا ہے اور پانی بخارات بن کر ہوا میں تحلیل ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے سر پر اب جرنلزم کا بھوت بھی سوار ہو گیا۔ بقول اُن کے "جیسے گاؤں کی کنواریوں کو جن قابو کر لیتے ہیں۔ میں بھی جرنلزم کی گرفت میں مکمل طور پر جکڑا جا چکا تھا۔"

مسعود مفتی اس بارے میں ایک جگہ یوں لکھتے ہیں:-

"میں کچھ ایسے ہی موڈ کی گرفت میں تھا جس نے مرزا سے کہلوایا تھا

غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

اس زمانے میں پاکستان ٹائمز میں اقبال سنگھ کے مضامین باقاعدگی سے چھپتے تھے حقیقت کا تو علم نہیں مگر روایت یہ تھی کہ ان کا مضمون بیک وقت دنیا کے

ستائیس (27) اخبارات میں چھپتا تھا۔ یہ روایت الف لیلوی انداز میں میرے
لیے ایک رومانٹک آئیڈیل بن گئی اور گھر والوں کی حیرت، ناراضگی اور استہزا
کے باوجود میں نے ضد پکڑی کہ میں ڈاکٹر کی بجائے جرنلسٹ بنوں گا۔"

مسعود مفتی کا کہنا ہے "اگر پروفیسر حمید احمد خان ان کا رشتہ "کریسنٹ" کے ساتھ نہ جوڑتے تو وہ بلا چون و چرا ڈاکٹر بن گئے ہوتے۔" اور بعد میں چونکہ وہ فل ٹائم جرنلسٹ بنتے بنتے سول سروس میں چلے گئے تھے۔ اس لیے انہوں نے پہلے مزاحیہ مضامین اور بعد میں سنجیدہ ادب کا سہارا لیا۔ جس کا سہرا بھی کریسنٹ کے سر ہے اب ریٹائرمنٹ کے بعد محدود انداز میں اخباروں کے لیے لکھ رہے ہیں اور یہ بھی اسی خواب کی تکمیل ہے جو انہیں کریسنٹ نے دکھایا تھا۔

روشنی کے مینار:

پروفیسر حمید احمد خان اور شمس الدین صدیقی

"کریسنٹ" کے دو سالہ ادارتی دور میں ان پر پروفیسر حمید احمد خان کی شخصیت نے بہت اثر ڈالا، ایک اچھے تابع فرماں شاگرد کی طرح وہ آج بھی ان کا ذکر نہایت عقیدت و احترام سے کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے:-

"پروفیسر حمید احمد خان میرے لیے روشنی کا مینار تھے۔ جن کی زیر نگرانی کام کرنا
مفید بھی تھا اور مفرح بھی۔ وہ ڈسپلن کے معاملے میں سخت گیر تھے۔ معیار کے
معاملے میں مصلحت اور مصالحت کے خلاف تھے۔ وہ بڑے غیر محسوس انداز میں
رہنمائی کرتے تھے۔ چاہے وہ حوصلہ افزائی ہو یا سرزنش۔ پرچے کے لیے
مضامین کے انتخاب میں وہ صرف اس حد تک دخل انداز ہوتے تھے کہ کم سے کم
تحریریں مسترد ہوں۔ بعض اوقات خود تصحیح کر دیتے اور بعض اوقات لکھنے والے کو
بلا کر مناسب ترمیم کی ہدایت دیتے۔ طباعت کے عمل میں یعنی پریس کا
انتخاب۔ ٹائپ کا چناؤ، کاغذ کی دستیابی اور پروف ریڈنگ وغیرہ کے معاملوں
میں وہ کوئی دخل نہ دیتے تھے۔ البتہ مدیر کے لیے گرامر کی کتاب اور ڈکشنری کی
اہمیت پر بہت زور دیتے تھے۔ مجموعی طور پر ان کا طرز عمل ایسا تھا کہ ہم ان سے
ڈرنے کے بجائے مشورہ لینے میں کوئی جھجک محسوس نہ کرتے تھے۔"

پروفیسر حمید احمد خان کے دوستانہ رویے اور پرخلوص شخصیت کا اثر تھا کہ وہ قید کے دوران بھی ان کے عطا کردہ تحفہ سے تسکین پاتے رہے۔ مسعود مفتی نے ایک جگہ اس کا یوں ذکر کیا ہے

"خان صاحب مجلس یادگار غالب کے صدر تھے۔ 1969 میں مرزا غالب کی وفات پر ایک سو برس پورے ہوئے تو مجلس نے دیوانِ غالب کا نیا نسخہ شائع کیا آخری ملاقات میں خان صاحب نے یہ کتاب مجھے عنایت فرمائی۔ ہندوستان کی دو سالہ قید کے دوران یہ میری تنہائی کی رفیق رہی اور آج بھی استاد کی سوغات کے طور پر میرا قیمتی سرمایہ ہے"

پروفیسر حمید احمد خان کے ذکر کے ساتھ ساتھ وہ اردو سیکشن کے انچارج پروفیسر شمس الدین صدیقی کی ذات کو بھی اپنے لیے روشنی کا مینار سمجھتے ہیں، ان کا کہنا ہے اُس وقت میں ان کو نہیں جان سکا لیکن اب جان گیا ہوں۔ اپنے ایک مضمون میں وہ ایک واقعے کا ذکر کرتے ہیں جس سے پروفیسر شمس الدین صدیقی کی جرأت رندانہ اور اصولوں پر سمجھوتہ نہ کرنے کی صلاحیت کا احساس ہوتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:-

"دوسرے مینار اردو سیکشن کے انچارج پروفیسر شمس الدین صدیقی تھے دُبلے پتلے منحنی سے کم گو فلسفی نما انسان، اقبال کے مسلمان کو مسلمان بنانے والے چار عناصر کی طرح ان کی شخصیت کے بھی چار ہی عناصر تھے یعنی کتاب، عینک، سگریٹ اور پان، مجھے کریسنٹ کے متعلق اُنکے طریق کار کا تو اندازہ نہ تھا مگر پھر بھی میرے دل میں ان کی قدرو منزلت کی کوئی حد نہیں۔ جس کی وجہ ایک خاص واقعہ ہے۔

موسم گرم کی چھٹیوں میں طلباء کو کالج کی طرف سے انجمن حمایت اسلام کے لیے چندہ اکٹھا کرنے کی رسیدی کاپیاں دی جاتی تھیں جس کو ہم لوگ بہت ناپسند کیا کرتے تھے۔ زیادہ تر لڑکے ادھر اُدھر سے اکٹھا کرنے کی بجائے اپنے والدین سے وصول کر کے لے آتے تھے۔ اس لیے لوگ اسے چندے کی بجائے جُرمانہ کہتے تھے۔ اس طریق کار کے خلاف احتجاج کے طور پر میں نے ایک طنزیہ مضمون لکھا جس کا عنوان تھا" کیا کچھ نہ کیا چندے کے لیے" یہ دسمبر 1950 کے شمارے میں شائع ہوا۔ اور بہت مقبول ہوا۔"

جب وہ ڈپٹی کمشنر لاہور بنے تو انہیں پتہ چلا کہ ان کے لکھے ہوئے بظاہر ایک بے ضرر سے مضمون کی وجہ سے ان کے استاد کو کالج چھوڑنا پڑا۔ اس سے بھی زیادہ حیرت اور تعجب کی بات یہ تھی کہ صدیقی صاحب نے تو اس بات کا تذکرہ تک نہ کیا تھا۔ اس واقعہ کو سننے کے بعد انہوں نے صدیقی صاحب کی تلاش شروع کی، کسی نے بتایا کہ وہ پشاور یونیورسٹی میں پڑھاتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے انہیں دو خط بھی لکھے مگر کوئی جواب نہ ملا۔

ادبی کاوشیں

مسعود مفتی نے اردو ادب کی تقریباً تمام اصناف نثر میں خامہ فرسائی کی ہے۔ جن میں ڈرامہ، رپورتاژ، ڈائری، انشائیے، ناول اور افسانے شامل ہیں۔ کچھ عرصہ تک انہوں نے کارٹون نگاری بھی کی۔ ادبی زندگی کا آغاز مزاح نگاری سے کیا۔ سرکاری ملازمت کے تقاضوں کے پیش نظر چونکہ وہ اپنا ما فی الضمیر کھل کر بیان نہ کر سکتے تھے اس لیے 'افسانہ' کو اپنے قلبی جذبات کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ ان کی ہر کاوش کا ماخذ کوئی نہ کوئی سچا واقعہ ہے تاہم پلاٹ کردار، ان کے نام اور مقام فرضی ہیں۔ اسی طرح سقوط ڈھاکہ کے بعد تحریر کیا گیا ادب بھی ان کے مشاہدے کی سچ بیتیاں ہیں۔ اب ریٹائرڈ زندگی میں جبکہ وہ سرکاری قدغنوں سے آزاد ہیں اخبارات میں کالم نویسی کے ذریعے حقائق کو پوری ادبی شان سے بیان کرتے ہیں۔ ہمارے بدعنوان، غیر جمہوری، سیاسی کلچر کی اصلاح کے لئے ایک سیاسی جماعت ''پاک جمہور'' کے نام سے بھی شروع کر رکھی ہے، جو موجودہ تمام سیاسی پارٹیوں کی اندرونی امریت سے مختلف ہے۔ اور اُن سے مخالف سمت میں جمہوری تنظیم اور سوچ کی طرف جاتی ہے یہ وطن سے ان کی محبت کا ثبوت ہے۔ گویا پہلے قلم اور اب عمل سے اصلاحِ معاشرہ کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔

اعزازات/انعامات

مسعود مفتی کو ادبی خدمات کے سلسلے میں مختلف اعزازات سے بھی نوازا گیا۔ جن کی ترتیب اس طرح ہے:-

1- آدم جی ادبی انعام — پاکستان رائٹرز گلڈ کی جانب سے رپورتاژ ''چہرے'' پر یہ انعام انہیں 1974 میں دیا گیا۔

2- 6 ستمبر ادبی انعام — پاکستان رائٹرز گلڈ کی جانب سے ہی 1969 میں ان کے افسانوی مجموعے ''رگِ سنگ'' پر یہ انعام دیا گیا۔

3- قومی ادبی ایوارڈ — اکادمی ادبیات کی جانب سے ''بابائے اردو مولوی عبدالحق ایوارڈ'' 1999 میں رپورتاژ ''ہم نفس'' پر دیا گیا۔

مندرجہ بالا کتابوں کے علاوہ انہوں نے 1971 کی جنگ کے پس منظر میں جو افسانے لکھے وہ "ریزے" کے عنوان سے شائع ہوئے۔ ان کے تین اور افسانوی مجموعے محدّب شیشہ، سالگرہ اور توبہ بھی شائع ہو چکے ہیں۔ مزاحیہ ادب پر مبنی انشائیے اور افسانے 'سرِ راہے' میں شائع ہوئے۔ ایک ناولٹ بعنوان کھلونے شائع ہوا۔ جسے پاکستان ٹیلی ویژن نے سیریل 'جنون' کی صورت میں پیش کیا جو اپنے وقت کا مقبول ترین سیریل تھا۔ ڈراموں پر مبنی ایک کتاب 'تکون' جس کا مرکزی خیال "تعمیر، تقریر اور تقدیر میں جکڑے ہوئے افراد کے المیے" ہے، 1982 میں شائع ہوئی۔ ایک ڈائری جس میں مشرقی پاکستان میں گزارے ہوئے روز و شب کی روداد ہے "لمحے" کے عنوان سے شائع ہو چکی ہے۔ ان کی ادبی کاوشوں کے تذکرے سے قبل ان کے ادبی نظریات کا مختصر جائزہ لیا جائے تو اس کی خصوصیات اس تفصیل سے واضح ہو سکتی ہیں۔

ادب برائے زندگی

وہ "ادب برائے زندگی" کے نظریے پر یقین رکھتے ہیں۔ 1953 میں ادبِ لطیف کے سالنامے کے سلسلے میں ملک بھر کے کئی ادیبوں سے ایک سوال بعنوان "میرا مسئلہ کیا ہے" پوچھا گیا تھا۔ مسعود مفتی نے اس کے جواب میں یوں لکھا:-

> "میں کیوں لکھنا چاہتا ہوں؟ میں زندگی کو بہتر کرنے کے لیے لکھتا ہوں۔ افسانہ کو اگر صرف ذہنی عیاشی کا ذریعہ نہ بنایا جائے تو اس سے بہت بڑا کام لیا جا سکتا ہے۔ یعنی اپنی سوسائٹی کی اصلاح اور بہتری کی جا سکتی ہے۔ اس حوالے سے میں "ادب برائے زندگی" پر یقین رکھتا ہوں۔"

اس لحاظ سے وہ ترقی پسند تحریک سے متاثر نظر آتے ہیں۔ اگرچہ جب وہ ادب کی دنیا میں اپنا مقام پیدا کر رہے تھے اس وقت ترقی پسند تحریک کا زور ٹوٹ رہا تھا۔ 1949 میں ترقی پسند ادیبوں نے بہت بڑا جلسہ کیا جس میں انہوں نے یہ اعلان کیا کہ:-

> "وہ ادب جو زندگی کے قریب نہ ہو اس کو ہم زوال پذیر ادب سمجھتے ہیں۔ اور ایسے تمام ادیبوں کو ادب سے خارج کرتے ہیں جو زندگی کے بارے میں نہیں لکھتے۔"

اس سے اگلے برس ترقی پسند تحریک پر پابندی لگ گئی۔ لیکن ادب کی دنیا میں اس تحریک کی گونج ضرور موجود تھی۔ اس میں کئی نئے آنے والوں نے جن میں مسعود مفتی بھی شامل ہیں، بہت کچھ

سیکھا۔ مسعود مفتی کے ادب پاروں میں اس تحریک کا اثر نظر آتا ہے۔ ان کے تمام افسانوں کا اصل محرک حقیقی زندگی کے واقعات ہیں اور زندگی سے قریب ہیں۔

اکادمی ادبیات کے شمارہ 76 جولائی تا ستمبر 2007 میں اُن کے بارے میں ایک خصوصی گوشہ شائع ہوا ہے۔ جس میں ان کا ایک تفصیلی انٹرویو شائع کیا گیا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے ان کی ادبی زندگی پر اثرات کے بارے میں انہوں نے کہا:-

> ''ہم نے لکھنا انہی لوگوں سے سیکھا ہے۔ وہ سب تسبیح کی طرح زندگی کے دھاگے میں پروئے ہوئے تھے۔ کرشن چندر، قاسمی، بیدی، یہ لوگ ترقی پسند تحریک سے منسلک تھے۔ ان سب کے اثرات مجھ پر لاشعوری طور پر آئے۔ ادب برائے زندگی ترقی پسند تحریک کا نعرہ تھا اور میرا بھی ایمان ہے۔ بشرطیکہ وہ محض نعرہ بازی نہ بن جائے۔ حلقہ ارباب ذوق کی تحریک میں ایک سنجیدہ ٹھہراؤ تھا۔ میری تربیت ان دونوں نے کی ہے۔''

اہلِ قلم اور عصرِ حاضر

''مونتاج لاہور'' کے شمارہ نمبر 3، ستمبر تا دسمبر 2007ء میں ان کا ایک تحقیقی مضمون بعنوان ''اہلِ قلم اور عصرِ حاضر'' شائع ہوا ہے اس میں انہوں نے ادب کی تاریخ کا تنقیدی مطالعہ کرنے کے بعد یہ ثابت کیا کہ ادیب اگر سچے دل سے چاہیں تو معاشرے کی کایا پلٹ سکتی ہے۔ اس تحقیقی مضمون کا پس منظر یوں ہے کہ 2002ء میں اسلام آباد کی ایک ادبی تقریب منعقد ہوئی جس میں احمد ندیم قاسمی بھی لاہور سے شریک ہوئے تھے۔ رات کو مسعود مفتی نے احمد ندیم قاسمی کے ساتھ دیگر ادباء کو بھی گھر پر مدعو کیا۔ حالات حاضرہ، پاکستان کی زبوں حالی اور انحطاط پر بات چلی تو تحریکِ پاکستان کے دیئے ہوئے خواب بکھرنے تک پہنچ گئی۔ وہ لوگ جو تحریکِ پاکستان کے عینی شاہد تھے، زیادہ دلگیر اور مایوس نظر آتے تھے۔ انہوں نے احمد ندیم قاسمی کو کہا کہ وہ دانشوروں اور قلمکاروں کی کوئی ایسی فکری تحریک کیوں نہیں شروع کرتے جو اس مایوسی میں امید کی کرن پیدا کر سکے۔ احمد ندیم قاسمی نے کہا:-

''تحریک کبھی شروع نہیں کی جاتی، بلکہ خود بخود شروع ہو جاتی ہے۔''

مسعود مفتی کے استفسار پر کہ ان تمام حالات کے ہوتے ہوئے پاکستان میں ایسی کوئی تحریک کیوں نہیں شروع ہوئی، قاسمی صاحب نے بڑی طنزیہ فہمی سے کہا ''اس کا جواب میں بھی جانتا ہوں اور آپ بھی جانتے ہیں۔'' چنانچہ مسعود مفتی اس سوال کا جواب سمجھنے کے لئے ادبی تواریخ میں سے حوالے ڈھونڈنے لگے۔ جس

کا نتیجا ایک مقالے کے صورت میں شائع ہوا۔ ان کی اس تحقیق کو قارئین کی دلچسپی کی خاطر اختصار کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے جس سے مسعود مفتی کے ادبی نظریات اور تصورات کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

پہلا حوالہ

4 جنوری 1884 کو لندن میں متوسط طبقے کے چند اہلِ قلم اپنے وکیل دوست ایڈورڈ پیز (EDWARD PEASE) کے گھر اکٹھے ہوئے تاکہ جہاں تک ممکن ہو وہ اعلیٰ اخلاقی قدروں کے مطابق معاشرے کو بہتر بنائیں۔ ایک سوسائٹی بنائی گئی جس کے دو بنیادی اصول تھے، پہلا رائے کی آزادی اور دوسرا اظہار کی ذمہ داری۔ اس کا نام 'Fabian Society' رکھا گیا۔ ان کے مطابق ہر ممبر اپنی رائے یا تحریر کو پیش کرنے کا حق تو بلاشبہ رکھتا تھا۔ مگر ساتھ ہی نتائج بھگتنے کا ذمہ دار بھی وہ خود تھا اور سوسائٹی پر کوئی ذمہ داری نہ تھی۔ سوسائٹی کا مقصد صرف اتنا تھا کہ اس تحریر پر اپنی چھاپ لگائے بغیر مصنف کی تحریر کو آزادانہ بحث کے بعد یا تو معاشرے کے لیے بہتر بنایا جائے یا رد کر دیا جائے۔ وہاں ادب، آرٹ، علم تعلیم، مذہب، سیاست، سماج انگریز کی نو آبادیوں کے حالات اور پالیسیاں انگلینڈ میں مقامی صوبائی یا مرکزی حکومتوں کی پالیسیاں یا دیگر اصلاحات جیسے ہر قسم کے موضوع زیرِ بحث آتے تھے اور سوسائٹی کے اجلاس میں غور و خوض کے بعد شائع کر دیے جاتے۔ کئی ممتاز اہلِ قلم مثلاً جارج برنارڈ شا، گراہم ویلس اور ایچ جی ویلز، اس سوسائٹی کے روحِ رواں تھے۔ یہ سب دانشور خونی انقلاب کے بجائے عوام کی قلبی اور ذہنی تربیت سے معاشرے کو بدلنا چاہتے تھے۔ ان کا ایمان اس دن رنگ لایا جب انگلستان میں لیبر پارٹی کی بنیاد رکھی گئی تو آئین بنانے کا سہرا اسی سوسائٹی کے سر بندھا۔ انگلستان کے سابقہ وزیرِ اعظم ٹونی بلیئر بھی اسی سوسائٹی کے پروردہ ہیں۔ آج انگلستان اگر ایک فلاحی ریاست ہے تو اس کے حصول میں فیبئین سوسائٹی کی سوچ اور کوشش کا بہت دخل ہے۔

دوسرا حوالہ

1913 میں الجیریا میں پیدا ہونے والا البرٹ کامیو جو 47 سال کی عمر میں 1960 میں ایک حادثے میں مارا گیا، ادب کے علاوہ اور بھی بہت کچھ کر گیا۔ وہ دوسری جنگِ عظیم میں فرانس چلا گیا اور نازی جرمنی کے قبضے کے خلاف مدافعتی سرگرمیوں میں شامل رہا۔ خفیہ اخبار "The Combat" میں ژاں پال سارتر کا ساتھی مدیر بھی رہا۔ شہرہ آفاق ناول 'The Plague' لکھا۔ پلیگ ایک علامتی

استعارہ ہے جو کئی زاویوں سے بیرونی قابضوں کے ظلم وستم کی علامت ہے۔ اولاً حملہ آوروں کے ہاتھوں یقینی موت کا وہ خوف جو ہر محب وطن شہری کے سر پر ہر وقت سوار رہتا تھا۔ ثانیاً ہر انداز میں اس خطرے کا کامیابی سے مقابلہ کرنے والوں کی ہمت وایثار اور ثالثاً انسانی عزت نفس کی سربلندی اور جور وستم کا سامنا کرنے کی داستان۔ اس ناول کے بین السطور طرز عمل پر اس نے خود بھی اپنی عملی زندگی استوار کی۔

تیسرا حوالہ

ایک آنکھ سے قریباً اندھا ژاں پال سارتر جو 1905 میں فرانس میں پیدا ہوا۔ دوسری جنگ عظیم چھڑی تو لازمی فوجی سروس کے تحت محاذ پر پہنچا۔ 1940 میں جنگی قیدی بنا، فرار ہو کر تحریک 'The Resistence' ، جو فرانس پر جرمنی کے قبضے کے خلاف تھی، میں سرگرم ہو گیا اور ادیبوں، دانشوروں اور اہل قلم کا گروپ منظم اور فعال کیا۔ البرٹ کامیو کے ساتھ خفیہ اخبار The Combat کا ساتھی ایڈیٹر رہا۔ جنگ ختم ہونے کے بعد فرانس کی سرکاری پالیسی کے برعکس مارکسیت کا کھلا نقیب بن گیا۔ بار بار سوویت یونین جاتا رہا اسی ذہنی جھکاؤ کی وجہ سے 1964 میں نوبل پرائز لینے سے انکار کر دیا۔ مارکسی نظریات سے وابستگی کے باوجود بار بار روسی جبر واستبداد کے خلاف آواز بلند کرتا رہا۔ ہنگری پر روسی حملے اور روس کے ایک سیاسی قیدی Mikail Strerr کی رہائی کا مطالبہ کرنے کے لیے 50 نوبل انعام یافتہ مشاہیر کے جلوس کی سربراہی کی۔ ویت نام کی جنگ میں امریکہ کے خلاف اور الجیریا کی جنگ آزادی میں اپنے ہی ملک فرانس کے خلاف آواز اٹھائی۔ اس کے باوجود جب ملک کی خفیہ ایجنسیوں نے اس کی گرفتاری کی سفارش کی تو صدر فرانس چارلس ڈی گال نے کہا:-

"میں سارتر کو کیسے گرفتار کر سکتا ہوں وہ تو فرانس ہے"

چوتھا حوالہ

میلان کنڈیرا Milan Kundera، 1929 میں چیکوسلواکیہ میں پیدا ہوا۔ 1968 میں وطن پر روسی حملے میں اور قبضے کے بعد اس کی ساری کتابیں ضبط ہو گئیں۔ وہ فرار ہو کر فرانس چلا گیا اور وہاں کا شہری بن گیا۔ مگر دریں اثناء وہ خود صعوبتوں سے گزرتا رہا تھا۔ اور اپنے ناول کے انگریزی ترجمے 'Life is Elsewhere' کے دیباچے میں وہ لکھتا ہے:-

"میں نے وہ خون آشام دور حکومت بڑے قریب سے اور اپنی آنکھوں سے

دیکھا ہے، جب شاعر اور جلاد دوستانہ انداز میں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے کھڑے ہوئے تھے ایک جلاد جب سر کاٹتا ہے تو کوئی نئی بات نہیں، کیونکہ سر کاٹنا اس کا پیشہ ہے۔ مگر جب اس مہلک وار کی سنگت میں ایک شاعر دست قاتل کا قصیدہ پڑھتا ہے تو وہ ساری اقدار دھڑام سے نیچے آن گرتی ہیں جنہیں ہم مقدس سمجھتے رہے ہیں۔ ہمارے آس پاس کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ اور زندگی کی ہر سلوٹ ایک مہمل سا سوالیہ نشان بن کر تشکیک کے ملبے تلے دب جاتی ہے۔"

پانچواں حوالہ

ہماری اپنی تاریخ ہے ترقی پسند تحریک کی زندگی سے نبرد آزما ہونے والی توانائی پاکستان کے پہلے چند برسوں میں نظر آتی ہے۔ فیض احمد فیض کے دھیمے لہجے میں احتجاجی آزردگی ہمیشہ شامل رہی۔ حبیب جالب باغیانہ اور پُرشور احتجاج کرتا رہا۔ احمد فراز کی رومانی شاعری میں بھی کبھی کبھی سیاسی احتجاج کے ابال آتے رہے۔ اسی موڈ میں حکومتی اعزاز کی واپسی کا اعلان بھی شامل ہے۔ ان کے علاوہ بھی کئی فنکاروں کے احتجاج کسی وقت بلبلے کی طرح سر اٹھاتے رہے ہیں۔ یہ تمام چنگاریاں اگرچہ شعلوں کی طرح نہ بھڑک سکیں پھر بھی ٹھنڈی خاک سے تو یقیناً بہتر ہیں۔

چھٹا حوالہ

6 اگست 2006 کو Dawn اخبار میں دو یورپی اور دو عرب مصنفوں کا مشترکہ مضمون جس کا موضوع "لبنان پر اسرائیل کی ننگی جارحیت" ہے، شائع ہوا۔ جس میں نہتے لبنانی شہریوں کا لگاتار بمباری سے قتل عام کا تذکرہ ہے۔ تحریک حزب اللہ کا ناقابل یقین سرفروشانہ مقابلہ کی روداد ہے۔ مصر کی حکومت کا اعلانیہ جھکاؤ اسرائیل اور امریکہ کی طرف ہے اور وہ حزب اللہ کو جنگ کا ذمہ دار ٹھہرا رہی ہے تو قاہرہ کے سب سے بڑے چوراہے میں ادیب اور آرٹسٹ اپنی تنظیم "Artists and Writers for Change" کے ذریعے بہت بڑا مظاہرہ کرتے ہیں۔ مسلم ممالک کی کٹھ پتلی حکومتوں کے خلاف یہ نعرے لگاتے ہیں "مصر، اردن اور سعودی عرب کے حاکمو! نصر اللہ تم سے بازی لے گیا۔" ناروے کے مشہور ناولسٹ Jostein Gaurder نے بھی اوسلو کے اخبار Aften Post میں شائع ہونے والے اخبار میں اپنے مضمون میں اسرائیل کی جارحیت کی شدید مذمت کی۔

مسعود مفتی یہ سارے حوالے دینے کے بعد اپنی رائے کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:-

"مشتے از خروارے کے طور پر یہ صرف چند مثالیں ہیں ان دانش وروں کی جنہیں احساس تھا کہ وہ دوسرے لوگوں سے مختلف ہیں ان کی تخلیقی سوچ، فہم و فراست کی زرخیزی، حساس طبیعت اور دردمندی انہیں دوسروں سے مختلف بناتی ہے۔ بعد ازاں اپنی صلاحیتوں کی مناسب تربیت اور نشوونما نے انہیں روشن دماغی اور روشن ضمیری عطا کی ہے۔ اور اب اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس اندرونی روشنی سے اپنے ماحول کی تاریکی کو ختم کریں یا اسے کم تر کرنے کی جدوجہد کرتے رہیں۔ اگر کوئی دانش ور قدرت کے اس عطیے کی ذمہ داری مصلحتوں پر قربان کر دیتا ہے تو اس کی قدرتی ذمہ داری تو ختم نہیں ہو جاتی البتہ اس کی اندرونی روشنی ماند پڑ جاتی ہے اور وہ آسمان پر رات کے ڈب اکبر یا صبح کے روشن ستارے کی طرح مسلسل چمکنے کی بجائے دیگر ستاروں کے جھرمٹ میں مدغم ہو جاتا ہے۔"

آخر میں وہ اپنے ہم عصر ادیبوں اور شہریوں سے ایک سوال کرتے ہیں کہ:-

"کوئی کیا بتائے کہ قوم کے دیدہ و بینا کے طور پر پاکستانی ادیب کی کیا ذمہ داریاں ہیں۔ خصوصاً جب دوسری قوموں کے دانش ور کسی کے بتائے بغیر یہ ذمہ داریاں پوری کر رہے ہیں۔"

مسعود مفتی البتہ اسکو اپنا ایمان مانتے ہوئے یہ ذمہ داری اپنے طور پر پوری کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اپنی سوچ کا سچا اور کھرا اظہار ضروری ہے چاہے وہ کسی بھی صنف میں کیا جائے۔ ان کے فکری نظریات کے اجمالی جائزہ کے بعد ان کے تخلیقی کام کے جائزہ کی تفصیل پیش نظر ہے۔

1- اظہار کی ایک شکل۔ کارٹون نگاری

اس حقیقت سے چند لوگ ہی آشنا ہوں گے کہ زمانہ طالب علمی میں مسعود مفتی نے مزاحیہ تحریریں لکھنے کے ساتھ کارٹون بھی بنائے۔ فروری 1950 میں جب ان کی معاونت سے "کریسنٹ" کا پہلا شمارہ پریس میں تھا تو ان کو ایک خیال سوجھا۔ کالج میں ایک عدد سائیکل سٹینڈ تھا جو کہ ہمیشہ بدنظمی کا منظر پیش کرتا تھا۔ انہوں نے کالج سائیکل سٹینڈ کے متعلق ایک کارٹون بنایا اور پروفیسر حمید احمد خان کے پاس لے گئے۔ وہ پہلے تو کارٹون کو خاموشی سے دیکھتے رہے پھر بغیر کچھ کہے مسعود مفتی کو ساتھ لے کر پرنسپل

کے کمرے کی طرف چل دیے۔ پرنسپل ڈاکٹر محمد دین تاثیر نے کارٹون کو دیکھنے کے بعد اپنا سر شاباش دینے کے انداز میں ہلایا اور ان سے کہا کہ :-

"دیکھو اصل بات ہے اظہار کرنا، اپنے خیال کا اظہار جس شکل میں بھی کر سکتے ہو کرتے جاؤ۔ دونوں چیزیں ایک جیسی اہم ہیں۔ آئیڈیا بھی اور اسے اظہار کی شکل بھی۔"

چنانچہ اپنے اساتذہ کرام کی حوصلہ افزائی کے بعد مسعود مفتی ہر پرچے میں اپنا بنایا ہوا ایک کارٹون ضرور شامل کر دیتے تھے۔ اسلامیہ کالج سے فارغ التحصیلی کے ایک سال بعد ایک دن پروفیسر حمید احمد خان نے کسی لڑکے کی معرفت انہیں کالج بلوا بھیجا۔ جب یہ سٹاف روم میں اپنے استاد محترم سے ملنے گئے تو حمید احمد خان نے انہیں کہا کہ ڈین صاحب (کرنل محمد اسلم) کو طلباء کی عرضیوں نے اتنا ہراساں کیا ہوا ہے کہ انہیں غسل خانہ جانے کا بھی وقت نہیں ملتا۔ انہوں نے مسعود مفتی سے کہا کہ وہ اس پس منظر میں جلدی سے ایک کارٹون بنا دیں۔ کیونکہ "کریسنٹ" کا شمارہ پریس میں جا چکا ہے۔ چنانچہ مسعود مفتی نے ان کے کہنے پر ان کی ہدایت کے مطابق ایک کارٹون بنا دیا۔ بعد میں کارٹون بنانے کا سلسلہ گورنمنٹ کالج لاہور کے میگزین "راوی" میں بھی جاری رہا۔ اور ہندوستان میں قید کے ایام میں بھی انہوں نے اپنی بہت ساری ذہنی کیفیات کے اظہار کے لیے "کارٹون" کا سہارا لیا۔

2- مسعود مفتی بحیثیت ڈرامہ نگار

اُن کے ڈراموں کا اب تک صرف ایک مجموعہ شائع ہوا ہے جس کا نام "تکون" ہے۔ اس میں ان کے چار ڈرامے بعنوان روپے، نصیب، گنجلک اور گڑھے شامل ہیں۔ ان ڈراموں میں فرد اور ماحول کے باہمی ناہموار رشتوں کا تذکرہ ہے جس کا مجموعی تاثر کچھ اس طرح ہے کہ :-

"زندگی انتہائی پیچیدہ گنجلک ہے۔ اس میں کوئی پتہ نہیں چلتا کہ کس کے عمل کا تار کس کی قسمت میں اٹکا ہے۔ ہمیں کوئی اندازہ نہیں کہ کہاں سے ڈوری کھنچے گی اور کون سی گرہ پکی ہو جائے گی یا کھل جائے گی۔ بعض اوقات ایک ہی جھٹکے سے سارے تار سیدھے ہو جاتے ہیں اور بعض اوقات صدیوں کی محنت یہ گنجل نہیں کھول سکتی۔ زندگی کی یہی پیچیدگیاں ایک سیدھے سادے اور معصوم انسان کو مجرم بنا دیتی ہیں۔ درحقیقت مجرم خود پیدا نہیں ہوتا بلکہ حالات اسے مجرم بنا دیتے ہیں۔"

1969 میں انہیں ٹیلی ویژن حکام کی طرف سے "مجرم خود پیدا نہیں ہوتا بلکہ حالات اسے مجرم

بنا دیتے ہیں" کے مرکزی خیال پر مبنی ایک ڈرامہ سیریل لکھنے کی فرمائش کی گئی اور یہ طے پایا کہ ان ڈراموں کو "درزنداں کھلتا ہے" کے عنوان سے ٹیلی ویژن پر پیش کیا جائے گا۔ان کا پورا ادبی اثاثہ ہی فرد اور ماحول کے باہمی ناہموار رشتوں پر محیط ہے اور یہی ان کا پسندیدہ موضوع ہے اس لیے انہوں نے آمادگی ظاہر کی۔انہیں اپنی ملازمت کے سلسلے میں بے شمار کرداروں اور کہانیوں سے واسطہ پڑ چکا تھا۔اور اپنی عدالتی مصروفیات میں بھی انہوں نے بہت سے ایسے واقعات کا نہ صرف مشاہدہ کیا بلکہ عدالتی فیصلے بھی کیے تھے۔انہوں نے ایسے ہی تین کرداروں کی سچی روئیداد کا انتخاب کیا اور تین ڈرامے لکھ کر ٹیلی ویژن کو بھیج دیئے۔یہ ایک طرح سے ان کی پہلی قسط تھی ان کا مدعا یہ تھا کہ ٹی وی کا ردعمل سامنے آنے پر اس سلسلے کو مزید آگے بڑھائیں گے۔

ٹیلی ویژن والوں نے ڈراموں کو پسند تو کیا لیکن ساتھ ہی چند ترامیم بھی تجویز کیں۔ جو مصنف کے لئے ناقابل قبول تھیں۔اس لئے یہ ڈرامے نشر نہ ہو سکے۔یہ ڈرامے "گھٹلک"، "نصیب" اور "گڑھے" تھے۔"گھٹلک" کی کہانی کے مرکزی کردار امینہ، افضل اور افضل کا والد معاشرے کے ستائے ہوئے افراد ہیں۔امینہ ایک ایسے بچے کو جنم دیتی ہے جو امینہ کے پیار کی نشانی ہے۔اس کی شادی محبوب کی بجائے اپنے چچازاد بھائی افضل سے ہو جاتی ہے۔یوں ایک ایسا شخص جس کا امینہ کے ماضی سے کوئی واسطہ نہیں کوئی رشتہ بھی نہیں، نہ پیار کا نہ نفرت کا، اس کو امینہ کے ناخوشگوار ماضی کا نہ صرف سامنا کرنا پڑتا ہے بلکہ نتائج بھی بھگتنا پڑتے ہیں۔وہ بچے کو قتل کر دیتا ہے اور یوں اس سے وہ جرم سرزد ہو جاتا ہے جس کی پاداش میں اس کو پھانسی کی سزا دی جاتی ہے۔افضل کی کالج میں اپنی ایک ہم جماعت سیمیں سے دوستی ہوتی ہے لیکن اپنے باپ کے مجبور کرنے پر وہ اس کو چھوڑ کر امینہ سے شادی کر لیتا ہے۔جبکہ اس کے والدین کو امینہ اور نثار کے باہمی تعلقات کا علم بھی ہوتا ہے، جن کے نتیجے میں وہ حاملہ ہو چکی تھی۔یوں دو کردار یعنی امینہ اور افضل تقدیر کے چکر میں پھنس جاتے ہیں۔

افضل کا والد بھی حالات کے ہاتھوں یوں مجبور تھا کہ اس کے والدین اس کے بچپن میں فوت ہو چکے تھے اور اس کو بڑے بھائی نے باپ بن کر پالا۔تعلیم دلوائی اور بڑا ہونے پر اس کی شادی اپنی بیوی کی بہن سے کرادی گئی۔دیکھا جائے تو افضل کا باپ غلام محمد بھی حالات و واقعات کے گرداب میں پھنسا ہوا ایک کردار ہے۔اس نے کب چاہا تھا کہ اس کے ماں باپ بچپن میں فوت ہو جائیں۔اور یوں اس کو اپنے بڑے بھائی کا اس حد تک احسان مند ہونا پڑے کہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے ہی کی قربانی دے ڈالے۔پورے ڈرامے میں حالات، واقعات اور ان کی زد میں آئے ہوئے کردار یہی تصویر پیش کرتے ہیں کہ:

ناکردہ گناہوں کی سزا پائے ہوئے ہیں۔

سب کردار حالات کے دھارے پر بہتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ امینہ جو افضل کی بیوی اور اپنے پڑوسی نثار کی عاشق اور محبوبہ ہے نثار کی حادثاتی موت کے بعد جبکہ ان کی شادی طے پا چکی ہے ذہنی طور پر بچے کی ماں بننے کے لیے تیار تھی۔ جب ملزم افضل اس کے اس بچے کو درندگی سے قتل کرتا ہے تو اس کی ممتا وحشی درندے کی طرح انتقام لینے پر تل جاتی ہے اور انتقام بھی کس سے؟؟؟ اپنے شوہر سے۔۔۔ اپنے محسن سے۔۔۔ جو اس کے چچا کا اکلوتا بیٹا بھی ہے اور جس نے اس سے اس وقت شادی کی جب بظاہر اس کا کوئی مستقبل نہیں تھا اور وہ اس راستے پر چل پڑی تھی جو طوائف کے کوٹھے کی جانب جاتا ہے۔ تقدیر کس کس طرح سے انسانوں کو اپنے شکنجے میں جکڑ لیتی ہے۔ اس ڈرامے کا مرکزی خیال انسان کی بےبسی اور لاچاری ہے۔ افضل کا باپ عدالت میں جج کے سامنے یہ کہتا ہے:-

"جناب والا! یہ ایک دن کا فیصلہ نہ تھا۔ یہ تو میرے سارے ماضی نے کیا تھا۔ میرے بڑے بھائی، میرے محسن میرے باپ کی لڑکی مصیبت میں تھی۔ اسے اس وقت سہارا نہ دیا جاتا تو اس کی واحد منزل رنڈی کا کوٹھا تھی اور وہاں وہ اکیلی نہ جاتی۔ ہمارے سارے خاندان کی عزت اس کے ساتھ جاتی۔ مجھے اس کو بچانا تھا۔ اپنے بھائی کو بچانا تھا اور ایک عظیم سانحے پر پردہ ڈالنا تھا ایک زلزلے میں میں نے ماں باپ کھوئے تھے۔ اس دوسرے زلزلے میں ہمارا سارا خاندان تہس نہس ہو رہا تھا۔ میں نے سوچا شاید اپنے بیٹے کی قربانی دے کر اس قہر کو روک سکوں۔ مگر۔ بیٹا بھی گیا۔ خاندان بھی گیا۔ عزت بھی گئی۔ سب کچھ گیا۔"

"سکون" کا ایک ڈرامہ "نصیب" ہے جو قبائلی علاقوں اور وہاں کی سوسائٹی کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ یہ ایک ستم رسیدہ عورت بلقیس کی کہانی ہے جو چھٹی جماعت کی طالبہ تھی کہ سکول کی مائی اسے بہلا پھسلا کر سکول سے لے گئی۔ اور ایک پٹھان کے ہاتھ اُسے بیچ دیا یوں یہ بار بار بکتی ہوئی قبائلی علاقے میں پہنچ گئی۔ جہاں پر وہ اپنی ماں اور اپنے بچپن کو یاد کرتے روتے ہوئے عمر گزار رہی ہے۔ یہ ایک قبائلی بلند خان کے گھر میں ہے۔ باوجود اس کے کہ اس کے گھر میں وہ رہی ہے اور اس کے بچوں کی ماں بن چکی ہے جن کو وہ تسلیم بھی کرتا ہے کہ یہ اس کے اپنے بچے ہیں۔ لیکن نکاح کے لیے پھر بھی آمادہ نہیں ہے۔ بلقیس اپنے لیے اس زندگی کو ذلت کی زندگی سمجھتے ہوئے کئی بار ماضی کی طرف لوٹنے کی غرض سے گھر سے بھاگتی ہے۔ مگر ہر بار پکڑی جاتی ہے اور پھر اس پر مظالم کا نیا سلسلہ شروع کر دیا جاتا ہے۔ اس کے پاؤں کے تلوؤں میں سوراخ کیے جاتے ہیں۔ اس کی پنڈلیوں کی رگیں کاٹ دی جاتی ہیں کہ پھر بھی بھاگ نہ سکے۔ اس کے باوجود وہ کسی طرح وہاں کے پولیٹیکل ایجنٹ تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ جو اس کو بلند خان کے چنگل سے بچا کے لے آتا ہے۔ مگر تقدیر تمام تدابیر پر خندہ زن تھی۔ ماں اس

کو لینے تو آ گئی مگر مجسم بے بسی کی تصویر بنی ہوئی۔ اس نے بیوگی کے بعد بچی کا سہارا لیا تھا۔ جب تقدیر نے اس سے یہ بچی بھی چھین لی تو وہ عقدِ ثانی کرنے پر مجبور ہوگئی اور اب ایک بڑے سرکاری افسر کی بیگم ہے۔ جس نے اس سے وعدہ لیا ہوا ہے کہ وہ اپنے ماضی کو بھول کر ایک نئی زندگی کا آغاز کرے گی اور کسی سے اپنے ماضی یا اپنی بیٹی کا کوئی ذکر نہیں کرے گی۔ وہ ممتا کی ماری بیٹی کو لینے آ تو گئی ہے لیکن پریشان ہے کہ وہ بلقیس کو لے جا کر رکھے گی کہاں؟ وہ ڈر رہی ہے کہ کہیں بیٹی کو بساتے بساتے اس کا اپنا گھر نہ اجڑ جائے۔ وہ بلقیس کو اس موہوم سی امید کے سہارے ساتھ لے جا رہی ہے کہ شاید اس کا خاوند مان جائے وہ سوچتی ہے کہ جب تک اس کا خاوند اس کی بیٹی کو ساتھ رکھنے پر رضامند نہیں ہوجاتا وہ اس کو الگ مکان میں رکھ لے گی۔

بلقیس جو ایک موقع پر پولیٹیکل ایجنٹ کو یہ تک کہتی ہے کہ:-

''نہ ہو جی کوئی میرا پنجاب میں۔ ماں باپ، بہن بھائی کوئی نہیں تو کیا ہوا؟ وہاں کے اینٹ روڑے تو میرے ہیں۔ وہاں کی گلیاں سڑکیں تو میری ہیں۔''

ان حالات میں جب اس کو ماں ملتی ہے تو بہت سارے ارمانوں کے ساتھ وہ اپنے بچوں کو لے کر اپنی ماں کے ساتھ چل پڑتی ہے۔ بلند خان نے بہت منت سماجت کی کہ اب وہ اس کو کبھی نہیں ستائے گا لیکن بلقیس کو تو اب اپنی ماں کا 'پولیٹیکل ایجنٹ' کا اور سب سے بڑھ کر اپنے آبائی علاقے کا سہارا تھا۔ وہ بلند خان کے ساتھ جانے سے انکار کر کے ماں کے ساتھ چل پڑتی ہے۔ بلند خان کو ایک برس کی قید ہوجاتی ہے اور بظاہر بلقیس بیگم کے دکھوں کا مداوا ہوتا نظر آتا ہے۔ مگر کیا کیجئے اس تقدیر کا جس کی زد میں آیا ہوا کوئی بشر بچ نہ پایا۔ والدہ نے علیحدہ مکان میں تو رکھا مگر کسی طرح اس کے خاوند کو پتہ چل گیا۔ اس نے ماں بیٹی کا ملنا جلنا بند کرا دیا اور حالات اس نہج پر چل پڑے کہ آخرکار بلقیس کی ماں کو بیٹی یا خاوند میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑا۔ اس نے گرہستی کو بیٹی پر ترجیح دی کہ ابھی مزید دو بیٹیاں اس کے دوسرے خاوند سے بھی تھیں۔ بلقیس کے دن مزید برے ہوگئے۔ نوبت فاقوں تک آ پہنچی۔ کسی اخبار میں اس کا فیچر چھپ گیا۔ لوگ اس سے بچنے لگے۔ محنت مزدوری بھی نہ مل سکتی تھی کہ لوگ مغویہ ہونے کی وجہ سے اس کو اپنے گھر رکھنے پر تیار نہ ہوتے۔ اسے قدم قدم پر ناجائز اولاد کے طعنوں کے تیروں سے چھلنی کرنے تو ہر قدم پر ملتے لیکن کوئی فرد نہ ہی کوئی ادارہ اس کی مدد پر آمادہ ہوا۔ قبائلی علاقے میں تو اس کا جسم زخمی تھا مگر اب تو اس کی روح بھی گھائل ہو رہی تھی۔ جس ماں کے انتظار میں اس نے پندرہ سال گھل گھل کر گزار دیے، امتحان کی گھڑی میں اسی نے بلقیس کو کہا:-

''تیری ماں جب تجھے نہ پا سکی تو تجھے بھول کر اپنا گھر بسا لیا۔ اب تو بھی ماں کو بھول جا بیٹی اور جا کر اپنا گھر بسا لے اپودے کی بیل کی طرح اگر عورت کو سہارا

نہ ملے تو یہ مٹی میں مل جاتی ہے۔ میں نے دس سال مٹی میں رہ کر دیکھ لیا ہے۔
بیٹی! سہاروں کی قدر جانتی ہوں۔ اگر تو بلند خان کو پہلے قسمت کا دھوکا سمجھ کر اس
سے نفرت کرتی تھی تو اب غیبی سہارا سمجھ کر قبول کر لے۔''

انجام کار بلقیس اپنے ہاتھوں سے بلند خان کے جسم میں چھرا گھونپتی ہے اور خود پھانسی کی سزا پاتی ہے۔ جب اس سے اس کے بچوں کا پوچھا جاتا ہے تو جیسے اس کے ایک ایک حرف میں اس کی گھائل روح اور زخمی دل کی کرچیاں گویا ہوتی ہیں۔''اپنے اپنے نصیب کے پاس۔ وہ اسی کوٹھڑی میں آنے کے انتظار میں بڑے ہو رہے ہیں۔''

غرض یہ کہ بلقیس، اس کی ماں اور اس کے بچے سب ہی ایک نادیدہ دھارے پر بہتے ہوئے گھاس کے تنکے کی مانند دکھائی دیتے ہیں۔ اور ڈرامے کو پڑھنے کے بعد بے ساختہ یہ کہنے کو جی چاہتا ہے بقول میر :

چاہیں ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

مسعود مفتی کی تحریروں میں عورت کی فطرت کے بے شمار رنگ ملتے ہیں۔ جنہیں بہت سے ادیب جانتے ہیں مگر قلم اٹھانے کی جرأت کوئی کوئی کرتا ہے۔ عورت کا ایک روپ مجسم وفا، حیا کی پتلی اور ایثار کا پیکر ہے۔ جبکہ دوسرا رنگ بے وفائی، خود غرضی اور شدید انتقام ہے۔ ڈرامہ گڑھے میں ایک عورت ہی بیک وقت تین مردوں کو بے وقوف بناتی ہے۔ خاوند، جوان بیٹا اور کزن فضل ماشکی۔ اور اس عورت کی ہوشیاری کہ مظلوم بھی بنی ہوئی ہے۔ پانی کا گھڑا توڑ دیتی ہے کہ ماشکی پانی بھرنے کے لیے ایک پھیرا اور اس کے گھر کا لگالے گا۔ خاوند جب ماشکی کو ڈانٹتا ہے کہ'' تو یہاں کیا کر رہا ہے؟'' تو بیٹے کی زبان سے یہ بھی کہلوا دیتی ہے۔'' بابا تم نے ویسے ہی ڈانٹ دیا بے چارے کو، وہ تو میرا حال پوچھنے رک گیا تھا۔'' اس کہانی کے مرکزی کردار ماں، باپ، بیٹا عبدالرحمٰن اور فضل ماشکی ہیں۔ بیٹے کو باپ سے بدظن کرنے کے لیے اپنے خاوند پر تہمت لگاتی ہے کہ وہ دوسری شادی کرنے لگا ہے۔ جب خاوند بیوی کے کردار کی وجہ سے اس کو طلاق کا نوٹس بھجواتا ہے تو بیٹا سمجھتا ہے کہ ماں مظلوم ہے۔ باپ جب بھری پنچائیت میں بیوی کی بدکرداری کو طلاق کا جواز بناتا ہے تو بیٹا طیش میں آ کر باپ کو قتل کر دیتا ہے۔ یوں اپنے تئیں اس نے ماں کے پاکیزہ کردار پر لگی تہمت کو دھویا ہے۔ وہ اقدام قتل پر سزائے موت پاتا ہے۔ لیکن تقدیر اپنی تدبیر کے مطابق عین پھانسی سے چند دن پہلے ایک اور چال چلتی ہے۔ شدید زلزلہ آتا ہے جس میں جیل کی کوٹھڑیاں گر جاتی ہیں۔ بہت سارے قیدی مر جاتے ہیں۔ عبدالرحمٰن کو بھی مردہ سمجھ لیا جاتا ہے۔ کسی طرح سے وہ وہاں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ کئی برس چھپے رہنے کے بعد گاؤں جاتے ہوئے وہ قبرستان سے گزرتا ہے تو پہلے باپ کی قبر آتی ہے۔ وہ نفرت اور حقارت سے قبر کو دیکھتا ہے۔ اور یہ کہتے ہوئے گزر جاتا ہے کہ:-

"بابا میں نے لوگوں کی قبروں پر کئی دفعہ فاتحہ پڑھی ہے۔۔غیروں کی۔۔اور
اجنبیوں کی بھی۔۔مگر آج آپ کی قبر پر فاتحہ نہیں پڑھوں گا۔۔تم نے محض ہوس
میں سارا گھر تباہ کر ڈالا۔۔ مجھے پھانسی کے تختے تک پہنچایا۔۔۔اماں کو بھرے
گاؤں میں رسوا کیا۔۔تم مر گئے۔۔لیکن ایسی نفرت میرے دل میں چھوڑ گئے
کہ۔۔اگر تم اب پھر جی اٹھو تو میں پھر تمہیں قتل کر دوں گا۔۔ میں تمہاری فاتحہ
کیسے پڑھوں۔۔میں فاتحہ نہیں پڑھوں گا۔۔نہیں پڑھوں گا۔"

اتنے میں وہ ایک آواز سنتا ہے۔فضل ماشکی دور قبرستان کی دیوار اور ایک اونچی پکی قبر کے درمیان سے سر اٹھاتا ہے۔دائیں بائیں جائزہ لے کر یہ کہتے ہوئے اٹھتا ہے"تو ابھی ادھر ہی رہ۔۔ میں چلا جاؤں تو تھوڑی دیر کے بعد اٹھنا۔۔خواہ مخواہ کوئی دیکھ لے گا۔" تھوڑی دیر کے بعد ایک سر ابھرتا ہے۔ادھر ادھر کا جائزہ لینے کے بعد ایک عورت اٹھتی ہے اور عبدالرحمٰن پکار اٹھتا ہے"ماں۔" عبدالرحمٰن نے جب ماں سے شکوہ کیا کہ اس نے ایک باپ کو بیٹے سے مروا دیا صرف اپنا جرم چھپانے کے لیے۔اتنا بڑا جھوٹ بولا ماں نے جواب میں اسے جو کہا وہ بھی عورت کی فطرت کا ہی ایک رنگ ہے۔

"یہ تمہارے باپ کا تحفہ ہے بیٹے۔۔جس عورت پر سر بازار کوئی تہمت لگائی جائے اور وہ بھی خاوند کی طرف سے۔۔پھر اس کا کوئی سہارا نہ رہے۔۔نہ خاوند نہ بیٹا۔۔نہ لوگ۔۔تو وہ اسی تہمت کا سہارا لے سکتی ہے۔۔میں نے تو کبھی فضلے کا سوچا بھی نہ تھا۔۔مگر میں اکیلی تھی۔۔لوگوں نے فضلے کا نام اٹھتے بیٹھتے میرے منہ پر مارا۔اور کئی ایک تو فضلے کا روپ دھار کر مجھے تنگ کرنے لگے۔۔تو میں نے مجبوراً اس کی پناہ لی۔اور تہمت کو اپنا مقدر سمجھ کر قبول کر لیا۔"

عبدالرحمٰن اس ذہنی صدمے کے لیے تیار نہ تھا۔اس کے سارے خواب ٹوٹ کر بکھر گئے۔اس کی روح اندر سے چیخ اٹھی۔"بابا! کون سچا ہے اور کون جھوٹا ہے؟۔" وہ خواب کی سی حالت میں چلتا ہوا تھانے میں جا کر اقبال جرم کرتا ہے کہ "میں نے قتل کیا ہے مجھے پھانسی کی سزا ہوئی تھی۔"!

"بگلون" کا چوتھا ڈرامہ پہلے تین ڈراموں کے ساتھ نہیں لکھا گیا بلکہ قریباً دس برس کے بعد لکھا گیا ہے۔1979 میں ٹیلی ویژن کی طرف سے دوبارہ مسلسل اصرار ہوا کہ مسعود مفتی "گھروندے" سیریز کے لیے کچھ لکھیں۔انہوں نے اپنے گزشتہ ناخوشگوار تجربے کی بناء پر انکار کیا۔ 1980 میں حالات سے متاثر ہو کر ایک افسانہ لکھنا شروع کیا۔تاہم موضوع کے تقاضوں کے پیش نظر اسے ڈرامے کی شکل دے دی۔اور "روپے" لکھ کر ٹیلی ویژن کو بھجوا دیا۔ٹی وی والوں نے ترامیم کے بعد اس کی پیشکش چاہی مگر انہوں نے ڈرامہ واپس منگوا لیا۔

"روپے" کی کہانی بھی اسی معاشرے کی کہانی ہے۔لیکن چونکہ پہلے ڈراموں میں اور اس ڈرامے

میں قریباً دس (10) برس کا طویل عرصہ ہے، اس لیے نمایاں فرق نظر آتا ہے۔ پہلے ڈراموں میں جہاں بدی طاقتور اور منہ زور تھی وہاں پر نیکی بھی حد درجہ مضبوط تھی۔ یعنی خیر اور شر کے دونوں پہلو نمایاں تھے۔ معاشرتی رویوں کا ادراک ان کے ہاں بھرپور ہے۔ معاشرے میں مادی اقدار کچھ اس طرح تبدیل ہوئیں کہ روحانی اور اخلاقی قدریں ان کے سامنے ہیچ نظر آنے لگیں اور ایسا فرد جو اخلاقی اقدار کا پاسدار نظر آئے وہ دوسرے لوگوں کی نظروں میں ایک ناکارہ اور فرسودہ پرزے کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ مادی آسائشوں کی دوڑ نے رشتوں کا تقدس مجروح کر دیا۔ جس کی وجہ سے وہ شوہر جو کبھی بیوی کی عزت کا رکھوالا سمجھا جاتا تھا وہی اس کو مجبور کرنے لگا کہ وہ اس کے آوارہ مزاج دوستوں کی تفریح طبع کا سامان کرے اور اس طرح زندگی کی دوڑ میں خاوند کی مدد کرے۔

''رویے'' ایک نو بیاہتا جوڑے کریم اور عائشہ کی کہانی ہے۔ دونوں نئی زندگی کا آغاز سہانے خوابوں سے کرتے ہیں لیکن دونوں کے خواب الگ الگ ہیں۔ عائشہ ایک پرسکون اور مثالی گھر کی خواہش مند ہے۔ اولاد کی صورت میں وہ اپنی ذات کی تکمیل چاہتی ہے۔ دوسری طرف کریم ہے جو ہے تو ایک نہایت بااصول اور باکردار ''ابا جان'' کا بیٹا، لیکن نہ معلوم اس کی تربیت میں کوئی کمی تھی یا پھر عملی زندگی کے تجربات سے وہ اس قدر دلبرداشتہ تھا کہ اب اس کے ارمان اور خواب باقاعدہ ایک پلاننگ کے تابع تھے۔ اس پلاننگ میں ابھی مزید پانچ سال تک بچوں کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس کا مستقبل قریب کا خواب مرسڈیز تھی۔ اور مستقبل قریب سے کچھ دیر بعد کا خواب ایک پرآسائش 'ولا' تھا۔ جس میں ہر وہ مادی آسائش ہو جس کا کوئی فرد تصور کر سکتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے ہر انسان اگر عقل اور پلاننگ سے کامیاب زندگی گزار سکتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ '' کیریئر بنانے میں گھر کا بھی حصہ ہونا چاہیے۔ بیوی کو اس سے ہر قسم کا تعاون کرنا چاہیے۔'' جبکہ بیوی کہتی ہے کہ '' کیریئر کو دفتر تک محدود رکھنا چاہیے اور گھر صرف اور صرف گھر ہو۔ اور یہ گھر ایک چھوٹی سی جنت ہو۔'' درمیان میں کبھی کبھار ابا جان آتے ہیں جو نیکی کی علامت (SYMBOL) ہیں اور بیٹے کو فہمائش کے انداز میں سمجھاتے ہیں۔

حالات آہستہ آہستہ ایسے موڑ پر پہنچتے ہیں کہ عائشہ کو سوچنا پڑتا ہے کہ اس کو یا تو اپنی شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ کر خاوند کا ساتھ دینے کے لیے اس کی ہر جائز و ناجائز بات کو مان لینا چاہیے۔ جس میں اپنے خاوند کے اوباش دوست جمشید کی فرمائشیں بھی شامل ہیں یا پھر شادی کو ختم کر دینا چاہیے۔ دو کردار اور بھی ہیں۔ فوزیہ جو کریم کے تصوراتی معیار پر بالکل پورا اترتی ہے۔ شوخ و چنچل ہے اور مردوں سے گفتگو کا سلیقہ، ان کے دلوں کو لبھانے کا گر جانتی ہے۔ دوسرا کردار شکیل ہے جو انتہائی شریف اور ایماندار ہے۔ جس کو فوزیہ تو چاہتی ہے لیکن خود اس کا آئیڈیل بالکل دوسری قسم کی لڑکی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ:-

''آدمی جب گھر میں داخل ہو تو یوں لگے جیسے کسی نے سردی سے ٹھٹھرے ہوئے

ہاتھ کو آہستہ سے نیم گرم پانی میں ڈال دیا ہے۔ وہاں ہونٹوں پر مسکراہٹیں
ہوں۔ اگر وہ نہیں تو نظروں میں اطمینان ہو۔ مجھے سائز میں حویلی نہیں
چاہیے۔ مجھے کمروں میں قیمتی سامان نہیں چاہیے۔ میں اپنے گھر کو زیبائش شو
کیس نہیں بنانا چاہتا۔ مجھے تو فضا میں ٹھہراؤ چاہیے۔"

ڈرامے کے کلائمکس پر کریم عائشہ کو طلاق دے کر فوزیہ سے شادی کر لیتا ہے۔ اور عائشہ سے شکیل شادی کر لیتا ہے۔ یعنی جس کو جس کی طلب تھی اس کو وہ مل جاتا ہے۔ "رویے" میں بدلتی ہوئی معاشرتی قدروں کا عکس نظر آتا ہے۔ ابا جان اپنے بیٹے کریم کو یوں کہتے ہیں:-

"معاشرہ کبھی شہد کی طرح صاف اور میٹھا نہیں ہوتا۔ ہمارے وقت میں بھی بدی
چمکدار تھی۔ لیکن آپ کے پاس اصولوں کی ڈھال ہو تو بدی اثر نہیں کرتی۔
قناعت ہو تو ترغیب کند ہو جاتی ہے۔ دیانت ہو تو گلی میں پھیلی ہوئی بے ایمانی
کی بو آپ کو تنگ نہیں کرتی۔ اگر اچھائی کی خواہش ہو تو لوگ اپنے اندر تلاش
کرتے ہیں۔ اگر برائی کا ارادہ ہو تو معاشرے کا بہانہ تلاش کرتے ہیں۔"

مسعود مفتی کے ہاں گہری معاشرتی بصیرت ہے۔ وہ اپنے کرداروں سے بخوبی واقف ہیں۔ ان کے تمام ڈرامے بقول ان کے "اس حد تک حقیقت پر مبنی ہیں کہ واقعات، شہروں کے نام اور تاریخوں کے حوالے بھی کم و بیش وہی تھے جو اصل زندگی میں پیش آئے تھے۔ اور ہمارے معاشرے کی سٹیج پر کھیلے جا چکے تھے۔"

چند برس بعد 1974 میں جب مسعود مفتی P.O.W کی حیثیت سے ہندوستان کی قید سے واپس آئے تو ٹیلی ویژن والوں نے ان سے رابطہ کیا اور فرمائش کی کہ مشرقی پاکستان کے متعلق کچھ لکھ کر دیں۔ انہوں نے ایک ڈرامہ "دسمبر 1971" لکھ کر بھجوایا۔ لیکن اس میں بھی ایک ایسی ترمیم کی تجویز آئی کہ کہانی تو 1971 کی ہو مگر 1971 کے واقعات کا ذکر نہ ہو۔ چنانچہ یہ ڈرامہ بھی واپس لے لیا گیا اور مشرقی پاکستان کے متعلق ٹیلی ویژن پر کبھی کچھ لکھنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ ان کا کہنا ہے:-

"1971 کے بھیانک سانحے کے بعد مشرقی پاکستان کے متعلق صرف رومانی
تحریریں لکھنا میرے نزدیک ایک گناہِ کبیرہ تھا۔"

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف حقیقت نگاری کے قائل ہیں بلکہ قوم اور ملک سے ان کی لازوال محبت بھی اس ایک جملے سے واضح ہے۔ سانحہ 1971 کے بعد دکھ اور کرب کو جس طرح انہوں نے محسوس کیا اور جس طرح اس المیے کو انہوں نے بڑے خلوص و ہمدردی کے ساتھ اپنے ادبی شہ پاروں میں سمویا وہ کسی صاحبِ دل کے قلم سے ہی ممکن تھا۔ ڈرامہ "دسمبر 1971" بعد میں ان کے افسانوی

مجموعے "ریزے" میں شائع ہوا۔ ٹیلی ویژن پر ان ڈراموں کے ٹیلی کاسٹ نہ ہونے کی وجہ ٹیلی ویژن کی مجبوری تھی کہ وہ سرکاری پالیسی اور عوام کی پسند، ناپسند کے ساتھ چلنا چاہتے تھے۔ دوسری طرف ان کی مجبوری یہ تھی کہ ادبی اور فنی معیار انہیں قطع و برید کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ ان کا یہ بھی اصرار تھا کہ جس تحریر پر ان کا نام ہے وہ صرف ان ہی کے قلم کی خوبیوں اور خامیوں کا مرقع ہو۔ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ بے بس تھے اور اپنی حدود کی وجہ سے ایک دوسرے سے شکایت بھی نہیں کر سکتے تھے۔ وہ ٹیلی ویژن ڈرامہ کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:۔

> "ڈرامہ ایک بھرپور صنف ادب ہے جو پاکستان کے لیے نسبتاً نئی ہے اور اگر ٹیلی ویژن کی پالیسی اس صنف کی طرف یہ ہے کہ صرف سطحی اور ہلکی پھلکی چیزیں ہی پیش کرتا رہے تو ہمارے ملک میں یہ صنف ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکے گی۔ ایسی حالت میں ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ اس صنف کی نشوونما کی طرف اتنی ہی سنجیدگی سے توجہ دیں جتنی وہ افسانے، ناول، غزل یا نظم کی طرف دیتے ہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ ادیب اپنے ادبی اور فنی معیار کو برقرار رکھ کر اس صنف میں بھی اعلیٰ ادب پیدا کر سکیں گے"

3-مسعود مفتی بحیثیت نگاول نگار

مسعود مفتی کا ناول نگاری میں سرمایہ بہت تھوڑا ہے اس سلسلے میں نے اپنے ایک انٹرویو میں جو اکادمی ادبیات نے شائع کیا، بیان کرتے ہیں کہ:

> "ناول لکھنے کے لیے جتنا وقت درکار ہوتا ہے اتنی بھی فرصت نہیں ملی۔"

ان کا اب تک صرف ایک ہی ناول شائع ہوا ہے۔ جس کا نام "کھلونے" ہے۔ یہ ناول بیمار معاشرے میں رزم خیر و شر کا عکاس ہے۔ ٹیلی ویژن سیریل 'جنون' اسی ناول کی ڈرامائی شکل ہے۔ بنیادی خیال نیکی اور بدی کا ٹکراؤ ہے۔ اس کے بنیادی کردار ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ عبدالرحمان معصوم اور بے ضرر انسان ہے، جو اپنی جائز خواہش کو پورا کرنے کے لیے ایک گناہ کا ارتکاب کرتا ہے جس کے بعد اس کے لیے سزا کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ دوسرا کردار عاقل، ایک شاطر اور چالاک انسان ہے جو سرتاپا بدی میں ڈوبا ہوا ہے، گناہ پر گناہ کیے جا رہا ہے اور اطمینان اور آسائش و آرام سے بھرپور زندگی گزار رہا ہے۔ 'عاقل' کی برائیاں معاشرے کی نظروں سے اوجھل ہیں۔ پورے ناول میں یہی دو کردار آپس میں ٹکراتے ہوئے بیان کیے گئے ہیں۔ وہ ان اسباب و عوامل کا کھوج لگانے کی بھی کوشش کرتے

ہیں جن کی وجہ سے ایک عام سیدھا سادا انسان بدی کی طرف راغب ہو کر جرائم کا ارتکاب کرتا ہے۔
سیدھا سادا عبدالرحمٰن جس کی نظر میں تقدیر کا تصور یہ تھا کہ انسان کو سزا صرف اپنے کرتوتوں کی ملتی ہے۔
اس کا کہنا تھا کہ :-

''ہماری ساری مصیبتیں ہمارے اعمال کا نتیجہ ہیں۔ نہ کیچڑ میں پتھر پھینکو نہ چھینٹیں تم پر پڑیں۔ اپنی مصیبتیں ہم خود لاتے ہیں کوئی دوسرا ذمہ دار نہیں۔''

لیکن تقدیر اس لیے اُس پر ہنس رہی تھی۔ اس کے ہنستے کھیلتے، پھول جیسے معصوم اکلوتے بیٹے کو اچانک ایک پھوڑا نکل آیا۔ جو بڑھتے بڑھتے ایک ناسور (Cancer) کی شکل اختیار کر گیا۔ علاج کے لیے اس کے پاس وسائل تھے نہ رقم، قدرت شاید اس کمزور انسان سے وہ امتحان لینے چلی تھی جس کے لیے وہ تیار تھا نہ اس کا اہل۔ کل جمع پونجی علاج پر اٹھتی گئی۔ پھوڑا تھا کہ بڑے سے بڑے ڈاکٹر کا طلبگار تھا۔ جب بیچنے کو گھر میں کچھ نہ رہا تو بیوی کے تمام زیور بھی ایک ایک کر کے بکنے لگے۔ ایک سونے کے کنگن کو کسی جذباتی لمحے میں خاوند نے 'مشکل کشا' کا نام دیا تھا۔ جب بیوی نے وہ کنگن بھی اتار کر خاوند کو دیا تو اُس کے لیے یہ بڑا کٹھن لمحہ تھا۔ اس کا ایمان کمزور پڑ گیا اور اس نے وہ کام کر دیا جس سے اب تک بچتا آیا تھا۔ عاقل کے کہنے پر اس نے صرف ایک فائل کو اِدھر سے اُدھر کیا اور اُس کے ہاتھ اچھی خاصی رقم آ گئی۔ کنگن تو بچ گیا، لیکن جس کو بچانے کی خاطر اتنی تگ و دو کی وہ نہ بچ سکا۔ بچے کی موت نے باپ کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ اس کے اندر کا نیک انسان، جو ذرا سی دیر کو دب گیا تھا، پھر سے بیدار ہو گیا۔ اُس نے بچے کی موت کو اپنے لیے سزا سمجھا۔ رشوت کے پیسے عاقل کو واپس کر دیے مگر عاقل جو اس بساط کا ایک شاطر کھلاڑی تھا، اُس کو یہ بات بُری لگی۔ انتقام کے لیے یا اپنی کھال بچانے کی خاطر اس نے عبدالرحمٰن کو ایک جھوٹے مقدمے میں پھنسا کر قید کرا دیا۔ عبدالرحمٰن قید میں جب دوسرے جرائم پیشہ افراد کے ساتھ رہتا ہے تو اُسے شیکسپیئر کا یہ فقرہ بار بار یاد آیا کہ :-

''جس طرح شریر بچے کیڑوں کو مار کر کھیلتے ہیں اسی طرح دیوتا انسان سے کھیلنے میں مزہ لیتے ہیں۔''

اور کبھی وہ یہ سوچتا کہ :-

''ہم واقعی خدا کے کھلونے ہیں۔ یہ دنیا بالکل کھلونوں کی دکان کی مانند ہے۔ جس میں بعض کھلونوں کو خوبصورت رنگ دے کر چمکدار کپڑے پہنا کر اونچی جگہ پر سجا دیا گیا ہے۔ اور دوسروں کے نہ تو رنگ نکھرے ہیں نہ چہروں پر چمک ہے۔ بعض کا کام صرف قلابازیاں کھانا ہے۔ بعض کی قوت صرف اتنی ہے کہ ہاتھ

ہلا سکیں یا ٹانگیں چلا سکیں۔ دکاندار جب چاہتا ہے ایک کھلونے کو ہٹا کر دوسرا رکھ
دیتا ہے ہم سے حالات بھی کھیلتے ہیں اور کبھی معاشرے کی اقدار بھی کھیلتی ہیں
کبھی مذہب کھیلتا ہے اور کبھی خود ہماری فطرت اور طبعیت ہم سے کھیلتی ہے۔
حالات ہمیں چابی دے کر کسی طرف رُخ کر کے چھوڑ دیتے ہیں۔"

وہ ایک حقیقت پسند ادیب ہیں ان کے افسانوں میں انسان کو زندائی تقدیر کہا گیا ہے۔ اس کا ہر فعل، ہر عمل مقدر کے تابع ہے۔ اس کے اعمال اس کے تابع نہیں ہوتے بلکہ تقدیر کے تابع ہوتے ہیں۔ افسانوی ادب میں حقیقت نگاری ان کا بیش بہا اضافہ ہے۔ ان کے قلم سے نکلا ہوا ہر جملہ یوں لگتا ہے بقول غالب

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

پروفیسر نظیر صدیقی نے اپنی کتاب Reflections on Life and literature میں اس ناول کے بارے میں یوں تبصرہ کیا:۔

'A short noval Khiloney written by the essayist and short story writer Masood Mufti, deals with quite a big metaphysical problem. Why evil or oppression is inflicted on the innocent people of the world?'

مدحت سیدہ نے "The Star" میں اپنے کالم ٹی وی ٹاک میں اس ناول کے بارے میں یوں لکھا:۔

'Junoon was set in a lower middle class background and had a powerful storyline. The script highlighted the harsh realities of contemporary life, where an honest man is victimised by the unscrupulous who unfortunately outnumber the righteous in our society."

اسی طرح روزنامہ نیشن میں 'Friday Review' میں 7 اکتوبر 1994 کو ٹیلی ویژن کی نئی سہ ماہی کے عنوان سے اس کے بارے میں یوں تبصرہ کیا گیا۔

"In the regular transmission, Junoon is progressing well and the assiduous struggle between good and bad and vice and virtue has been portrayed very well. Junoon has an involving tempo and nowhere divorces the unfolding of quick succession of events. The perpetual and unceasing struggle between honesty and corruption has been very well portrayed."

4-مسعود مفتی بحیثیت رپورتاژ نگار

مسعود مفتی نے اب تک دو (2) رپورتاژ "چہرے" اور "ہم نفس" کے نام سے لکھے ہیں۔ دونوں مشرقی پاکستان کا المیہ وقوع پذیر ہونے کے بعد لکھے گئے ہیں۔ جن پر ان کو ادبی انعام مل چکے ہیں۔ رپورتاژ کے بارے میں، ڈاکٹر اسد فیض کے سوالوں کے جواب میں وہ فرماتے ہیں:-

"افسانے کے بعد میری پسندیدہ صنف رپورتاژ رہی ہے۔ جس میں قومی مسائل پر افسانے کی نسبت زیادہ آزادی سے نقطہ نظر کا اظہار ہو سکتا ہے۔ مگر تکنیک کا ڈسپلن کم و بیش افسانے جیسا ہی ہوتا ہے یعنی کردار نگاری اور پلاٹ سازی (واقعات کا چناؤ، ترتیب اور تجزیہ) کے ادبی تقاضے پورے کیے بغیر قاری کی دلچسپی برقرار نہیں رہ سکتی۔"

مشرقی پاکستان میں تعیناتی کے دوران انہیں ایک کرب ناک تاریخی مشاہدے کا موقع ملا۔ یہ وہ وقت تھا جب دنیا کا سب سے بڑا اسلامی ملک، دولخت ہو رہا تھا۔ المیہ یہ ہے کہ تحریک پاکستان میں مشرقی پاکستان کا نہایت فعال کردار تھا، مسلم لیگ کا آغاز ڈھاکہ سے ہوا، قرارداد پاکستان پیش کرنے کا اعزاز بھی جس قومی رہنما کے حصے میں آیا وہ بھی اسی خطے سے تعلق رکھتے تھے، پھر ایسا کیا ہوا کہ صرف 24 برسوں میں ہی وہ اپنی جد و جہد اور تمام قربانیوں کو بھول کر اپنی دنیا الگ بسانے چل پڑے تھے۔ کیا قرارداد پاکستان کو پیش کرتے ہوئے مولوی فضل الحق کے وہم و گمان میں بھی ہوگا کہ ایک دن خود بنگال پاکستان سے علیحدہ ہونے کی جد و جہد کرے گا اور اسے بغاوت نہیں بلکہ اپنی جنگ آزادی سمجھے گا؟۔

اس قرارداد کی تائید کرنے والے عظیم رہنما چوہدری خلیق الزمان کا تعلق بھی سابقہ مشرقی پاکستان سے بہت گہرا رہا۔

مشرقی پاکستان میں ان کا تبادلہ تو 1971 میں سیکرٹری برائے گورنر مشرقی پاکستان ہوا۔ مگر وہاں گئے تو ان کو سیکرٹری تعلیم کے عہدے پر فائز کر دیا گیا۔ یوں ان کو وہاں کے حالات و واقعات کو بہت قریب سے دیکھنے اور پرکھنے اور وہاں کے لوگوں سے ملنے اور ان کی بات کو سمجھنے کا موقع ملا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ کوئی نادیدہ ہاتھ پہلے سے بنائے گئے منصوبے کے تحت حالات کو ایک خاص سمت لیے جا رہا ہے۔ اور حالات کو سدھارنے کی کوئی تدبیر اس وقت تک کارگر نہیں ہو سکتی جب تک اس نادیدہ ہاتھ کو نہ روک دیا جائے۔

چہرے

سقوط ڈھاکہ کے وقت ریڈ کراس کی تنظیم نے تمام سول سرکاری ملازمین اور دوسرے ممالک کے سفارت کاروں کو چند دن تک پرل کانٹی نینٹل ہوٹل ڈھاکہ میں رکھا۔ یہ تھے تو چند روز۔ لیکن صدیوں کے واقعات ان چند دنوں میں وقوع پذیر ہو گئے۔ ''چہرے'' اس قیام کے دوران ڈائری کی شکل میں رقم کیے گئے سچے واقعات پر مشتمل رپورتاژ ہے۔ جو سقوط ڈھاکہ کے بعد کے اور مشرقی پاکستان کے آخری لمحوں کی داستان عبرت ہے۔ یہ کل پانچ دنوں یعنی 14 دسمبر 1971 سے 19 دسمبر 1971 تک کے دنوں کی داستان ہے۔ 19 دسمبر وہ روز سیاہ تھا جب مسعود مفتی اور دوسرے فوجی اور سول ملازمین کو بطور جنگی قیدی ہندوستانی افواج کی ''حفاظت'' میں دے دیا گیا۔ انہی دنوں کی یہ روداد مصنف کے لامحدود ذہنی کرب کی داستان ہے۔

پرل کانٹی نینٹل ڈھاکہ میں قیام کے دوران مسعود مفتی کو بہت سے جانے انجانے ''چہرے'' پڑھنے کا موقع ملا۔ ''چہرے'' اس قدر پر اثر رپورتاژ ہے کہ جب شروع کر لیا جائے تو ختم کیے بغیر چھوڑا نہیں جا سکتا۔ انہوں نے گہرے طنز کے ذریعے مسلمانوں کو ماضی کی غلطیوں کا احساس بھی دلایا ہے:-

> ''مملکتِ خداداد کو بنا کر خدا کو دھوکا دینے میں تو ہم بنی اسرائیل کو بھی مات کر گئے اور ایک ایسے معاشرے کو جنم دیا جس میں ایک دیانت دار آدمی کے لیے ذہنی اذیت اور ذاتی تکلیف کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔''

یہ الفاظ ان کی اس ذہنی کیفیت کی عکاسی کرتے ہیں جن سے وہ ان دنوں دوچار تھے پاکستان ٹوٹ رہا تھا۔ یہ دکھ تو ایک عام آدمی کے لیے بھی ناقابل برداشت تھا۔ کجا ایک ادیب جو حساس دل کا مالک اور دیدہ بینائے قوم ہو۔ وہ ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے اور ان کا رابطہ عوام و خواص سے براہ راست تھا۔ وہ

وہاں کے باشندوں کے دکھ درد کو بھی بخوبی محسوس کر سکتے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ ایک عام بنگالی بھی پاکستان سے اتنی ہی محبت کرتا ہے جتنی مغربی پاکستان کا کوئی شہری کرتا ہے۔ انہیں اس بات کا بہت صدمہ تھا کہ اب دونوں بازو یوں الگ ہو رہے ہیں کہ شاید پھر کبھی نہ مل پائیں۔ ایک بھائی دوسرے سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسعود مفتی جب اپنے ہوٹل کے کمرے سے باہر دیکھتے ہیں اور ان کو شہر کی بتیاں جگمگاتی کرتی نظر آتی ہیں تو وہ بے ساختہ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں:-

''جتنی باہر چمک ہے اندر کا اندھیرا اتنا ہی سیاہ ہے۔ لوگوں کی آنکھیں قمقموں کے اجالوں سے چندھیا رہی ہیں اور ہماری آنکھیں اس اجالے کے داغوں میں پھنس کر رہ گئی ہیں۔ اک تکلیف دہ احساس ہمیں مسلسل کچل رہا ہے کہ یہ روشنی اب ہماری نہیں رہی۔ ہم اب اس کے پروانے نہیں بن سکتے۔۔۔ یہ الگ چمکے گی۔۔۔ ہم الگ تڑپیں گے۔''

اور یہ کہ!

''سوز کے رشتے ختم ہوئے۔۔۔ وفا کے پیمان ٹوٹ گئے۔۔۔ اس کی محفل سونی ہوئی۔۔۔ ہماری دھڑکن سرد ہوئی۔''

پرل کانٹی نینٹل ڈھاکہ میں کئی طرح کے تجربات سے گزرنے کے بعد، جس میں ہر لمحہ انہوں نے موت کو اپنے بہت قریب پایا، وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ:-

''موت کا اصل روپ اس کا عکس نہیں بلکہ اس کی آگہی ہے۔ موت کا اصل روپ وہ زندہ انسان ہے جو قضا کی پرچھائیں کو اپنی طرف بڑھتا ہوا دیکھتا ہے۔ بیمار یا ضعیف بوڑھا نہیں بلکہ تندرست و توانا انسان جو بے وقت اور غیر قدرتی موت سے دوچار ہے۔ موت کا اصل روپ نظر آتا ہے، پیلے چہروں، پھٹی پھٹی آنکھوں میں۔ لرزتے ہاتھوں میں خشک ہونٹوں میں اور ناہموار سانسوں میں۔ میرے اردگرد اتنے چہروں میں یہ روپ نظر آ رہا ہے کہ اس کا مجموعی نظارہ کچلے ہوئے کیڑے، تڑپتے ہوئے پرندے یا جاں کنی میں سسکتے ہوئے انسان سے کہیں زیادہ مصیبت ناک ہے۔''

اور یہ کہ!

''یوں لگتا ہے کہ سب کچھ ہی ختم ہو گیا ہے۔ نہ جہان ہے نہ جان۔ نہ آس رہی نہ احساس۔ پاکستانی جھنڈے کے چاند تارے کیا ڈوبے کہ کائنات کے مہ وانجم

ہی ڈوب گئے۔"

یا پھر یہ احساس کہ :-

"یہ ایک دلکش چہرہ ہے۔۔۔ چاند کی طرح۔۔۔ مگر یہ ہندی گہن بن کر اس کی دلکشی کو کھا گئی اور اب یہ چہرہ تہذیب کا کھنڈر بن کر مجھے ڈرا رہا ہے۔۔۔ تواریخ کی لہروں میں سیاسی چولا بدلنا تو سمجھ میں آتا ہے مگر اپنی روح کو بدل ڈالنا میری سمجھ سے باہر ہے۔۔۔ یہ تو ایک تہذیب کے ہاتھ پر دوسری تہذیب کے ماتھا ٹیکنے کا نشان ہے۔ جب جھنڈا جلا تو ملک کے ایک حصے نے ہتھیار ڈالے مگر جب مسلمان ماتھے پر خوشامد سے بندی چمکی تو پورا کلچر ہار مان گیا۔ کلچر کے اوراق تو صدیوں بعد الٹتے ہیں اور یہاں تین گھنٹوں میں ہی کایا پلٹ گئی۔"

مشرقی پاکستان کی جنگ عوام نے یا افواج کے عام سپاہیوں نے نہیں ہاری۔ عوام مغربی پاکستان کے تھے یا سابقہ مشرقی پاکستان کے، دونوں ہی ملک سے محبت کرتے تھے اور اسلام سے بھی۔ آخر ان ہی کی قربانیوں کا ثمر تھی یہ جائے پناہ، لیکن.........

فنون شمارہ 25، نومبر دسمبر 1986 میں جناب خالد اقبال یاسر اپنے کالم "پاکستانیت اور اردو کا نثری ادب" میں "چہرے" کے بارے میں فرماتے ہیں :-

"مسعود مفتی نے چہرے کے نام سے سقوط ڈھاکہ کے ان فیصلہ کن اور پُر آشوب دنوں کی رپورتاژ لکھی جب مغربی پاکستانیوں کا ایک مختصر گروہ ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل ڈھاکہ میں پناہ لیے ہوئے تھا۔ چہرے میں کرداروں کے کوئی نام نہیں۔ انہیں مسعود مفتی نے اس المیے کی عکاسی کے لیے حزن و ملال، مکر و فریب اور مصلحت اندیشی کی علامتوں کے طور پر استعمال کیا ہے۔"

انتظار حسین نے روزنامہ ڈان 6 ستمبر 1996 کی اشاعت میں اپنے کالم 'Point of view' میں یوں اظہار کیا ہے :-

"..but later, he decided that events should be recorded as witnessed. So he wrote a reportage which was published under the title of 'chehray'. His account appears to be a faithful record of these fateful days characterised by genuine patriotic feelings. It

is portray of an atmosphere charged with grimness where events auguring ill occurred in quick succession. Masud Mufti appears to be anobservant witness recording every tremor and even the implications where in it."

ان کا دوسرا رپورتاژ "ہم نفس" بھی سقوط ڈھاکہ سے متعلق ہے۔ اس کا کردار "بھولا" ایک سیدھا سادا بنگالی جوان ہے۔ جس کو پاکستان سے بہت محبت ہے۔ اس کے دل کی دھڑکنوں میں بھی پاکستان ہی بسا ہے لیکن مشرقی پاکستان کو یوں دم توڑتے ہوئے دیکھنا اس کی بھی مجبوری ہے۔ کیونکہ وہ بھی کچھ نہیں کرسکتا۔ لیکن کبھی کبھی لب تک شکایت ضرور لاتا ہے۔ اس کو یقین ہے کہ یہ ساری المناک داستان باقاعدہ کسی منصوبہ بندی کے تحت وقوع پذیر ہوئی۔ اور جس طرح افراد خودکشی کرتے ہیں اسی طرح قومیں بھی خودکشی کرتی ہیں۔ فرد کا طریقہ اپنے گلے میں خود پھندہ ڈالنا ہے جبکہ قوم اپنے انحطاط کو خود گلے لگاتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ فرد یہ قدم اعلانیہ اٹھاتا ہے مگر قوم اپنے انحطاط کو تسلیم ہی نہیں کرتی بلکہ اسے بلند بانگ دعوؤں سے ڈھانپتی رہتی ہے۔ یعنی فرد خود سے مخلص ہوتا ہے مگر قوم خود فریبی میں مبتلا ہوتی ہے۔ اس رپورتاژ کے کچھ کردار سابق مشرقی پاکستان کے مسلمانوں کی اس غالب اکثریت میں سے ہیں جنہوں نے 1970 میں شیخ مجیب الرحمٰن کو ووٹ نہیں دیے تھے اور پاکستان کے ساتھ رہنا چاہتے تھے۔ کچھ کردار اس مسلمان اقلیت میں سے ہیں جو عوامی لیگ کی ووٹر تھی مگر رجسٹرڈ ووٹروں کا صرف 27 فیصد تھی اور پاکستان سے علیحدگی چاہتی تھی۔ مسعود مفتی کا کمال یہ ہے کہ وہ قاری کو ان حالات وواقعات کی سنگینی اور المناکی کا احساس تو دلاتے ہیں لیکن ان کا قلم ان حقیقتوں کو بے نقاب کرتے وقت ادب کے تمام تقاضوں کو بھی ملحوظ رکھتا ہے۔

'ہم نفس' میں مصنف نے ایک کردار بھولا متعارف کرایا ہے۔ یہ بھولا کون تھا؟۔ اس بارے میں اشفاق بخاری روزنامہ ڈان مورخہ 18 اکتوبر 1996 کو اپنے کالم 'Book Review' میں یوں فرماتے ہیں:-

"Bhola is nickname of Lutfur Rehman, a Bengali, who was inducted in the same batch of civil

service probationers that the writer was in. He (Masud Mufti) uses this character-a real life character-to view the argument that the majority of East Pakistanis never wished to say good-bye to Pakistan."

پروفیسر نظیر صدیقی روزنامہ دی نیوز میں اپنے کالم میں یوں رقمطراز ہیں:-

"It is obvious that when Masood Mufti entered East Pakistan as CSP officer, East Pakistan too entered Masood Mufti's soul as the loveliest part of his country. He has written this book as an eye witness to the fact that the silent majority of East Pakistan which wished to live with Pakistan was defeated by the clamoring minority of East Pakistan which established Bangladesh."

یہ ایک بدنما حقیقت تھی کہ یہ سرزمین جتنی خوبصورت تھی اس کے لوگ اتنے ہی غیر آسودہ تھے۔ اس علاقے کے مسلمانوں کا استحصال صدیوں سے ہوتا آیا تھا۔ ہندوؤں کے ہاتھوں۔ انگریزوں کے ہاتھوں۔ اس لیے شک کرنا ان کی عادت بن گیا تھا۔ کاش مغربی پاکستان والے اپنے طرزِ عمل سے ان کا شک دور کر کے ان کا اعتماد حاصل کر لیتے۔ ان کو بھی اقتدار میں برابر کا شریک گردانتے تو ان کے دل جیت سکتے تھے۔ بنگالی پیار بھی، اتنی ہی شدت سے کرتے ہیں جتنی شدت سے شک یا نفرت کرتے ہیں۔ دنیائے اسلام میں سب سے زیادہ مساجد ڈھاکہ کے شہر میں ہیں۔ بنگال کو تیرھویں صدی میں ترکوں نے فتح کیا تھا۔ مگر ڈھاکہ شہر 1608 میں مغلوں نے بسایا۔ مغلوں کے زوال کے بعد یہاں کے ہندو بہت طاقتور ہو گئے اور جنگ پلاسی کے بعد انگریز کے دو سو سالہ دورِ حکومت میں ان کا غلبہ بڑھتا رہا۔ انگریزوں نے مسلمانوں کو سیاسی، سماجی، معاشی اور تعلیمی لحاظ سے مفلوج کرنے کی مہم شروع کی اور اس سلسلے میں وارن ہیسٹنگز اور کارنوالس نے جو زمینداری سسٹم نافذ کیا اس میں اکثریت رکھنے والے مسلمانوں کی زمینیں چھین کر اقلیت رکھنے والے ہندوؤں کو دے دی گئیں۔ بعد میں اپنوں نے بھی ان کے زخموں کا مداوا کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان میں باہمی اعتماد بڑھایا جاتا اور مشرقی پاکستان کو بھی برابری کی بنیاد پر حقوق دیے جاتے تو اُن کا شک دور ہو سکتا تھا۔ مگر ایسا نہ ہوا

جس کی وجہ سے سقوط ڈھاکہ ہوا۔ سچ ہے کہ ہم نے اپنی غلطیوں سے نہ کبھی ماضی میں کوئی سبق سیکھا اور نہ ہی حال میں۔

مسعود مفتی جب 23 مئی 1971 کو ڈھاکہ پہنچے تو بقول ان کے اس بار:۔

''ہر چہار جانب اجنبیت اور بیگانگی۔ جیسے گرم سہ پہر میں سونا صحن''

نہ ہی فیض نے یہ سوال پوچھا تھا کہ:

خون کے دھبے دھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد''

فضا میں چہار سُو یہ سوال معلق تھا۔ لیکن یہ دھبے کیسے دھلتے۔ خون تو پانی سے دھلتا ہے، مزید خون سے نہیں دھلتا۔ مسعود مفتی جب اپنی ٹریننگ کے سلسلے میں مشرقی پاکستان گئے تھے تو اس وقت بقول ان کے:۔

''مشرقی پاکستان میں چار ماہ کا یہ عرصہ میرے لئے ایک بھرپور تجربہ تھا۔ زندگی میں پہلی دفعہ ایسے لوگوں میں رہنے کا اتفاق ہو رہا تھا جن کا کلچر تو بنیادی طور پر ہمارے جیسا ہی تھا مگر زبان، رہن سہن اور بعض رویے ہم سے مختلف تھے۔ اس کے باوجود اجنبیت کا احساس نہ تھا بلکہ یگانگت کا رنگ غالب تھا اور نظریں اختلافی پہلوؤں کے بجائے مشترکہ قدروں اور رویوں پر پڑتی تھیں۔ ہر طبقے کے لوگوں کی نظروں میں ہمارے لئے وہ تاثرات تھے جو چھوٹے بھائی کی نظروں میں بڑے بھائی کے لئے ہوتے ہیں۔ مغربی پاکستان کے جن افسروں نے لوگوں کی ترقی کے لئے اچھا کام تھا ان کے نام بہت احترام سے لئے جاتے تھے۔ سرفہرست این ایم خان کا نام تھا جو برہمن باڑیہ سب ڈویژن میں اچھے کام کی وجہ سے ایک روایت کی طرح مشہور تھے۔''

بھولا جو مشرقی پاکستان کا تھا۔ سچا پاکستانی تھا۔ وہ ان بدلتے ہوئے حالات میں اتنا ہی متفکر تھا جتنا کوئی اہل درد ہو سکتا تھا۔ بھولا ان دنوں میں بھی مغربی پاکستان کے لوگوں سے کھلم کھلا مل رہا تھا جبکہ سارا ماحول روٹھا ہوا اور اجنبی تھا۔ لیکن ان ملاقاتوں میں ایک بات واضح تھی کہ دنیا بھر کے موضوع تو زیر بحث رہتے مگر مشرقی پاکستان کے حالات پر کوئی گفتگو نہ ہوتی۔ یہ حقیقت سے فرار والی کیفیت نہ تھی بلکہ دوستانہ ماحول کا بھرم رکھنے کے لیے محض احتیاط تھی۔ کیونکہ:۔

''جب ذہنی اور جذباتی رابطے ٹوٹ جائیں تو زبان کے رابطے کو گھن لگ جاتا ہے۔ گفتگو سہم جاتی ہے۔ باتیں بتائی کم جاتی ہیں اور چھپائی زیادہ جاتی ہیں۔''

ان حالات میں 14 اگست 1971 کو ڈھاکہ میں پاکستان کا آخری یوم آزادی یوں منایا گیا کہ ان کے بقول:-

"بے جان چیزیں تو جشن کے لیے تیار بھی تھیں۔ مگر جاندار مدعوئین جشن پر آمادہ نہ تھے۔ نہ جوش وجذبے کے ابال۔ نہ میلہ گھومنی کے انداز۔ گرم جوشی کے معانقے مفقود تھے۔ پرشور مصافحے غائب تھے۔ فاصلوں سے مسکراہٹوں کے پیغام نہ ملتے تھے۔ جو جہاں بیٹھ گیا خاموشی سے بیٹھ گیا۔ لیکن ان حالات میں بھی لال باغ کے علاقے میں غیر سرکاری جشن واقعی جشنِ آزادی تھا۔ یہ علاقہ اردو بولنے والے بنگالیوں کا تھا جو ہمیشہ سے خالص بنگالی تھے۔"

مسعود مفتی ان تمام حالات کا تجزیہ کرنے کے بعد جب اسباب وعوامل کو تلاش کرنے کی جستجو کرتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ نظام تعلیم کی خامیوں کی وجہ سے نوبت یہاں تک پہنچی ہے۔ نظام تعلیم سوچوں کے دھارے کو ایک خاص انداز میں ڈھالتا ہے۔ یہ ایک خاص رُخ میں چلنے والی ہوا کی مانند ہے جس کے رُخ کا تعین ہر قوم کو خود کرنا پڑتا ہے اور بدقسمتی سے ہماری قومی تساہل پسندی کی وجہ سے مشرقی پاکستان میں یہ ہوا 24 برس تک پاکستان کے مخالف رُخ میں چلتی رہی اور اس رُخ کے تعین میں سب سے بڑا حصہ ہندو اساتذہ کا تھا۔ صرف ڈھاکہ یونیورسٹی میں، جو سرکاری یونیورسٹی تھی اور صوبائی دارالحکومت میں تھی، تیس کے قریب ہندو اساتذہ تھے۔ یہ اساتذہ باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت اپنے خفیہ عزائم کی تکمیل کرتے ہوئے نوجوان ذہنوں کے اندر پاکستان کے خلاف نفرت کا بیج بو رہے تھے۔ مسعود مفتی نے درسی کتب سے بھی کچھ اقتباس پیش کیے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوؤں نے باقاعدہ منصوبہ بندی کر کے معصوم اذہان کو پراگندہ کرنے میں اپنا گھناؤنا کردار ادا کیا تھا۔ مثلاً:-

"چھٹی یا ساتویں جماعت کی ایک درسی کتاب میں پاکستان کے مختلف حصوں کے متعلق ایک مضمون تھا۔ اس میں جہاں مشرقی پاکستان کا ذکر آتا تھا وہاں بلاضرورت چند ایک فقرے درج تھے کہ یہ لوگ (بنگالی) کسی سے کمتر نہیں۔ کوئی انہیں کیوں حقیر سمجھے۔ اگر کوئی حقیر سمجھے تو ہم اس سے انتقام لیں گے۔"

جب ننھے بچوں کے سامنے ان فقروں کی تشریح ہندو اساتذہ کرتے ہوں گے تو کیا کیا حاشیہ آرائی ہوتی ہوگی۔ میٹرک کے لیے انگریزی گرامر کی کتاب میں گرامر کی مختلف تراکیب کی تشریح کے لیے جو فقرے بنائے جاتے تھے ان میں زیادہ تر نام ہندوؤں کے تھے اور ذکر بھی ہندو رسومات اور کلچر کا ہوتا

تھا۔ مسلمانوں کے نام یا کلچر کے حوالے خال خال ہی تھے۔ کالجوں میں انگریزی نثر کی جو کتابیں تھیں ان میں نصف سے زیادہ مضامین کلکتہ کے پروفیسروں نے لکھے تھے۔ یہی حال بنگالی کی کتابوں کا بھی تھا۔ میٹرک یا کالج کے لیے تاریخ کی ایک درسی کتاب میں سب سے نمایاں تصویر رانا سانگا کی تھی اور پھر اکبراعظم کی جس کے سیکولر ہونے کی تعریف کی گئی تھی۔ اس کے علاوہ کسی مسلمان بادشاہ کی تصویر نہ تھی۔

تاریخ کی کتاب بنگالی میں ہو یا انگریزی میں، ان میں کسی نہ کسی رنگ میں 1940 کے "Pakistan Resolution" کا ذکر ضرور ہوتا جس میں ''دو اسلامی'' ریاستوں کے قیام کا تقاضا تھا اور 1946ء کے ریزولیشن کا ذکر دوسری کتابوں میں تو کجا، تاریخ کی کتابوں میں بھی نہ تھا کیونکہ اس میں ایک پاکستانی ریاست کا ذکر تھا۔

مسعود مفتی نے ان شواہد کا ذکر کر کے پاکستان کے تاریخی حقائق سے پردہ اٹھایا ہے۔ اے کاش! آج بھی ان حقائق اور ان کے نتائج کو سامنے رکھتے ہوئے ہم سبق سیکھیں اور آج جبکہ لگ بھگ 60 برس آزاد ہوئے گزر چکے ہیں، نصاب کو قومی تقاضوں اور امنگوں کا آئینہ دار بنائیں۔

پروفیسر نظیر صدیقی نے 'ہم نفس' پر تبصرہ کرتے ہوئے روزنامہ دی نیوز کی اشاعت 10 جولائی 1996 میں اپنے کالم میں یوں تبصرہ فرمایا ہے:-

> "...It is also a brief, most authentic and convincing history of separation of East Pakistan from west Pakistan. The story of this tragic and most painful break up has been told with all the anguish of a true patriot and the political insight of an historian."

محمد کاظم نے فنون لاہور میں 'ہم نفس' پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنی رائے کا یوں اظہار کیا ہے۔

> ''گہرے احساس کے ساتھ لکھی ہوئی ایک اعلیٰ پائے کی تحریر ہے۔ بہت دلچسپ، معلومات افزا اور اپنے اندر شروع سے آخر تک درمندی کی ایک زیریں لہر لیے ہوئے۔ اس لئے کہ اس میں اپنے اُس دیس کا تذکرہ بھی ہے جو اَب اپنا دیس نہیں رہا۔''

5۔مسعود مفتی بحیثیت: مزاح نگار

مسعود مفتی نے اپنے ادبی سفر کا آغاز بحیثیت مزاح نگار کیا انہوں نے کالج کے زمانے سے مزاح لکھا۔ یہی وہ دور ہے جب ان کے بنائے ہوئے کارٹون بھی کالج میگزین "کریسنٹ" اور "راوی" میں شائع ہوئے۔زمانہ طالبعلمی اوراُس کے بعد مجید لاہوری کے "نمکدان" میں بھی لکھتے رہے یہ دوراُن کی خالصتاً مزاح نگاری کا دور تھا۔اسی دوران یہ ہفتہ وار میگزین "چٹان" اور "قندیل" میں بھی لکھتے رہے۔

ان کے مزاحیہ ادب کا دور تقریباً چھ برسوں پر محیط ہے یعنی 1951 سے لے کر جب ان کا تعلق اسلامیہ کالج لاہور کے میگزین "کریسنٹ" سے ہوا۔ جب "کریسنٹ" میں بطور سیکرٹری ان کا انتخاب ہوا تو کالج ٹیوٹوریل گروپ کی دوسری نشست میں انہوں نے اپنا ایک مزاحیہ مضمون پڑھا۔ یوں ادب کی دنیا میں ان کا تعارف ہوا۔ ایم اے انگلش کا دور،اُن کا تخلیقی دور ہے۔ان کا کہنا ہے کہ انگریزی ادب میں جب انہوں نے نفسیات اور ادب کا مطالعہ کیا تو ان کی تخلیقی صلاحیتیں بیدار ہوئیں۔مسعود مفتی نے اپنے مزاحیہ ادب کے بارے میں بتایا کہ:-

> "شادی سے پہلے سنجیدہ ادب نہیں لکھا اور شادی کے بعد مزاح نہیں لکھا۔ایک مضمون لکھا جو شائع بھی ہوا مگر اُس کے بعد میں نے مزاح لکھنا ہی چھوڑ دیا۔"

اُن کا کہنا ہے کہ کارٹون نگاری سے وہ مزاح نگاری کی طرف آئے۔ لیکن پھر ایک سٹیج پر انہیں مافی الضمیر بیان کرنے کے لیے اس میں تشنگی محسوس ہوئی۔یعنی

کچھ اور چاہیے وسعت میرے بیان کے لیے

کے مصداق وہ افسانے کی طرف آئے۔

مزاح نگاری میں ان کا سرمایہ ایک کتاب بعنوان "سر راہے" نیا ادارہ فیروز سنز نے 1964ء میں شائع کی تھی جسے بعد میں دوست پبلی کیشنز،اسلام آباد نے دسمبر 1995 میں شائع کیا۔اس کتاب میں اُن کی مزاحیہ تحریروں کے بارے میں یوں تبصرہ کیا گیا ہے:-

> "مسعود مفتی کا شمار ہمارے معدودے چند مزاح نگاروں میں ہوتا ہے جن کا پُر لطف اسلوب۔شوخی اور نیم باز سنجیدگی کا لہریں لیتا سنگم ہے۔مسعود مفتی لفظوں کے ہیر پھیر سے مزاح پیدا نہیں کرتے وہ اپنے نیم سنجیدہ اور نیم مضحک کرداروں کے لیے ایسے مواقع پیدا کرتے ہیں کہ کامیڈی ناگزیر ہو جاتی ہے۔واقعات کی ستم ظریفی ان کے مزاج کا خاصہ ہے۔مسعود مفتی جس ہنر مندی سے ہماری

روزمرہ زندگی کے مضحک پہلوؤں کی تصویر کھینچتے ہیں وہ ہنسنے پر ہی نہیں سوچنے پر
بھی مجبور کرتی ہے۔"

مسعود مفتی نے جس دور میں مزاح لکھا گویا یہ جولانیٔ طبع کا زمانہ تھا۔ نئے مضامین عالم غیب سے آرہے تھے۔ 1955 میں انہوں نے ایک افسانہ بعنوان "غلطی" لکھا۔ اس کا ایک مختصر اقتباس ملاحظہ ہو:-

"ستم تو یہ ہے کہ آدم جیسے بندے کی خطا پر ان کے خدا نے اتنا شور نہ کیا ہوگا جتنا
ہم جیسے مجازی خدا کی بھول پر ہماری ہی بندی کر رہی ہیں۔ اور یہ نہیں سوچتیں کہ
جو شخص ان سے شادی جیسی فاش غلطی کر سکتا ہے۔ اس سے چھوٹی موٹی دوسری
غلطیاں سرزد ہو جانا تو نہ صرف قرین قیاس ہے بلکہ ہر وقت قابل معافی بھی۔"

ایک صاحب نے دوسری شادی کی وجہ یہ لکھی تھی:-

"میری پہلی بیوی سب ہمسائیوں سے زیادہ خوبصورت ہے اور میری سب
ہمسائیوں کے خاوند مجھ سے بہت زیادہ خوبصورت ہیں، جس سے کچھ بدصورت
حالات پیدا ہو جاتے ہیں۔"

اسی طرح ہمارے یہاں کی خودساختہ انٹلیکچوئل کلاس کا پُرلطف ذکر 'حادثہ' میں ہے۔ انٹلیکچوئل کی تعریف کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:-

"آدھی آدھی رات کو واپس آتا ہے، ہفتوں نہاتا نہیں ہے اور سر کو چڑیوں کا
گھونسلہ بنا رکھا ہے۔ دو چار دوست ہر وقت بلانے آ جاتے ہیں اور ساتھ لے
جاتے ہیں۔ گھر میں کوئی دلچسپی نہیں لیتا۔ کوئی کام کہیں تو مارنے کو دوڑتا ہے۔
اپنے آپ کو ہم سے عقل مند سمجھتا ہے۔"

'سر راہے' میں ایک انشائیہ "پل صراط" بھی شامل ہے یہ ان کے زمانہ طالب علمی کا لکھا ہوا ہے۔ فٹ پاتھ پر چلنے کا تو ہم سب کو اتفاق ہوا ہے لیکن اس پر چلنے کی کیفیت کی تشریح اُن کی زبانی ملاحظہ فرمایئے۔

"فٹ پاتھ کی گنجان آبادی کا یہ عالم تھا کہ اکثر اوقات جس سمت میں ٹانگوں کو
رستہ ملتا دھڑ کو اسی وقت بالکل ان کی مخالف سمت میں راہ ملتی اور بازو اپنی
حفاظت کی خاطر کسی تیسری طرف لپکنے پر آمادہ ہوتے افسوس یہ تھا کہ ہم نے نہ تو
میکینو تھے اور نہ ہی کیچوے بلکہ ٹانگیں۔ دھڑ وغیرہ جسم کے ناقابل تفریق حصے
تھے۔ اس لیے باقی سب حصوں کو کسی ایک کے حق میں دستبردار ہونا پڑتا۔ لہٰذا

تنگ گلے میں سے بڑے نوالے کی طرح پورے جسم کو اس راستے سے گزرنا پڑتا
جو عام طور پر کسی ایک حصے نے اپنی گنجائش کے مطابق تلاش کیا ہوتا۔"

افسانہ ترپ چال میں تجریدی آرٹ کی تاریخ یوں بیان کرتے ہیں:۔

"وہ ہنستے ہنستے بے دم ہونے لگی بڑی مشکل سے اس نے اپنے الٹے ہوئے
سانس کو سنبھالا اور ضبط کر کے بولی: "اور وہ نہیں سنا آپ نے کہ تجریدی آرٹ
شروع کیسے ہوا تھا کہتے ہیں ایک سنکی خط لکھ رہا تھا تو ایک مکھی اس کی دوات میں
گر پڑی۔ کھی کھی کھی' اس کی ہنسی چھوٹ پڑی کھی کھی کھی" وہ میز پر سر ٹکا کر بے
تحاشا ہنسنے لگی۔ تو وہ۔۔۔ تو وہ۔۔۔ کھی کھی کھی۔۔۔ تو وہ۔۔۔ تو اس نے مکھی
نکال کر کاغذ پر رکھی۔ تو۔۔۔ کھی کھی کھی۔۔۔" اس نے منہ میں دوپٹہ ٹھونس لیا
اور پیٹ پکڑ کر ہنسی روکنے لگی۔

"مکھی نے جب کاغذ پر ادھر اُدھر چلنا شروع کیا تو سیاہی میں لتھڑی ہونے کی
وجہ سے۔۔ کھی کھی۔۔۔ ہی ہی ہی۔۔۔ کاغذ پر ہنستی ہنسی وہ آنکھوں سے پانی
صاف کرنے لگی: "کھی کھی کھی۔۔۔ تو انہوں نے۔۔۔ افوہ۔۔ کھی۔۔ ریسرچ
کر کے اس پر سو صفحات کا مضمون لکھا کہ ایک نئے آرٹ کا پتہ چلا ہے۔
اور ہمارے ہنسنے کا انتظار کیے بغیر وہ ہنستی ہنستی بے دم ہو کر گر پڑی۔"

اسی طرح ان کا ایک افسانہ "گورکھ دھندا" ہے جو 1953 میں لکھا گیا اور یہ بھی طالب علمی کا ہی زمانہ
ہے۔ اس میں عورتوں کی گفتگو میں جب رشتوں کا بیان ہوتا ہے تو وہ اس قدر الجھا ہوا ہوتا ہے کہ ایک
گورکھ دھندا معلوم ہوتا ہے۔ جس کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔ مثلاً:۔

"غلام محی الدین قریشی کی بڑی لڑکی کے منجھلے دیور کی سسرال میں جو سکینہ ہے
نا۔۔۔ اس کی سگی بہن کے سوتیلے لڑکے کے چچا کی بھانجی، کشمیریوں میں بیاہی
گئی ہے، اس لڑکے کا چچا۔۔۔۔ او ہو وہ کیسے مر گیا؟" دماغی بھول بھلیوں سے
تنگ آ کر ہم نے بات کاٹ دی۔" ہائے ہائے اللہ سے خیر مانگو، وہ کیوں
مرے۔۔۔" خالہ سنجیدہ ہو کر بولی اور پھر پہلی رفتار پر بھاگ پڑیں۔" اس لڑکے
کے چچا کی اولاد نہ تھی، اور اُس نے اپنے بھائی کا لڑکا لے کر پالا ہوا تھا۔ اس
لڑکے کی منجھلی بھاوج کے پہلے خاوند کے ماموں کا سگا لڑکا مر گیا ہے۔"

چنانچہ مسعود مفتی نے اس کا حل یہ نکالا کہ ایک ایسی ڈکشنری تیار کی جائے جس میں ایسے رشتوں کی
تفصیل ہو۔ جب کبھی ان کا واسطہ اپنے خاندان کی خواتین بزرگ سے پڑے جو ایسے ہی رشتوں کے

گورکھ دھندے کو بیان کرے تو یہ جھٹ سے اپنی ڈائری نکال لیں اور مطلوبہ رشتے کی تہہ تک پہنچ جائیں۔ یہ ڈکشنری کچھ اس طرح ہو:۔

"ایک شخص کے سگے بیٹے کی سوتیلی ماں: اس شخص کی دوسری بیوی
ایک شخص کی بیوی کی بیٹی کا بھائی: اس شخص کا بیٹا
ایک شخص کی بیٹی کی چچازاد بہن کی ماں کے خاوند کا بھائی: وہ شخص بذات خود"

ایک اور افسانہ جس کا عنوان "گرہمیں مکتب" ہے دسمبر ٹیسٹ میں فیل ہونے اور اپنے والد صاحب سے ڈانٹ کھانے کے بعد جب افسانے کے ہیرو کو کہا گیا کہ وہ روزانہ کلاس میں لکھے گئے نوٹس اپنے والد صاحب کو دکھائے تو ہیرو نے دل ہی دل میں کالج کی ٹک شاپ کو طلاق دی اور فوری طور پر رضامند ہو گیا۔ لیکن اگلی ہی شام کو جب اس نے اپنی دن بھر کی کارگزاری اپنے والد کو دکھائی تو یہ ماجرا پیش آ گیا کہ:۔

"یک لخت ان کے چہرے کا رنگ بگڑنے لگا۔ نقوش سخت ہونے لگے۔
آنکھیں اُبلنے لگیں اور پھر ایک چنگھاڑ کے ساتھ انہوں نے کاپی اس جگہ دے
ماری جس جگہ ہمارا چہرہ تھا۔۔۔"

ان کے لکھے ہوئے نوٹس، جن کی وجہ سے والد صاحب کی شکل تبدیل ہوئی، کی نقل کچھ اس طرح سے ہے:۔

"غدر اردو ادب میں ایک نئے دور کا آغاز کرتا ہے۔ غدر کے ہنگامے کے بعد نہ
صرف ہندوستان کی سیاسی اور معاشرتی زندگی پر اثر پڑا بلکہ بھاٹی، لوہاری
دروازے میں بھی انقلاب عظیم برپا ہوا۔ انگریزی ادب سے واقف ہوتے ہی
اس کی اصناف شاعری سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی گئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ
ڈرامہ "مناظر اور اسلم کی کہنی" کی ابتدا ہوئی حالانکہ جن لوگوں نے اردو کو یہ نئے
راستے دکھائے انہوں نے خود کبھی ٹھنڈا شربت نہ پیا تھا۔۔۔ نثر کی اصلاح
فورٹ ولیم کالج سے شروع ہو گئی تھی۔ سرسید اور ان کے ساتھیوں نے للکار للکار
کر کہا' ہماری گلی آنا، اچھا جی۔۔۔ ہمیں نہ بھلانا، اچھا جی۔ حالی اور آزاد نے
اپاہج ہو کر غریبوں کو پیسے دینے شروع کیے۔"

ماجرا کچھ یوں تھا کہ نوٹس لکھتے وقت کبھی خواب آ جاتے کبھی باہر سڑک پر کوئی آواز لگاتا ہوا آدمی نوٹس میں وارد ہو جاتا اور کبھی ایک پیریڈ ختم ہونے کے بعد معلوم ہی نہ ہوتا کہ کب اردو سے انگریزی کا پیریڈ شروع ہو چکا کیونکہ مصنف خواب غفلت سے اس وقت بیدار ہوتا جب اگلے استاد آ چکے ہوتے۔

1960 میں لکھے گئے دو انشائیے اس مجموعے میں شامل ہیں ان کے عنوان ہیں "کھیل" اور "بے زبانی"۔ "کھیل" میں کھیل برج اور کھلاڑی کے بارے میں لکھا گیا ہے جبکہ

''بے زبانی'' میں ان مشکلات کا ذکر ہے جو دیارِ غیر میں اس وقت پیش آتی ہیں جب معاملہ کچھ اس مصرع کے مصداق ہو کہ ۔

زبان یار من ترکی و من ترکی نمی دانم

''انسان کو کسی نے جب ایک حیوان کا نام دیا تو مصنف کو یہ بہت بُرا لگا اور اسے اس پر اعتراض ہوا۔ لیکن جب فرانس، سوئٹزرلینڈ یا جرمنی میں اس کا واسطہ ایسے لوگوں سے ہوتا ہے جو اس کی زبان نہیں جانتے تو اُسے احساس ہوتا ہے کہ انسان واقعی حیوانِ ناطق ہے اور اگر ناطق فیل ہو جائے تو واقعی وہ صرف ایک حیوان رہ جاتا ہے۔ جب کبھی یہ مقامی لوگوں سے راستہ پوچھتے تو راہ گیر تماشا دیکھنے کو گھڑی دو گھڑی کھڑے ہو کر مجمع لگا لیتے۔ کئی دفعہ پولیس والے ادھر ادھر سے مُنہ پھاڑ کر اکھٹے ہونے والے راہ گیروں سے یہ کہتے کہ سڑک پر کھڑے چار پانچ ''ڈارک بوائز'' جو ہوا میں ہاتھ پاؤں چلا رہے ہیں اور قلابازیاں لگا رہے ہیں۔ وہ کسی مشرقی سرکس کا اشتہار نہیں دے رہے۔ بلکہ راستہ پوچھ رہے ہیں اور اس ''بے زبانی'' کی انتہا یوں ہوتی کہ ''سنا ہے قیامت کے روز ہمارے جسم کا ہر حصہ ہمارے اعمال کے خلاف گواہی دے گا۔ انگلیاں، آنکھیں، ہاتھ، پاؤں، بازو وغیرہ سب بولیں گے شکر اسی بات کا ہے کہ یورپ کے سفر کے بارے میں زبان کچھ نہ کہہ سکے گی۔ بلا سے ایک دشمن تو کم ہوا۔''

دوسرے انشائیے ''کھیل'' میں برج کے بے شمار فوائد میں سے کچھ یوں رقم کرتے ہیں:۔

''کہتے ہیں سوسائٹی کا تقاضا ہے کہ برج ضرور کھیلو اب یہ سوسائٹی کم بخت بھی تو عورت کے مزاج کی طرح ہے۔ لاکھ خوش کرو ہوتی ہی نہیں۔ پہلے سوسائٹی نے ہم سے کہا کھلی پتلونیں پہنو تو ہم نے پائنچے اتنے بڑھا لیے کہ ہماری پتلونوں سے جاٹ دھوتیاں بنانے لگے پھر سوسائٹی نے کہا کہ اب تنگ پتلونیں پہنو۔ ہم نے اتنی تنگ کر دیں کہ کمر کے نیچے کا گداز حصہ جو اگر بڑا ہو تو بیٹھنے میں آسانی رہتی ہے، بالکل سکڑ کر رہ گیا۔ پھر سوسائٹی نے کہا کہ سویٹر کا گلا اونچا رکھو کہ کالر اس میں چھپ جائے ہم نے سرِ تسلیم یہاں تک خم کیا کہ گردن پر ہر وقت مرچیں کاٹتی رہیں۔ پھر سوسائٹی نے کہا کہ تنگ نوک کے اٹالین جوتے پہنو۔ اب مسلسل استعمال کے بعد حالت یہ ہے کہ جوتا اتارتے ہیں تو اندر سے پاؤں کے بجائے گاجر نکلتی ہے۔''

اسی طرح ''دھمکی'' کو وہ یوں شگفتہ انداز میں شروع کرتے ہیں:-

''ہماری کارپرانی ضرور مگر اتنی بھی نہیں کہ لوگوں میں افواہ پھیل جائے کہ یہ اللہ میاں کی ہے جو اماں حوا کو جہیز میں ملی تھی۔ ہم نے لاکھ کہا کہ جنسِ لطیف کی سکہ بند روایت ہے کہ ہر ماں اپنی لڑکی کو وہ چیزیں جہیز میں دیتی ہے جو اس کی اپنی ماں کو جہیز میں ملی تھیں اور اماں حوا کی ماں ہی نہ تھی، اس لیے ان کا قیاس غلط ہے''!

''مقابلہ'' اور ''کرکٹ نامہ'' بھی وہ دو مزاحیہ مضامین ہیں جن میں مسعود مفتی کا وہی شگفتہ شگفتہ اسلوب بیان ہے جو قاری کو زیرِ لب مسکرانے پر مجبور کرتا ہے۔ اس میں انہوں نے مختلف کرداروں کو کس طرح بیان کیا ہے:-

''صنعتی انقلاب کے بعد شبِ فراق کی لمبائی نے اومنی بس کے انتظار کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اس لئے جب کافی دیر تک بس نہ آئی تو انور پریشان ہوا۔ اس عرصہ میں زندگی کے مختلف گوشوں کے نمائندے بس سٹاپ پر اکٹھے ہو رہے تھے۔ سکول کے بچے، کالج کے طلباء، دفتر کے تنگی بابو، قیمتی لباس میں ملبوس کنگال جنٹلمین، نفع نقصان کے ہتھوڑوں کے گھڑے ہوئے کنجوس بیوپاری، لیکچروں کے زور پر جینے والے غریب پروفیسر، شوقین بیویوں کے اخراجات پورے کرنے والے کفایت شعار خاوند اور افسانوں اور فلموں کو حقیقت سمجھ کر ہیروئن کی تلاش میں سرگرداں ہیرو۔۔۔''

''کرکٹ نامہ'' میں اس بخار کا تذکرہ ہے جو کرکٹ کے موسم میں پوری قوم کو لاحق ہو جاتا ہے ہر کوئی اپنے کام کو بالائے طاق رکھتے ہوئے صرف کرکٹ کا سکور معلوم کرنا ہی اپنا اہم ترین فریضہ سمجھتا ہے۔ بچے، بوڑھے، پیر، جوان، خاتونِ خانہ، کام کرنے والی خواتین، غرضیکہ یہ ایسا موسم ہے جس میں کوئی بھی اس بخار سے بچ نہیں سکتا۔ اسی طرح ''ترپ چال''، ''حادثہ'' دھمکی اور ''مکلس'' بھی مزاحیہ مضامین ہیں جو 1962 میں لکھے گئے۔

ماہنامہ ادبِ لطیف میں سرِ راہے پر یوں تبصرہ کیا گیا ہے:-

'' سرِ راہے'' مسعود مفتی کی پہلی کتاب ہے۔ اردو نثر میں ایسی تحریروں کی کمی ایک مدت سے محسوس کی جاتی رہی جو زندگی کے مسائل کو اس طور پیش کریں کہ پڑھنے والے کے لیے گراں نہ گزریں۔ مسعود مفتی کے پیشِ نظر اپنے اردگرد پھیلے ہوئے بیسیوں ایسے موضوع ہیں جن پر وہ چوٹ بھی کرتے ہیں، غصہ بھی کھاتے ہیں

لیکن اپنے غصے کے اظہار کے لیے جو اُسلوب انہوں نے اختیار کیا ہے وہ
نصیحت، اعلان یا خطبے کا نہیں بلکہ چھیڑ چھاڑ، مزاح یا چٹکی بھرنے کا ہے۔ بات
اس انداز سے کی جائے کہ پڑھنے والا اُسے معصومیت سے پڑھ کے گزر جائے
اور پھر یک لخت اُسے احساس ہو کہ اس کے ساتھ کوئی ہاتھ ہو گیا ہے۔۔۔۔
زیرِ نظر مضامین میں بات کرنے کا یہ شگفتہ انداز موجود ہے۔ اس طرح وہ بات
ایک سیدھے سپاٹ بیان کی بجائے فنی طریق اظہار کا حصہ بن جاتی ہے۔
مصنف نے واقعات کی جو تصویریں کھینچی ہیں ان میں بھاری سٹروکس
نہیں لگائے یہ ایک طرح سے واٹر کلر تصویریں ہیں جو ہلکے برش اور باریک
پنسل سے بنائی گئی ہیں۔"

6۔ مسعود مفتی بحیثیت افسانہ نگار

مسعود مفتی کے "ادبی سفر" میں انہوں نے سب سے زیادہ جس صنف پر کام کیا ہے وہ "افسانہ" ہے۔
وہ کہتے ہیں کہ مزاحیہ ادب میں اپنا مافی الضمیر کھل کر بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا دامن تنگ ہے۔ چنانچہ
وہ سنجیدہ ادب کی طرف مائل ہوئے اور افسانہ نگاری شروع کی۔ اپنے وسیع تجربے کی بناء پر انہوں نے
زندگی کے تقریباً تمام پہلوؤں پر لکھا اور مسائل کی نشان دہی کی۔ اس گھٹے ہوئے ماحول میں معاشرہ جس
جس طرح انسان پر اثر انداز ہوتا ہے اور اس کی ذہنی الجھنوں کو بڑھاتا ہے اس کی عکاسی کی گئی ہے۔
اپنے ایک انٹرویو میں جو اکادمی ادبیات میں شائع ہوا اس سوال کے جواب میں کہ آج کل آپ کیا لکھ
رہے ہیں۔ یوں جواب دیا:-

"ادب میں افسانہ، صحافت میں حالاتِ حاضرہ اور سیاست میں جمہوریت کے
متعلق لکھ رہا ہوں۔"

مسعود مفتی کے اب تک پانچ افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن کی ترتیب کچھ یوں ہے۔

1- محدب شیشہ 1964
2- رگِ سنگ 1969
3- ریزے 1974
4- سالگرہ 1996
5- توبہ 2006

یہ کتاب جیسا کہ سن اشاعت سے ظاہر ہے، اسی دور میں شائع ہوئی ہے جب ان کی مزاحیہ خاکوں اور انشائیوں پر مبنی کتاب " سر راہے" شائع ہوئی تھی۔ محدب شیشہ' مسعود مفتی کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ مصنف نے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ :-

"انسانیت کا زیادہ حصہ وہ لوگ ہیں جو زندگی کے طوفان میں ڈبکیاں کھاتے رہتے ہیں کبھی آرام سے سطح پر تیر لئے کبھی بھنور میں چکرانے لگے اور کبھی گہرے خوابوں میں دھنس گئے۔ یہ لوگ زندگی کا مقابلہ ضرور کرتے ہیں مگر اس پر فتح حاصل نہیں کر سکتے۔ یہ کہانیاں ان لوگوں کی ہیں جو زندگی کے طوفان سے نبرد آزما ہوتے ہیں۔ وہ ڈبکیاں کھاتے رہتے ہیں نہ زندگی انہیں پیار کرتی ہے نہ ان کو زندگی سے پیار ہوتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو برداشت کرتے ہیں۔"

اس کتاب کے شائع ہونے سے پہلے وہ ادبی دنیا میں معروف ہو چکے تھے اور سنجیدہ ادبی کوشش نے انہیں حقیقت نگار ادیبوں کی صف میں ایک ممتاز مقام دلا دیا تھا۔ اس میں زیادہ تر افسانے اُن "ملاؤں" کے متعلق ہیں، جن کا اپنا علم، دین کے بارے میں محدود ہے۔ جو اسلام کی اصل روح کو تو سمجھتے نہیں لیکن سادہ لوح عوام کو بہکا رہے ہیں۔ مسعود مفتی ایک وسیع القلب مسلمان ہیں وہ تنگ نظری کو کسی طور برداشت نہ کر سکتے تھے جب دیکھتے ہیں کہ ملا کس کس طرح سے ایک سادہ لوح مسلمان کو اسلام کے بتائے ہوئے اصولوں سے دور لے جا رہا ہے تو لامحالہ ان کا ذہن پریشان ہوتا ہے اور یوں ان کا قلم مجبور ہو جاتا کہ وہ اس پر کچھ لکھے۔ وہ علامہ اقبال کے "ملائیت" کے بارے میں اس شعر پر یقین رکھتے ہیں۔

کار ملا فی سبیل اللہ فساد

ماہنامہ اردو ڈائجسٹ لاہور نے ستمبر 1965 میں اس کتاب پر یوں تبصرہ کیا:-

"اس کتاب کے پہلے افسانے "محدب شیشہ" میں ماسٹر برکت علی اور شرفو کے کردار نیکی اور بدی کی کشمکش کے دو پیرائے ہیں جن میں شرفو کی فتح اور برکت علی کی ناکامی دکھائی دیتی ہے۔ وہ جانے پہچانے ادیب ہیں اس سے قبل ان کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ سر راہے کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اب وہ ایک افسانہ نگار کے روپ میں ہمارے سامنے آئے ہیں۔ مسعود مفتی کا محبوب موضوع مذہبی اقدار اور جدید مادی زندگی کے درمیان ٹکراؤ ہے اس تصادم میں

اخلاقی قدروں کی شکست وریخت کا جو سلسلہ چلتا ہے مسعود مفتی ''محدب شیشہ
'' کی مدد سے اسے دیکھتے ہیں۔''

''محدب شیشہ'' میں زندگی کی بکھری ہوئی کہانیاں ہیں جو مصنف کے گہرے مشاہدے اور فنی خلوص پر مبنی ہیں۔انہوں نے افسانہ محض وقتی لذت کے لیے تخلیق کیا اور نہ ہی وہ ذہنی عیاشی کے لیے لکھتے ہیں۔ بلکہ وہ تلخ حقائق بیان کرتے ہیں جو ناسور بن گئے ہیں۔ وہ انسانی المیوں پر قلم اٹھاتے ہیں۔ایسی ہی ایک کہانی ''محدب شیشہ'' ہے۔یہ ان کا پہلا سنجیدہ افسانہ تھا جو 1957 میں رسالہ ''ادبِ لطیف''(ایڈیٹر مرزا ادیب) میں شائع ہوا تھا۔

محدب شیشہ سادہ لوح ماسٹر برکت علی کی کہانی ہے جس نے مولوی صاحب کے جمعہ کے وعظ میں جب یہ سنا کہ''یتیم و مسکین اور بیوائیں عرش کا سہارا ہیں۔ان کے آنسو پونچھو،ان کے سر پر ہاتھ دھرو۔ اپنی کمائی میں سے ان کو حصہ دو۔۔۔'' تو اس پر بہت اثر ا ہوا۔ ماسٹر برکت علی نے اس وعظ کے ایک ایک حرف کو بڑے غور سے سنا اور جب مولوی صاحب نے کہا کہ''بیوہ کی ایک آہ آسمانوں میں سوراخ کر دیتی ہے'' تو وہ کانپ اٹھا۔ اس نے اپنے خدا سے اپنی اب تک کی تمام کوتاہیوں کی معافی مانگی۔ کیونکہ یوں تو وہ پورے قصبے میں ہر ایک کے کام آتا لیکن 'نوراں'، جو ایک بیوہ تھی اور 'غفور' جو نوراں کا یتیم و مسکین بیٹا تھا۔ ان کے حالات سے ماسٹر برکت علی اب تک بے خبر تھا۔مولوی صاحب کے وعظ کے مطابق ان کی مدد کرنے اور اپنے آپ کو خدا کے عذاب سے بچانے کے لیے غفور کو اپنے ہاں بلا کر پڑھانے لگا اور اس کی بیوہ ماں کی خبر گیری کرنے لگا۔ وہ گاہے بگاہے ان کے گھر ضروری اشیائے خوردنی بھی بھیجنے لگا۔مگر ہوا یوں کہ قصبے والے جب یہ سب کچھ دیکھتے ہیں تو ان سے برداشت نہیں ہو پاتا۔اس کہانی کا انجام یہ ہوتا ہے کہ 'نوراں' کو یہ گاؤں چھوڑنا پڑتا ہے اور ماسٹر برکت علی کو یہ دنیا۔ یوں یہ ''محدب شیشہ'' وہ شیشہ ہے جس میں ہمیں اپنی وہ چھوٹی کوتاہیاں جو در حقیقت بڑی ہیں، واضح دکھائی دیتی ہیں۔

''دعا'' ایک ایسی کہانی ہے جس میں مرکزی کردار ایک راہبہ کا ہے۔ راہبہ کا کردار مذہب کے مضبوط حصار میں گھرے ہوئے برکت علی اور شرفو کو ایک نئے انداز میں پیش کرتا ہے یہاں ایسی بے ضرر خواہشات شرفو کے روپ میں نمودار ہوتی ہیں جنہیں مذہب کی بے جا سختی نے جرم کا نام دے رکھا ہے لیکن در حقیقت یہ خواہشات انسانی زندگی کے عام تقاضے ہیں۔ اس لحاظ سے راہبہ کے دل میں مذہبیت کا وہی تصور ہے جو محدب شیشے میں مسجد کے مولوی کا ہے۔ راہبہ جوان ہے، خوبصورت ہے، ارمان بھرا دل بھی ہے، لیکن اس کے لیے اس زندگی کی تمام لذتیں حرام کر دی گئی ہیں۔ اس کا بھی جی چاہتا ہے کہ وہ بھی سامان آرائش، جیسے پاؤڈر، سرخی،

عطر اور ناخن پالش خریدے، ان کو استعمال کرے۔ آخر کار وہ اپنی جبلّت کے ہاتھوں مجبور ہو جاتی ہے اور ایک دکان سے یہ تمام چیزیں چُرا کر بھاگ جاتی ہے۔''دُعا'' ایک جرأت آزما افسانہ ہے اس سے انسانی جمود اور مفروضہ روایت پرستی پر ضرب پڑتی ہے انسان اس وقت تک آسودہ زندگی کی راہیں نہیں نکال سکتا جب تک کہ خود اپنی فطرت سے بغاوت نہ کرے۔ یہ افسانہ اسی کی نشاندہی کرتا ہے۔

''گورکن'' ایک ایسے والد کی مجبوری اور بے بسی کی کہانی ہے جو اپنے بیٹے کی معصوم سی خواہش پوری نہیں کر پاتا۔ اس کا ہاتھ تنگ ہے کیونکہ پچھلے ایک ہفتے سے قبرستان میں کوئی مردہ نہیں آیا اور گورکن اللہ بخش کی آمدنی کا وسیلہ ایسا ہی کوئی مردہ تھا۔ اس کے بیٹے شرفو نے صبح صبح پتنگ کے لیے پیسے مانگے تو اس کو انکار کرنا پڑا اور اب وہ قبرستان میں کھڑا یہ دعا مانگ رہا تھا کہ ''یا خدا'' کسی کو بے موت ہی مار دے'' دعا قبول ہو جاتی ہے۔ اللہ کسی کو بے موت مار دیتا ہے لیکن گورکن کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ بے موت مرنے والا کوئی اور نہیں اس کا اپنا لختِ جگر ہے تو اسے پہلی دفعہ یہ احساس ہوتا ہے کہ موت کیا چیز ہے؟

'یا خدا' اس مجموعہ کا بہترین افسانہ قرار دیا جا سکتا ہے مصنف نے ایک اچھے افسانوی پیرایہ میں انسان کی قدیم و جدید تاریخ کے اوراق کو الٹ دیا ہے۔ یہ بیان اس سلیقہ سے ہوا کہ افسانہ کا تاثر بڑھ جاتا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ انسان نے خدا کو ہمیشہ اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا ہے۔ ایک انسان اپنی اکھڑی ہوئی سانسوں میں ایک غار کے کنارے دعا مانگتا ہے۔

> ''یا خدا! یسوع مسیح کی برکت سے مجھے محفوظ رکھنا۔ مجھے ان کافروں سے نجات دلا اور توفیق دے کہ میں ان کو تیرا سیدھا راستہ بتا سکوں۔''

یہ انسان جیل سے بھاگا ہوا ایک عیسائی قیدی تھا جو موت کی سزا کا انتظار کر رہا تھا اسے عیسائی ہو جانے پر سزا دی گئی تھی۔ رومن لوگوں کی ہسپانیہ تک پھیلی ہوئی سلطنت میں عیسائیت خلافِ قانون قرار دی گئی تھی۔ تمام عیسائیوں کو قتل کرنے یا مذہب سے منکر کرنے کی سرکاری تحریک بہت زوروں پر تھی اس کو ڈھونڈ لیا گیا اور مار دیا گیا اور مارنے والوں نے بھی اپنے ہاتھ اٹھا کر دعائیہ انداز میں یہ کہا!

> ''یا خدا ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔ تیری مدد ہوئی تو سب مرتد جلد ہی ختم ہو جائیں گے۔''

فرق صرف یہ تھا کہ پہلے نے انجیل کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر دعا مانگی تھی اور دوسرے نے اسی انجیل کو پاؤں کی ٹھوکر سے پرے پھینک کر یہ الفاظ کہے تھے۔ پانچ سو برس کے بعد یہ غار پھر آباد ہوا۔ آٹھویں صدی کا آغاز تھا۔ ہلال اور صلیب کے خونچکاں ٹکراؤ کی جھنکار سارے یورپ میں گونج رہی تھی۔ دونوں فریق خدا کو خوش کرنے کے لیے لڑ رہے تھے۔ اسی وادی میں کچھ سوار سرپٹ گھوڑے دوڑاتے جا رہے تھے۔ تین سوار غار دیکھ کر اندر پناہ کے لیے بھاگے تعاقب کرنے والے بھی فوراً پہنچ گئے

محاصرہ کیا اور پکار کر کہا:۔

''عیسائی فوج کے سپاہیو! تم اب محصور ہو۔ ہم ایک دفعہ پھر کہتے ہیں کہ ہمارا تم سے کوئی جھگڑا نہیں، ہم اللہ کے سپاہی ہیں۔ اس کے دین کا پیغام لے کر دنیا میں گھوم رہے ہیں۔ اگر تم اسلام قبول کرلو تو ہمارے بھائی ہو۔''

دونوں گروہوں میں لڑائی ہوتی ہے۔ مسلمان مرتا ہے تو اس کے ساتھی دعا پڑھتے ہیں۔

''یا خدا! اس نے تیری راہ میں جان قربان کی۔ اس کی بوڑھی ماں کو صبر دے اور اسے اپنے وعدے کے مطابق بہشت بریں میں جگہ دے۔''

عیسائی مارے جاتے ہیں تو پادری غار میں آتا ہے۔ لاش پر مقدس پانی چھڑکتا ہے۔ صلیب کا نشان لگاتا ہے۔ اور ہاتھ اٹھا کر با آواز بلند کہتا ہے۔

''یا خدا! انہوں نے تیری راہ میں اپنی جانیں لٹائی ہیں اپنا وعدہ پورا کر اور ان کو جنت میں جگہ دے۔''

پندرھویں صدی کے آخری برسوں میں یہ غار پھر آباد ہوا۔ یہ شاہ فرڈی نینڈ اور ملکہ ازابیلا کا جشن فتح غرناطہ کا دور ہے۔ مسلمانوں کا دورِ ابتلاء ہے۔ اسی غار میں ایک مسلمان خاندان پناہ گزیں ہے۔ عورت کا خاوند شہر میں کام کرنے گیا ہے۔ اس کی غیر موجودگی میں عورت کے سامنے اس کے بیٹے اور بیٹی کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ بعد میں عورت اور اس کے خاوند کو بھی۔ جب یہ رپورٹ پادری کو دی جاتی ہے وہ بھی یہی کہتا ہے۔

''خدا کی رحمتیں تم پر نازل ہوں۔ میرے بچے تم نے اس کے نام کو بچا لیا۔''

وقت گزرتا گیا سولہویں صدی میں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کی تفریق ہوگئی پھر وہی فساد، خون، قتل و غارت۔ غرضیکہ انسان جس کو خدا نے اپنا عکس بنایا۔ اس کو محبت کے لیے پیدا کیا۔ اسی انسان نے خدا کے نام پر نفرت کا کاروبار شروع کردیا۔ اور اس کی نادانی کی انتہا ہے کہ اسے خدا کی خوشنودی کے حصول کا سبب قرار دیتا ہے۔ گویا خدا اپنی مخلوق کو قتل ہوتے دیکھ کر خوش ہوگا؟

طارق محمود نے ہفت روزہ قندیل 9 مئی 1965 میں محدب شیشہ کے اس افسانے 'یا خدا' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:۔

''ہزاروں سال پہلے سے لے کر آج تک مذہب کے نام پر جتنی لڑائیاں لڑی گئیں ان میں دونوں فریقوں نے اپنے آپ کو حق پر جانا۔ قاتل نے کہا کہ یا خدا دیکھ تیرے لیے۔ کس کس طرح جدو جہد کی۔ اور مقتول نے کہا 'یا خدا دیکھ تیرے لیے کیسی کیسی قربانیاں دی ہیں' یہ کہانی دنیا کو

ایک غار کی علامت میں دکھاتی ہے جہاں ایک شخص سوتے ہوئے مختلف تاریخی واقعات خواب میں دیکھتا ہے۔"

مسعود مفتی نے اپنے اردگرد کے معاشرتی اور معاشی المیوں کی عکاسی بھی بہت عمدگی سے کی ہے۔ "اداکار" بھی ایسی ہی ایک کہانی ہے ایک بوڑھا باپ اپنی بیٹی کو رضامند کرنا چاہتا ہے کہ وہ اس کی پسند کے لڑکے سے شادی کر لے۔ لڑکی رضامند نہ ہوئی کیونکہ وہ کالج کے سائیکل سٹینڈ کے چوکیدار سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ باپ اپنی ضد پر قائم رہا۔ آخر کار لڑکی نے خودکشی کر لی۔ باپ نیم پاگل ہو کر ہر دوسرے چوتھے ہفتے کسی نوجوان کو گھیر کر گھر لاتا ہے۔ اپنی بیٹی کی تعریفوں کے پل باندھتا ہے اس کو اس کرسی پر بٹھاتا ہے جہاں وہ لڑکا بیٹھتا تھا جس سے وہ اپنی بیٹی کی شادی کرنا چاہتا تھا اور اس کو چائے پلا کر اپنی بیٹی کی شادی کی باتیں دہراتا ہے۔ دو چار ملاقاتوں کے بعد ہر لڑکے کو آخر کار پتہ چل ہی جاتا ہے کہ باپ اداکاری کر رہا ہے۔ اور وہ آنا چھوڑ دیتا ہے۔ باپ اپنی بیٹی کی تصویر کو سامنے رکھ کر کئی کئی دن تک روتا رہتا اور پھر کسی اور لڑکے کو گھیر کر لے آتا۔ اس افسانے میں مذموم رسومات پر گہری تنقید کی گئی ہے۔ شادی کے مسئلے میں والدین کے غلط رویہ اور ناجائز جبر پر نکتہ چینی کی گئی ہے اور اس کے بھیانک نتائج کی ایک جھلک دکھائی گئی ہے۔

"لاعلم" ایک ایسے وکیل کی کہانی ہے جو ایک حلوائی کو فراڈ کے مقدمے میں بچا لیتا ہے۔ "مولو حلوائی" کی دکان پر فوڈ انسپکٹر نے چھاپہ مارا وہ کم تولتے ہوئے پکڑا گیا، مٹھائی کے شیرے سے مرا ہوا چوہا بھی برآمد ہوا، لیبارٹری رپورٹ سے یہ بات بھی سامنے آئی کہ گھی کے بجائے وہ تیل اور چربی میں مٹھائی بناتا ہے۔ لیکن بھاری فیس لے کر وکیل ہر دفعہ اس کو بچا لیتا ہے۔ تقدیر اس وکیل کے ساتھ یوں مذاق کرتی ہے کہ اس کا اپنا بیٹا مولو حلوائی کی دکان سے مٹھائی کھانے کے بعد ہیضے کا شکار ہو کر مر جاتا ہے اور وہی وکیل چلا چلا کر کہتا ہے کہ "ارے لوگو! مولو حلوائی کی مٹھائی کھا کر میرے بچے کو ہیضہ ہو گیا۔ نہ معلوم حکومت ایسے بے ایمانوں کو سزا کیوں نہیں دیتی؟" "لاعلم" آج کل کے کاروباری طرز فکر کی ایک حقیقی تصویر ہے۔

"نام" کہانی ہے ایک متوسط طبقے کی لڑکی کی۔ اس طبقے کا المیہ ہے کہ اس کے افراد اپنی سفید پوشی کا بھرم رکھتے رکھتے اپنی تمام آرزوؤں، ارمانوں کا خون کر دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ درمیانی طبقہ ہی ہے۔ جس پر معاشرے کا ڈھانچہ کھڑا ہے۔ سب سے زیادہ مظلوم بھی، یہی طبقہ ہے۔ نچلے طبقے کے لوگ تو جو جی چاہتا ہے کر لیتے ہیں۔ لڑنے کو جی چاہتا ہے تو کھل کر لڑ لیتے ہیں۔ محبت بھی کھل کے کرتے ہیں۔ رہا امیر طبقہ تو یہ طبقہ تو کسی کے آگے جواب دہ ہے ہی نہیں۔ وہ تو خدا کو بھی بھول بیٹھا ہے۔ متوسط طبقے کی یہ لڑکی محبت تو کرتی ہے۔ لیکن اظہار نہیں کر پاتی۔ وہ چاہتی ہے کہ جو لڑکا اس سے محبت کا دعویٰ کرتا ہے وہ اس

سے شادی بھی کر لے۔ لڑکے سمجھتے ہیں کہ وہ ہرجائی ہے ہر ایک کو دعوت عام دیتی ہے۔ آخر میں معلوم یہ ہوتا ہے کہ لڑکی تو انتظار میں تھی کہ کوئی اس کا ہاتھ تھام کر شادی کرے کیونکہ وہ سمجھتی ہے۔

''ہم متوسط طبقے والوں کے پاس نام کے علاوہ اور ہے ہی کیا؟ اچھی اخلاقی شہرت کے لیے ہی تو ہم سینکڑوں ذہنی دیواریں بناتے ہیں۔ اور اگر شادی کے وعدوں پر تجربوں میں وہ نام ہی کھودوں تو کون کرے گا مجھ سے شادی؟''

انجام اس بدنصیب کا یہ ہوتا ہے کہ ایک نفسیاتی کلینک میں اپنے اعصابی تناؤ کا علاج کرا رہی ہے اور ڈاکٹر اس کے ایک پرانے کلاس فیلو کو بتاتا ہے کہ ''اگر ہم اس لڑکی کو پاگل ہونے سے بچا سکے تو معجزہ ہوگا۔''

معاشرہ اور اس کے ٹھیکیدار بھی کیا چیز ہیں۔ دوسروں پر کوئی ''واقعہ'' وقوع پذیر ہوتا ہے۔ تو اس کو وہ رنگ برنگے شیشوں والی عینکوں سے دیکھتے ہیں۔ اور جب خدانخواستہ خود پر وہ واقعہ رونما ہو تو پھر ان کو دوسرے رنگ کی عینک سے دیکھتے ہیں۔ کہانی ''ہیر کا مقبرہ'' بھی ایسی ہی ایک داستان ہے۔ ایک ادیب ہیر کے مقبرے پر بیٹھ کر وہ عشق و محبت کی لافانی داستان قلم بند کرتا ہے۔ وہ کہانی ملک کے گوشے گوشے میں عوام و خواص میں یکساں مقبولیت پاتی ہے اور لازوال قرار دی جاتی ہے۔ ادیب کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ وہ ہیر کے مقبرے پر جا کر، چاہت کی دیوی کی قبر پر عقیدت کے پھول نچھاور کرنا چاہتا ہے۔ وہاں جاتا ہے حسن و عشق کے حسین جذبوں کے تاثر میں گم ہے کہ اس کو وہاں قریب سے کسی عورت اور مرد کی باتوں کی آواز سنائی دیتی ہے۔ جو ایسی ہی کوئی داستان رقم کرنے چلے ہیں۔ ادیب کو ان کی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ عورت گھر سے بھاگنے کی تیاری کر کے آئی ہے اور وہ شادی شدہ ہے۔ اُس کی نظر جب ان پر پڑتی ہے تو وہ دیکھتا ہے کہ عورت ایک جوان اور مردانہ وجاہت سے بھرپور مرد کے مضبوط بازوؤں کے حصار میں ایک سرمستی کی سی کیفیت میں سرشار ہے۔ دونوں چاہت کی دیوی کے مزار سے نکلتے ہیں، جہاں وہ شاید کوئی منت مانگنے آئے تھے۔ اور گھوڑے پر بیٹھ کر فرار ہو جاتے ہیں۔ ابھی تک ادیب اس نئی کہانی سے لطف اندوز ہو رہا ہے کہ کچھ ہی دیر بعد گاؤں کچھ کے لوگ اس طرف آتے ہیں جن کی باتوں سے ادیب کو اندازہ ہوتا ہے کہ محبوبہ تو بابے گاموں کی بہو تھی اور اس کا محبوب شیرا چمار تھا جو اسے بھگا کر لے گیا ہے۔ ادیب کے اندر کا عام انسان بیدار ہوگیا۔ کہاں تو وہ وہ عشق و محبت کے جذبے کو لافانی اور لازوال سمجھ رہا تھا اور کہاں یہ عالم کہ وہ بھی ہیر کو گالی دیتا ہوا بھاگنے والوں کا پیچھا کرنے والے گروہ میں شامل ہوگیا تا کہ ''محبت'' کے ان مجرموں کو قرار واقعی سزا دی جا سکے۔

''بھیڑیے''، ''وقار''، ''مصروفیت'' اور ''عورت'' یہ چاروں کہانیاں عورت کی فطرت کی بھرپور

عکاسی کرتی ہیں۔ "بھیڑیے" ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جو اپنے قبیلے کے رسم و رواج کی بھینٹ چڑھادی جاتی ہے۔ لڑکی اور لڑکا دونوں بچپن سے ایک ساتھ کھیل کود کر جوان ہوئے اور ایک دوسرے کو چاہنے لگے۔ اپنی اس چاہت میں انہوں نے اپنے گاؤں اور گاؤں والوں کی چاہت کو بھی یوں شامل کرنا چاہا کہ وہ اپنے گاؤں کو مثالی گاؤں بنانے کا خواب دیکھنے لگے۔ دونوں نے مل کر گاؤں کے بچوں کو تعلیم دینا شروع کر دی اور گاؤں کی صفائی پر زور دینے لگے۔ المیہ یہ تھا کہ اس لڑکی کی شادی قبیلے کے رسم و رواج کے مطابق اس کے محبوب (چچا زاد بھائی) سے نہیں ہو سکتی تھی۔ جب اس کے محبوب کو اس کے لیے بطور شوہر قبول نہیں کیا جاتا تو دونوں گھر سے بھاگ کر جنگل میں چھپ جاتے ہیں۔ تھوڑے ہی عرصے بعد وہ بخار میں مبتلا ہوتا ہے۔ علاج، آرام اور خوراک کی ناکافی سہولتوں کے باعث وہ مر جاتا ہے۔ عورت لاش چھپا کر اپنے گاؤں لاتی ہے اور اپنے کمرے میں دفن کر دیتی ہے۔ اس کے بعد اپنی بقیہ عمر اس کی قبر کے پاس بیٹھ کر محبوب کو یاد کرتے ہوئے گزار دیتی ہے۔ حکومت علاقے کی بہتری کے لیے ڈیم بنانے کا پروگرام بناتی ہے اور ڈیم کی وجہ سے گاؤں کے زیر آب آنے کا خدشہ ہوتا ہے تو عورت وہ گاؤں خالی کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔ اور جب اس کو بہت مجبور کیا جاتا ہے تو وہ محبوب کی قبر کے ساتھ قبر کھود کر خنجر گھونپ کر خود بھی مر جاتی ہے اور یوں محبت کی دنیا میں امر ہو جاتی ہے۔

"وقار" کہانی ہے معاشرے کے جھوٹے رسم و رواج کی۔ ایک بھرپور طمانچہ ہے اس جھوٹے وقار پر جس کی خاطر باپ جوان بیٹیوں کو بوڑھا کر دیتے ہیں کہ ان کے حسب و نسب کے مطابق رشتہ نہیں اور جوان بیٹیوں کو بوڑھوں کے ساتھ بیاہ دیتے ہیں۔

"عورت" کی کہانی میں یہ بتایا گیا ہے کہ عورت اپنی صلاحیتوں کی مدد سے ایک مرد کے مزاج پر کس کس طرح اثر انداز ہو سکتی ہے۔ کہاں تو گاؤں کا بگڑا ہوا آوارہ مزاج، ہر ایک کی پھٹکار سننے والا "نکھٹو" جو کسی طور، نہ پڑھنے کی طرف مائل ہوتا ہے اور نہ ہی مولوی صاحب کے پاس جاتا ہے۔ باپ کی مار، ماں کی گالیاں، بددعائیں غرضیکہ اس پر کسی چیز کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ لیکن ایک عورت کی خوبصورت آواز میں جب وہ سورہ رحمٰن کی تلاوت سنتا ہے تو اس پر اتنا اثر ہوتا ہے کہ اگلے ہی دن سب سے پہلے مولوی صاحب کے پاس پڑھنے پہنچ جاتا ہے۔

"معروفیت" میں عورت کی تخیلاتی حس کی عکاسی کی گئی ہے کہ کس طرح دو عورتوں کو آپس میں گفتگو کرتے ہوئے دور سے ہی دیکھ کر وہ ساری کہانی گھڑ لیتی ہیں یا اگر ان کو کسی عورت کی آنکھ میں آنسو نظر آ جائے تو اس آنسو کو دیکھ کر اس کی پیچھے ہونے والے جھگڑے کی وجہ، دوران لڑائی استعمال ہونے والے الفاظ، غرضیکہ اس جھگڑے کا انجام تک انہیں نظر آ جاتا ہے۔

رگِ سنگ 1969

''رگِ سنگ'' ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے۔ان کہانیوں کی اہمیت اس حوالے سے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ یہ جنگ ستمبر 1965 کے پس منظر میں لکھی گئی ہیں۔ان میں ایک طرف تو جنگ کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے،دوسری طرف انہوں نے اس دور کی تاریخ رقم کرنے والے مؤرخ کی بھی ضرور مدد کی ہے۔جنگ کے دوران قوم کے جذبے ان کہانیوں میں سٹ کر امر ہو گئے ہیں۔

''اوراق'' میں رگِ سنگ پر تبصرہ کرتے ہوئے اختر امان لکھتے ہیں:-

''مسعود مفتی کے افسانے خواہ جنگ کے بارے میں ہوں یا عام معاشرتی مسائل پر، دونوں میں ہلکا مزاح اور بھرپور طنز ایک پسندیدہ عنصر کی طرح شامل ہے۔ رگِ سنگ کے افسانوں میں آخر کے چند افسانے نئے پیمانے، راضی نامہ، بارش اور گنہگار سفارشی ٹائپ لوگوں، اپنے مفاد، اپنی غیرت کا سودا کرنے والے زمیندار، مذہبی تعصب اور اپنی جبلتوں کے آگے ہتھیار ڈالنے والے لوگوں کے افسانے ہیں۔یہ افسانے بے روح معاشرتی اقدار کی نشاندہی کرتے ہیں جہاں ''مصنوعی انسانوں'' کے چہروں پر معصومیتیں، زبانوں پر میٹھے الفاظ مگر سینے نفرت، عیاری اور مفاد پرستی کی آگ سے سلگ رہے ہیں۔مسعود مفتی نے ان کرداروں کو بڑے عمدہ انداز میں پیش کیا ہے۔''

اسی طرح نذیر قیصر نے رسالہ ''بازگشت'' جون جولائی 1970 کے شمارہ میں یوں تبصرہ کیا ہے:-

''اس کتاب کے افسانوں کی جو اہم ترین حقیقت ہے وہ فکری اور احساساتی ہم آہنگی کا بھرپور امتزاج ہے، ورنہ جنگ پر لکھی جانے والی اکثر تحریر فقط ظاہری مشاہدہ اور کسی حد تک فکری فضا سے بوجھل دکھائی دیتی ہیں۔ان تحریروں کی رگوں میں احساسات کا خون دوڑانا ایک سچے ادیب ہی کا کام ہے۔مسعود مفتی اس عہد کا وہ باشعور حساس ادیب ہے جس نے چھ ستمبر کی جنگ کو اپنے شعور اور احساس میں رچا بسا کر اسے اس انداز سے تخلیقی اظہار کا لباس پہنایا ہے کہ پڑھنے والا، اس فضا میں اپنے وجود کو اس طرح کھویا ہوا محسوس کرتا ہے جیسے کہ اُس نے اپنے آپ کو پالیا ہو۔''

1965 کی جنگ میں پاکستان ایک فاتح کی حیثیت سے ابھرا تھا۔1948 کی جنگ کے بعد یہ پہلی

بڑی جنگ تھی جو قیام پاکستان کے بعد لڑی گئی۔ ان دنوں عوام اور افواج دونوں کے حوصلے بلند تھے۔ افواج پاکستان نے میدان جنگ میں ناقابل یقین کارہائے نمایاں انجام دیے اور عوام نے ایثار و قربانی کی بہترین مثالیں پیش کیں۔ مسعود مفتی نے اپنے افسانوں کے ذریعے یہ واضح کیا ہے کہ 1965 کی جنگ نے کس طرح عوام کے منفی جذبات کو مثبت انداز فکر میں تبدیل کر دیا تھا۔ اور معاشرہ نئی اقدار سے ہم آہنگ ہوا۔ ہر فرد ''ذات'' کو بالائے طاق رکھ کر اپنے وطن اور اپنی زمین کے دفاع کے لیے سرگرم ہو گیا۔ ایسا ہی ایک افسانہ ''نیا آدمی'' ایک جرائم پیشہ شخص کی کہانی ہے جس میں وطن پر قربان ہونے کی خواہش جنم لیتی ہے۔

> ''عادی مجرم عمر میں پہلی دفعہ دنیا کو ایک نئے انداز میں دیکھنے لگا۔ اس کی ساری عمر حملے کرتے گزری۔ آج وہ مداخلت کرنا چاہتا تھا۔ اپنے لیے نہیں۔۔۔ بلکہ دوسروں کے لیے۔۔۔ ہم وطنوں کے لیے۔۔۔ قصور والوں کے لیے اور داتا کی نگری والوں کے لیے۔''

''بہادر'' میں ہلکے پھلکے مزاح کے ساتھ نفسیاتی دباؤ اور الجھنوں کو بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا ہے جن سے کوئی بھی فرد جنگ کے دوران دوچار ہو سکتا ہے۔

''اشرف المخلوقات'' ایک علامتی افسانہ ہے۔ ایک درخت جو امن، بھائی چارے، محبت، تخلیق اور فطرت کے نظام کی علامت ہے جس کے ارد گرد اور اندر ڈھیروں چرند، پرند بسیرا کرتے ہیں۔ اس کے نیچے ایک ہوادار غار ہے جہاں ایک آدمی اپنا فارغ وقت گزارنے آتا ہے۔ ایک ظالم شخص اس کا یہ آرام نہ دیکھ سکا اور اس نے درخت کو آگ لگا دی تاکہ درخت کو غار کے دہانے پر پھینک کر غار کے اندر لیٹنے والے آدمی کو مار ڈالے۔ اس طرح انہوں نے یہ ثابت کیا کہ ظلم اور جبر ہمیشہ فطرت کے نظام کی تباہی کا باعث بنتا ہے۔ اس کے علاوہ 'خط'، 'جغرافیے کا ماسٹر'، 'رضائی'، 'سپاہی' اور 'دو خون'، جنگ کے متعلق بہترین افسانے ہیں۔ 'جغرافیے کا ماسٹر' اور 'سپاہی' داخلی کشمکش کو پیش کرتے ہیں۔ 'رضائی' اور 'دو خون' کا موضوع ایک ہی ہے مگر نوعیت الگ الگ ہے۔

سالگرہ 1996

افسانوں کی ایک اور کتاب ''سالگرہ'' ہے۔ اس کتاب کا انتساب ''روایت کے جبر سے الجھنے والی سوچ کے نام'' ہے۔ پیش لفظ میں وہ یوں رقم طراز ہیں:-

> ''ایک مذہب وہ ہوتا ہے جو خدا اپنے پیغمبروں کے ذریعے اپنے بندوں تک

پہنچاتا ہے۔ اسے بے لوث تبلیغ اور خلوص عمل سے پھیلایا جاتا ہے مگر اس کی اصل
شکل تھوڑا ہی عرصہ قائم رہتی ہے۔
دوسرا مذہب وہ ہوتا ہے جو وقت گزرنے کے ساتھ مذہب کی اصل روح کو
روایت سے اس طرح ڈھانک دیتا ہے جیسے ریت کے تودے ہوتے ہیں۔
سیاسی اور روحانی پیشواؤں کی مشترکہ مصلحتیں ان تودوں کی شکلیں مسلسل بدلتی
رہتی ہیں۔ اس نقل کو جبر سے منوایا جاتا ہے۔
عام انسان کی ساری زندگی اصل کے نام پر نقل کی تعمیل کرنے میں گزرتی ہے۔
صرف چند لوگ یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ حقیقت کیا ہے اور اس کوشش
میں وہ عمر بھر بھوسے کے ڈھیر میں سے سوئی تلاش کرنے میں لگے رہتے ہیں۔"

اس مجموعے کی زیادہ تر کہانیاں ایسے ہی لوگوں کے متعلق ہیں جو بھوسے کے ڈھیر سے سوئی تلاش کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ افسانہ "سالگرہ" میں ایک ایسے شخص کی کہانی بیان کی گئی ہے جو اپنی عمر کا تین چوتھائی سفر مکمل کر چکا ہے۔ وہ سالگرہ کے دن بیوی بچوں کو باہر بھیج کر ماضی کو یاد کرتے ہوئے اپنا احتساب کرتا ہے۔ اسے اپنے گزشتہ تجربات و واقعات اور مختلف شخصیات یاد آتی ہیں، جن سے وہ کبھی متاثر ہوا تھا۔ اُسے معلوم ہے کہ کوئی بھی سفر جو تین چوتھائی گزر چکا ہو، اس کے آخری چوتھائی کا مطلب یہ ہے کہ سفر اب ختم ہونے کو ہے۔ مسافر کی ذہنی کیفیت بدل رہی ہے۔ وہ یادوں کے تجزیہ سے مجموعی نظریہ قائم کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مصنف اس سالگرہ کو لوگوں کے ہجوم میں نہیں بلکہ اکیلے اپنے کمرے میں بیٹھ کر منانا چاہتا ہے اس نے اپنے ماضی کو یاد کر کے جو نظریہ قائم کیا وہ یوں ہے:-

"اس تین چوتھائی زندگی کے دوران میں قریباً نصف دنیا گھوم چکا ہوں اور
دوسری کئی قوموں کی نظریاتی وردی دیکھ چکا ہوں۔ ہر ایک کا رنگ مختلف، تراش
مختلف بلکہ متضاد۔ کوئی ڈھیلی، کوئی چست، کوئی ناکافی، کوئی فالتو، کوئی آرائشی،
کوئی عملی۔ اور ہر کسی کو یقین کہ اس کی وردی یا تو خدا نے بنائی ہے یا اسے
اتارنے پر خدا ناخوش ہوگا۔ نہ جانے سچ کیا ہے۔"

اور یہ کہ:

"شاید ایک زندگی سچ جاننے کے لیے کافی نہیں۔ یہ اتنی مختصر ہے کہ ہم وسیع تر کائنات کی یہ سچائی جان ہی نہیں سکتے کہ خدا ہم سے کیا چاہتا ہے؟ اور کیسے خوش ہو سکتا ہے؟ خصوصاً جب ہم خود بھی مجرم ہیں اور اپنے یقین کی تنگ پگڈنڈی کو چھوڑ کر سوچ کی کھلی شاہراہ پر جانے کی جسارت نہیں کرتے۔"

1979 میں ملک میں مارشل لاء نافذ تھا۔ انہی دنوں مارشل لاء کے تحت جنرل ضیاء الحق نے ایک حکم جاری کیا کہ تمام دفاتر میں لازمی طور پر ظہر کی نماز با جماعت ادا کی جائے۔ افسانہ "شرمندہ" کا بنیادی خیال یہی حکم تھا۔ پاکستانیوں کی پہلی مارشل لاء کے تحت فرض کی ہوئی نماز کو خدا کے حضور بطور تحفہ پیش کرنے کا حکم جاری ہوا۔ حضرت جبرائیل یہ تحفہ لے کر بارگاہ خداوندی میں جا رہے تھے کہ ابلیس نے اپنی جیب سے چند دانے نکال کر تحفے کی ٹرے میں رکھ دیے۔ یہ دانے رشوت، بد دیانتی، ذخیرہ اندوزی، منافع، جھوٹی عدالتی شہادتیں، بے اتفاقیاں، اقربا پروری اور خوراک میں ملاوٹ کے تھے۔ پھر ابلیس آنکھ مار کر بولا۔ "پاکستان میں یہ بھی لازمی ہیں" جب یہ تحفہ بارگاہ الٰہی میں پہنچا تو حضرت جبرائیل شرم سے گڑ گئے کیونکہ ان تمام دانوں کی وجہ سے نماز میں اتنے سوراخ ہو چکے تھے کہ وہ چھلنی ہو کر رہ گئی تھی۔

افسانہ "چاند تارا" میں معاشرے کی برائیوں پر طنز کا بھرپور طمانچہ ہے۔ حکومت کی جانب سے کھمبے نصب کیے جاتے ہیں لیکن ہر مرحلے پر رشوت لی اور دی جاتی ہے۔ سامان تک سمگلنگ والا لیا جاتا ہے۔ نچلے طبقے سے لے کر افسر اعلیٰ تک سب نے فی سبیل اللہ کچھ نہ کچھ مال بٹورا اور جب یہ کھمبے نصب ہو گئے تو ان پر جھنڈے لہرا رہے تھے۔ اور ان تمام جھنڈوں پر چاند تارے کا اسلامی نشان نصب تھا۔ "احترام" اور "خدا کا نام" بھی دو مختصر افسانے ہیں۔ ان کا بنیادی خیال وہی جبر ہے جس سے یہ کتاب منسوب ہے۔

"احترام" میں بتایا گیا ہے کہ رمضان میں کس طرح زبردستی روزے کا احترام کرایا جاتا تھا۔ ایک کھلی دکان پر کھانے پینے کی اشیاء بکتی ہوئی دیکھ کر لوگوں کو غصہ آ گیا۔ ان کا مذہبی جوش کھولنے لگا۔ انہوں نے دکان کا مال اٹھا اٹھا کر باہر سڑک پر پھینکنا شروع کر دیا۔ دکان کی تباہی کے بعد دکاندار روتا پیٹتا ڈپٹی کمشنر کے پاس جاتا ہے۔ ڈپٹی کمشنر نے یہ کہہ کر ڈانٹ دیا کہ "جب تمہیں پتہ تھا کہ اس قسم کا حکم نافذ ہے تو تم نے دکان کیوں کھولی؟ اب شکایت کیوں کر رہے ہو؟" دکاندار جواب دیتا ہے:-

> "جناب میں تو صرف یہ بتانے آیا ہوں کہ جن لوگوں نے روزے کے احترام کرانے کے لیے میری دکان دوپہر کے وقت لوٹی، وہ وہیں بازار میں کھڑے کھڑے میرے کیک پیسٹری کھا رہے تھے حالانکہ افطاری میں ابھی کئی گھنٹے باقی تھے۔"

"خدا کا نام" ایک موذن کی کہانی ہے۔ جب وہ اذان دینے کے لیے چبوترے پر چڑھتا تو سامنے چوبارے کی کھڑکی میں اسے دوپٹے والا سر نظر آتا۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ صرف سر ہی نظر آتا اور وہ بھی چوٹی کی حد تک۔ باقی جسم اسے نظر نہ آتا کیونکہ چبوترہ نیچا تھا۔ اگر وہ تھوڑا اونچا ہوتا تو شاید موذن کی نظر سیر ہو جاتی۔ اس نے مولوی صاحب سے شکایت کی کہ اذان کی آواز دور دور تک نہیں جا سکتی کیونکہ چبوترہ

بہت نیچا ہے۔ چنانچہ اگلے جمعے کوئی جلدی جلدی سنتیں ادا کر کے بعد نمازیوں کے مسجد سے نکلنے سے پہلے ہی موذن دروازے میں تولیہ بچھا کر بیٹھ گیا اور کہنے لگا:۔

"دیتے جاؤ مسلمانو کچھ!۔۔۔ اذان والا چبوترہ اونچا کرنا ہے۔ خدا کا نام دور تک پہنچانا ہے۔"

"فرسٹ کلاس" افسانے میں انسانی نفسیات کے اس پہلو کی نشاندہی کی گئی ہے کہ ہر انسان فرسٹ کلاس میں رہنا چاہتا ہے۔ اور اگر وہ اس کلاس سے تعلق نہیں رکھتا تو جب بھی اس کو موقع ملتا ہے وہ اس میں داخل ہو جاتا ہے یا داخل ہونے کی کوشش ضرور کرتا ہے۔ یہ کہانی 'لزا اور ڈک' محبت کرنے والے ایک جوڑے کی ہے۔ یہ یورپ سے اکٹھے دنیا کی سیر کو نکلے۔ ہوائی سفر میں کسی وجہ سے لزا کو جہاز کی اکانومی کلاس سے فرسٹ کلاس میں جانے کا موقع ملا۔ موقع کیا ملا کہ اس کے بعد حالات یوں بدل گئے کہ انجام کار ڈک سمندر میں ڈوب کر خودکشی کر لیتا ہے اور لزا ایک اجنبی جو بے حد امیر تھا، کے ساتھ اس کی لمبی چوڑی گاڑی میں بیٹھ کر چل دیتی ہے۔ اور مصنف یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ:۔

"تھوڑی دیر بعد جب غوطہ خور ڈک کی لاش کو تلاش کر رہے تھے تو یوں لگتا تھا کہ سمندر کے اوپر منڈلانے والی روح ابھی بھی مجھے بحث پر اکسا رہی ہے کیونکہ میں خود بخود اس سوچ میں دھنستا چلا جا رہا تھا کہ خدا کی دی ہوئی زندگی کو واپس کرنا مجبوری کا فعل ہے یا مختاری کا۔۔؟۔۔۔؟"

"عالمی بازار" ایک اور اچھوتے خیال کا افسانہ ہے اس کے ہیرو کو تھوڑی دیر کے لیے اگلے جہان کی سیر کرنے کا موقع ملتا ہے۔ جہاں پر اس کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ دنیا تو صرف ایک بازار ہے جس میں ہر وقت خرید و فروخت ہوتی رہتی ہے۔ اور ہر انسان کے گرد رنگوں کا ایک ہالہ سا رہتا ہے۔ ہر رنگ کا مطلب الگ ہے اور مختلف رنگوں سے ہر انسان کی الگ الگ شناخت کی جا سکتی ہے۔ بہت کم لوگ ایسے ہیں جن کے گرد کوئی ہالہ نہیں اور یہ وہ لوگ ہیں جو اس مادی دنیا میں خود بکتے ہیں، نہ دوسروں کو خریدتے ہیں اور نہ ہی کچھ بیچتے ہیں۔ باقی تقریباً سبھی لوگ بک رہے ہیں یا خریدار ہیں ،ایمان کے، ضمیر کے، وفا کے، محبت کے۔ اس دوران افسانے کے ہیرو کو واپس مادی دنیا میں بھیج دیا جاتا ہے۔ لیکن اب اس کو یہ مسئلہ درپیش ہے کہ وہ ہر وقت ایسے انسانوں کی تلاش میں رہتا ہے جن کے گرد کوئی ہالہ نہ ہو۔ اور یوں باقی لوگ اس کو پاگل سمجھتے ہیں۔

سالگرہ کے دو افسانے "پھانسی" اور "انصاف" ہیں جن کو بعد میں ڈراموں کے قالب میں ڈھالا گیا (بہ عنوان 'گڑھے' اور 'گھگھلک') یہ کہانیاں قاری کو سوچ اور فکر کے نئے زاویے عطا کرتی ہیں۔

ریزے ان افسانوں پر مشتمل ہے جو مشرقی پاکستان کے پس منظر میں لکھے گئے۔ اس میں نئی بات یہ ہے کہ اس کا انتساب جبر کے نام نہیں بلکہ ان کی بیگم کے نام ہے۔ یہ کتاب قومی ادب شمار کی جاتی ہے۔ ریزے میں مسعود مفتی کا فن پختگی کی منزل پر ہے اور تمام افسانے تاثر سے بھرپور ہیں۔ پیش لفظ میں مصنف لکھتا ہے:-

"جو حقائق کے متعلق لکھتا ہے وہ مؤرخ ہے۔ جو حقائق کو انسانوں سے ملاتا ہے وہ صحافی ہے اور جو حقائق، انسان اور انسانی جذبات کو ملاتا ہے وہ ادیب ہے۔"

مسعود مفتی نے 'ریزے' میں خوبصورت جذبات نگاری کی۔ کردار اور پلاٹ البتہ فرضی ہیں۔ ریزے کی ایک کہانی کا "International Cultural Exchange" نے اپنے ایڈیشن Short Story International میں انگریزی ترجمہ Good Luck کے عنوان سے جون 1965ء میں شائع کیا ہے۔ یہ رسالہ امریکہ میں شائع ہوتا ہے۔

بقول مسعود مفتی:-

"ان افسانوں میں ماحول کی تمام جزئیات حقیقی ہیں۔ کردار اور پلاٹ البتہ فنی ضروریات کے تحت فرضی تراشے گئے ہیں۔"

پہلا افسانہ 'خوش قسمتی' ایک ایسی بنگالی رقاصہ کی کہانی ہے جو اپنے فن میں اس قدر یکتا تھی کہ لوگ اس کا رقص دیکھ کر مبہوت ہو جایا کرتے تھے۔ مشرقی پاکستان میں وہ ٹیلی ویژن پر ناسازگار حالات میں بھی پروگرام کرتی ہے۔ ان دنوں بنگالی اس خوف سے ٹیلی ویژن جانا چھوڑ چکے تھے کہ مستقبل میں مکتی باہنی کے عذاب کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اس لڑکی کو بھی مشورہ دیا گیا کہ چند روز وہ گھر سے باہر نہ نکلے۔ لیکن اس کا جواب یہ تھا "میں ملک کو اس نازک وقت میں چھوڑنا نہیں چاہتی اور پھر میری ذاتی مشکلات بھی ہیں، گھر والوں کا دارومدار ٹیلی ویژن کی آمدنی پر ہے۔ آٹھ بہن بھائی مجھ سے چھوٹے ہیں اور کمانے والی صرف میں ہوں۔" بنگلہ دیش بننے کے اگلے ہی دن اسے گرفتار کر لیا گیا تھا۔ خیال تھا کہ مغربی پاکستان سے تعاون پر مقدمہ چلے مگر وہ کسی سیاستدان کو پسند آ گئی۔ چند روز اپنے گھر میں رکھ کر عیش کی جب دل بھر گیا تو کسی بہانے چھوڑنا چاہا مگر مکتی باہنی والوں کو خبر ہو گئی۔ کچھ سیاستدان کا رسوخ چلا اور کچھ مکتی باہنی کی مرضی۔ اسے یہ سزا دی گئی کہ اس کے پاؤں کی انگلیاں کاٹ دی گئیں کیونکہ وہ مغربی پاکستان کی خدمت اور حمایت میں رقص کرتی رہی ہے۔ اب وہ خاندان کی کفالت

کے لیے فن کی بجائے جسم فروشی کرنے لگی۔

دوسرا افسانہ 'جال' مغربی پاکستان کے فوجیوں کی نفسیات کا بیان ہے۔ قدم قدم پر شک کے مہیب سائے۔ ایسے میں چھوٹی سی بات بھی بہت بڑے طوفان کا پیش خیمہ بن سکتی ہے۔ ایک کیپٹن جو ایسے ہی حالات سے دوچار تھا، ایک لڑائی میں مکتی باہنی والوں نے اسے اغوا کر کے قید کر لیا۔ چند دن ان کی قید میں رہا پھر پاکستانی فوج نے اسے رہا کرا لیا مگر اس حالت میں کہ اس کے ہاتھ پاؤں رسی سے بندھے ہوئے تھے۔ وہ درخت سے بندھا ہوا تھا اور اس کے منہ میں کپڑا ٹھونسا ہوا تھا۔۔۔ بعد میں اس نے بتایا کہ وہ تین دن سے ان کی قید میں تھا۔۔۔ سخت ذہنی صدمے کی حالت میں۔۔۔ اور ایسا ہوتا ہی ہے۔۔۔ ہاتھ پاؤں بندھے ہوں۔۔۔ پاکستانی فوج کی شکست کو وہ تسلیم نہیں کرتا۔ وہ کہتا تھا کہ "بھلا نوے ہزار 90,000 کے لگ بھگ فوج کس طرح اتنی آسانی سے ہتھیار ڈال سکتی ہے۔ کیا ہم ڈھاکہ کے گلی کوچوں میں اسٹالن گراڈ جیسی جنگ کے بغیر ہتھیار ڈال دیں گے۔" مارچ 1971 کے بعد مشرقی پاکستان کی ساری فضا ہی ایسی ہو گئی تھی جس میں صرف وہم پلتا ہے۔ جہاں آدمی کو بالکل پتہ نہ ہو کہ کس وقت کس طرف سے حملہ ہو جائے۔ ایک طرف خارجی واقعات اور دوسری طرف ذہنی کیفیت۔ یہ دونوں مل کر ایسا پیچیدہ جال بُن دیتے ہیں جس سے نکلنے کے لیے انسان ہاتھ پاؤں مارتا رہتا ہے لیکن نکل نہیں سکتا۔ انجام کار کپتان برستی گولیوں کی بوچھاڑ میں کھڑا ہو کر ہر وہم سے آزاد ہو جاتا ہے۔

افسانہ 'صدیوں پار' ایک ایسے تاجر کی کہانی ہے جس کو مسجدوں کے میناروں سے ایک خاص جذباتی وابستگی تھی۔ 1947 میں وہ جان بچا کر سرحد پر پہنچا تو سرحدی گاؤں کی مسجد کے مینار امن و عافیت کی علامت کے طور پر اس کے ذہن کے کسی گوشے میں محفوظ ہو گئے تھے۔ دفتر کی کھڑکی بیت المکرم کی طرف کھلتی تھی وہ گھنٹوں اس میں کھڑے ہو کر مسجد کو دیکھتا رہتا۔ اب جبکہ وہ ہر نماز بیت المکرم میں ادا کرنے لگا تو اچانک حالات میں آندھیاں چلنا شروع ہو گئیں۔ پلٹن میدان میں ایک نئی تعمیر نظر آنے لگی۔ نفرت کے میناروں کی تعمیر۔۔۔ اینٹ گارے کے نہیں۔۔۔ بلکہ۔۔۔ جذبات اور جوش کے۔۔۔ اور پھر ان کی تعمیر اتنی تیز ہو گئی کہ ان کی اونچائی بیت المکرم کی چھت سے بھی اوپر نکل گئی۔ 1971 میں دوبارہ اس کا خاندان میمن سنگھ میں قتل عام کا شکار ہوتا اور ساتھ ہی اس پر انکشاف ہوا کہ بیت المکرم کی عظیم الشان عمارت کے ڈیزائن میں کوئی مینار ہی نہ تھا۔

'سپنا' اس مجموعے میں سب سے زیادہ متاثر کن افسانہ ہے۔ ایک عورت، جس کے خاوند کو ہنگاموں میں قتل کر دیا گیا، جب اور کوئی روزگار نہ ملا تو اپنے خاندان کی کفالت کے لیے جسم بیچنے پر مجبور ہو گئی۔ فسادات میں اس کا خاندان کہیں اور پناہ گزیں ہوا اور اس کے گھر پر ایک بنگالی قابض ہو گیا۔ اتفاق سے اسی بنگالی نے اسے ایک رات کے لیے خریدا اور اب وہ اپنے ہی گھر میں ایک خاتون خانہ نہیں بلکہ

جسم فروش بن کر آتی ہے تو شدت جذبات سے رونے لگ جاتی ہے۔ بنگالی نے جب ہمدردی کی تو اپنے حالات بتا کر اس نے درخواست کی کہ وہ ہر مہینے کی پہلی رات کو اسے اس گھر میں آنے دے۔ چنانچہ وہ اگلے مہینے اپنے ساتھ سبزی کا تھیلا لے کر آئی۔ کھانا پکایا، خود اپنے ہاتھوں سے بنگالی کو کھلایا اور اس سے درخواست کی کہ وہ جذباتی لمحوں میں بولا نہ کرے۔ کہنے لگی "بابو جتنی باتیں کرنا ہوتی ہیں مجھ سے پہلے کرلیا کرو مگر۔۔۔ بیچ میں نہ بولا کرو۔" وہ ان لمحوں میں بنگالی کو اپنا خاوند سمجھتی ہے اور ٹوٹ کر پیار کرتی ہے، اس سے درخواست کرتی ہے کہ وہ بول کر اس کا سپنا نہ توڑا کرے۔ بنگالی اس بات کو سمجھ نہ سکا اور ایک رات بنگالی کا خون کر کے وہ اطمینان سے سو جاتی ہے جیسے کوئی اپنے گھر میں ہو۔

'امید' جنگی قیدیوں کی کہانی ہے جنہیں کھانے میں ارہر کی دال یا گھاس نما سالن جسے ہندوستانی پہرے دار ساگ کہتے تھے، ملا کرتا۔ ایک برائے نام ہسپتال تھا جہاں کھڑکیوں پر سلاخیں تو تھیں مگر شیشے یا جالیاں نہ تھیں جس کی وجہ سے ہوا کے جھونکے، مچھر، مکھیاں، بلیاں چوہے وغیرہ بہت آزادی سے آ جا سکتے تھے۔ اور "نرسوں کی بجائے باوردی فوجی گھومتے پھرتے تھے اور ڈاکٹر اس وقت نظر آتے تھے جب ان کی خاص ضرورت محسوس نہ ہوتی تھی۔ مگر جب کسی مریض کی طبیعت زیادہ بگڑتی تو ڈاکٹر ناپید ہو جاتا۔ وہاں صرف دو دوائیاں ملتی تھیں۔ ایک اسپرو جو دن کو ملتی تھی۔ اور دوسری نیند کی گولی جو رات کو ملتی۔ دن کو اگر تکلیف زیادہ ہوتی تو بھی نیند کی گولی دے کر سلا دیا جاتا۔"

ان حالات میں مریض ایک دوسرے کو حوصلہ دیتے، فرضی تسلیاں دیتے۔ وہ جو کچھ بہتر حالت میں تھے وہ زیادہ بیمار قیدیوں کی تیمارداری بھی کرتے۔ ایک دن ریڈیو پر انہوں نے سنا کہ بیمار جنگی قیدیوں کو واپس بھیجا جا رہا ہے۔ اب ان کو امید لگ گئی۔ صرف دو لیکن تندرست آدمیوں کو رہا کر دیا گیا اور ریڈیو پر یہ تبصرہ تھا کہ:-

> "جب پاکستانی جنگی قیدیوں میں سے زخمی اور مریض لاہور کے ہوائی اڈے پر اترے تو وہ سب اتنی اچھی حالت میں اور اتنے چاق و چوبند تھے کہ دنیا بھر کو یقین آ گیا کہ ہندوستان کی حکومت نے جنگی قیدیوں کی بالعموم اور مریضوں کی بالخصوص اتنی عمدہ دیکھ بھال کی ہے کہ حالیہ جنگوں کی تواریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔"

اور۔۔۔ وارڈ میں سب مریض دم بخود تھے۔۔۔۔

'کفارہ' بھی ایک مریض جنگی قیدی کی کہانی ہے۔ بیماری کی وجہ سے ڈیڑھ برس کے بعد پہلی دفعہ اسے اپنے کیمپ، جسے اصطلاح عام میں کیج (Cage) یعنی پنجرہ کہتے تھے، سے باہر ایک بڑے ہسپتال میں لے جایا گیا۔ اس قیدی کو عرصہ بعد نسوانی جلوہ آرائی دیکھنے کو ملی۔ چنانچہ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر انہیں

دیکھنے لگا۔ یہ سوچ کر، کہ دشمن نے غیر اخلاقی اور غیر قانونی طور پر ہمیں قید کر کے بیوی بچوں سے جدا کیا ہوا ہے تو ہم ان کی عورتوں کو دیکھنے سے کیوں شرمائیں۔ دوسری طرف ایک ہندو لڑکی جس کا باپ دوسری جنگ عظیم میں قیدی ہوا اور دوران قید مر گیا۔ وہ بھی ہسپتال میں اپنے بچے کو لے کر آئی ہوئی تھی اس لڑکی کے باپ کا ایک ساتھی جو جنگ کے بعد رہا ہو کر واپس آیا، اس نے بتایا کہ اس کا باپ بیماری میں فوت ہوا تھا وہ بیوی اور بیٹی کو بیماری کے دنوں میں بہت یاد کرتا تھا۔ اگر اسے بروقت علاج اور مناسب تیمارداری ہوتی تو بچ سکتا تھا، اس لئے اس لڑکی کو جنگی قیدیوں سے خاص ہمدردی ہوتی ہے۔ اس نے جب پاکستانی جنگی قیدی کی آنکھوں میں محرومی اور بھوک دیکھی تو بچے کو دودھ پلاتے پلاتے اس نے ساڑھی کا پلو سامنے سے ہٹا دیا۔ قیدی نے حیران ہو کر عورت کے چہرے کی طرف دیکھا تو اس نے کچھ اس انداز میں بغیر پشیمانی کے اسے دیکھا:

''اس کی نظر میں دعوت نہ تھی۔۔۔ شہوت نہ تھی۔۔۔ لگاوٹ نہ تھی۔۔۔ پیار نہ تھا۔۔۔ البتہ ہمدردی کا رنگ کچھ حد تک چھلک رہا تھا۔۔۔ صرف ہمدردی۔''

''نیند'' ایک مختصر لیکن بہت خوبصورت افسانہ ہے۔ ایک مغربی پاکستانی کو تنگ کرنے کے لیے چند لڑکوں نے پروگرام بنایا کہ اسے مغربی پاکستانی ہونے کی سزا دی جائے۔ چنانچہ وہ گروپ بنا کر ساری ساری رات اس کے گھر کے باہر نعرے لگاتے'' جئے بنگلہ۔۔۔ مجیب زندہ باد۔'' مسلسل تین راتوں تک وہ ٹولیوں کی صورت میں آتے رہے۔ ایک ٹولی آتی، تھوڑی دیر کے بعد دوسری، اس طرح وہ بے چارہ مسلسل جاگتا رہا۔ چوتھی رات انہوں نے نعروں کے ساتھ دروازہ بھی پیٹنا شروع کر دیا کہ یہ نعرہ لگاؤ تو جائیں گے۔ چار راتوں کے جگ رتے کے بعد پانچویں رات جب اس کے دروازے ہوئی تو اس نے نیند کے غلبہ میں کھڑکی میں سے منہ نکال کر نعرہ لگایا'' جئے بنگلہ''، ہجوم منتشر ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد جب دوبارہ دستک ہوئی تو چونکہ یہ جگ رتے کے بعد سونے کی کوشش کر رہا تھا اس نے پھر نعرہ لگا دیا'' جئے بنگلہ'' لیکن یہ پچیس مارچ کی رات تھی۔۔۔ فوجی ایکشن کی رات۔۔۔ اور یہ دستک فوجی ٹولی نے دی تھی۔ جئے بنگلہ کا نعرہ سننے کے بعد انچارج نے ایک فوجی کو اشارہ کیا جس نے سٹین گن سے شیشہ توڑا اور فائر کر دیا۔ نیند کا مارا لحہ بھر کو چارپائی پر اچھلا۔۔۔ تڑپا۔۔۔ اور پھر دائمی نیند سو گیا۔

'تشنگی' بھی انہی حالات کی تصویر پیش کرتا ہے۔ بنگلہ دیش بنے تین دن ہو چکے تھے۔ ندی کے اندر لاشیں بہہ بہہ کر آ رہی تھیں۔ چند لڑکوں کا یہ شغل بن گیا کہ وہ پُل پر سے بہتی ہوئی لاشیں دیکھتے، نہر کے ساتھ ساتھ بھاگ کر وہ نظارہ کرتے۔ یہ تماشا دیکھتے دیکھتے ایک لڑکے کی تشنگی اس حد تک بڑھی کہ اس نے ریلنگ پر جھکی ہوئی عورت کے پیچھے جا کر اپنا چاقو اس کی کمر میں گھسو دیا۔ پھر جلدی سے اس کی دونوں ٹانگیں اٹھا کر اسے ندی میں لڑھکا دیا۔ ایک ادھ کھلی چیخ اور پھر پانی میں گرنے کا دھماکہ۔ اس نے مرتی

ہوئی عورت کے سر پر پتھروں کی بوچھاڑ کردی۔ لیکن اس کے جسم میں گھومنے والے تشنگی کے مرغولے تیز سے تیز تر ہونے لگے۔

'ناگفتنی' ایک ایسے بہاری کی کہانی ہے جس کے والدین صوبہ بہار کے فسادات میں مارے گئے۔ پاکستان بننے کے بعد زبان کے مسئلے پر ہونے والے فسادات میں بھائی مارا گیا۔ ایک بہاری لڑکی سے اسے عشق ہوا اور وہ گھر بنانے کا خواب دیکھنے لگا۔ مارچ، اپریل میں جب بہاریوں کا قتل عام ہوا تو وہ بھی ماری گئی۔ فروری 1972 میں بنگلہ دیش بننے کے بعد وہ خود بھی مارا گیا۔ اور۔۔۔

> ''ایک گندے نالے کے کنارے اس کی لاش پڑی تھی۔ ایک پاؤں کو کتا چاٹ رہا تھا۔۔۔ پیٹ پر کوے بیٹھے ٹھونگے مار رہے تھے۔۔۔ ایک چیل اس کی انتڑی کھینچ کر پاس بیٹھی تھی۔۔۔ اس کی کھلی آنکھیں آسمان کو دیکھ رہی تھیں اور بے نور نظریں عرش سے ٹکرا کر اپنے بنانے والے سے کتنے ہی سوالات پوچھ رہی تھیں۔''

افسانہ ''باغی'' بھی ابتر حالات کی تصویر ہے۔ آخری افسانہ 'دسمبر 1971' وہ ڈرامہ ہے جو مسعود مفتی نے قید سے واپس آنے کے بعد لکھا تو ٹیلی ویژن کی فرمائش پر تھا لیکن کسی وجہ سے ٹیلی ویژن والے اسے پیش نہ کر سکے چنانچہ انہوں نے واپس منگوا لیا۔

توبہ 1996

'توبہ' مسعود مفتی کی تازہ ترین کتاب ہے جسے سنگ میل پبلی کیشنز نے 2006 میں شائع کیا ہے۔ مرکزی خیال تو فرد اور اس پر ہونے والا جبر ہی ہے لیکن ایک نئی بات یہ ہے کہ اس میں انہوں نے عام آدمی کے ساتھ خاص آدمی پر بھی لکھا ہے۔ یوں ان کی سوچ میں ایک واضح فرق سامنے آتا ہے۔ پیش لفظ میں وہ فرماتے ہیں:-

''زندگی مشکل ہے۔۔ چاہے وہ شاہ کی ہو۔۔ یا گدا کی۔۔ ہر روگ کے اپنے رنگ ہیں۔ مگر یہ نہیں کھلتا کہ زندگی کو مشکل کون بناتا ہے؟؟؟۔۔۔ خدا کا لوح محفوظ؟؟۔۔ مذہب کے ٹھیکیدار؟۔۔ ناہموار سماجی نظام؟۔۔۔ بُرے حاکم۔۔ اقتدار، قانون اور انصاف کی پامالی؟۔۔۔ دوسرے لوگ؟۔۔ یا ہم خود؟۔۔۔''

''توبہ'' ایک جاگیردار اور ٹک زیب کی کہانی ہے۔ جاگیرداروں والے باقی سارے شوق رکھنے کے ساتھ وہ عورتوں کا بھی شوقین تھا اس کا خیال تھا کہ:-

"رنڈی بازی" تو کھاتے پیتے زمین داروں کا کلچر ہے۔ اسے کوئی بُرا نہیں کہتا۔
ان عورتوں کی زندگی کو روزی مل جاتی ہے اور ہماری زندگی کو رنگ۔ ان کی بنیادی
ضرورت ہمارا ثانوی شغل۔ اس سے زیادہ تو کچھ نہیں نا اس میں۔"

اختری بائی، جس سے ماضی میں سردار صاحب کے تعلقات رہے ہیں، کو جب معلوم ہوتا ہے کہ سردار اور نگ زیب حج پر جارہا ہے تو بضد ہوگئی کہ وہ بھی جائے گی۔ جب سردار نے مذاق اڑایا تو کہنے لگی:۔

"کیوں اگر تم کر سکتے ہو تو میں کیوں نہیں کر سکتی۔ جو بُرا کام میں نے کیا ہے وہی
تم نے بھی تو کیا ہے۔"

اور جب سردار کسی طرح راضی نہیں ہوتا تو یہ کہہ کر کہ "ہر وقت بددعا کروں گی کہ تمہارا حج بھی قبول نہ ہو۔" سردار اورنگ زیب کو مجبور کر دیتی ہے کہ اس کو بھی ساتھ لے جائے۔ چنانچہ وہ اس کو ساتھ لے جاتا ہے لیکن مکہ میں اس کو الگ رہائش لے کر دیتا ہے۔ اختری بائی وہاں جا کر اس جذب و شوق سے مناسک حج ادا کرتی ہے کہ سب اسے "اللہ والی" کے نام سے پکارتے ہیں۔ حج ختم ہونے پر وہ ضد کرتی ہے کہ وہ مکہ میں ہی رہے گی لیکن اس کا کسی طور بندوبست نہیں ہو سکتا۔ سردار ایک حادثے میں فوت ہو جاتا ہے اور اسے وہیں دفن کر دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد اختر بائی نہایت بے چینی سے ہر جاننے والے سے درخواست کرتی ہے کہ اس کے وہیں رہنے کا بندوبست کر دیں، لیکن قوانین اتنے سخت ہیں کہ مایوس ہو کر خودکشی کر لیتی ہے اور یوں اس کی مکہ میں دفن ہونے کی خواہش پوری ہو جاتی ہے۔ کہانی کے ایک کردار کو مسجد نبوی میں عبادت کے دوران سردار خواب میں آتا ہے اور کہتا ہے کہ "اس کی باری تو نہ تھی لیکن اچانک مجھے جانے کا حکم مل گیا۔۔۔ اختری کو یہاں رہنے کا طریقہ سمجھانے کے لیے۔۔۔"

'شناخت' کہانی ہے ان افراد کی جو بہتر مستقبل کی خاطر مغرب کا رُخ کرتے ہیں۔ وہاں کی آسودگی سے متاثر ہو کر وہیں کے ہو رہتے ہیں، وہیں شادی کرتے ہیں اور اپنے ان بچوں کی پرورش کرتے ہیں۔ جو ماں اور اس کے طرز معاشرت سے تو آگاہ ہیں لیکن باپ کی صرف انفرادی حیثیت سے ہی واقف ہیں۔ خالد ایسا ہی ایک لڑکا ہے جو ایک امریکی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اس کے والدین اجازت نہیں دیتے۔ وہ اپنے دوست سے گلہ کرتا ہے کہ آخر وہ سمجھتے کیوں نہیں کہ مجھے محبت ہوگئی ہے۔ دوست ہنس کر جواب دیتا ہے۔

"وہ کیسے سمجھیں۔ تمہاری جوانی امریکہ کی یونیورسٹی میں طلوع ہوئی اور وہ
بچپن میں لاہور کے سکولوں میں تحریک خلافت کے قصے پڑھتے رہے پھر
تحریک پاکستان کے جلوسوں کو دیکھتے رہے۔ باقی ماندہ زندگی ایسے پاکستان میں
گزاری جہاں اسلام اور عیسائیت کا ذکر صلیبی جنگوں کے حوالے سے ہوتا تھا۔

وہ تمہاری غیر مذہبی اور بین الاقوامی محبت کو کیسے سمجھ سکتے ہیں۔"

خالد شادی کر لیتا ہے۔ سلیم نے بیٹے کی سالگرہ اور بسم اللہ اکٹھی کی۔ اور تصویریں اپنے والدین کو بھیجیں۔ وہ تصویریں اتفاق سے خالد کے والدین نے بھی دیکھ لیں اور ان کے پرانے زخم نئی شدت سے تازہ ہو گئے۔ مگر خالد کو جائیداد سے عاق کرنے کے بعد برسوں کے ضبط نے اپنے جذبات کا گلا گھونٹنا خوب سکھا دیا تھا اور وہ چپ سادھے یہی سوچتے رہے کہ انہوں نے اپنے دو پوتوں اور ایک پوتی کی نہ شکل دیکھی نہ تصویر۔ نہ معلوم خدا ہمیں کس جرم کی سزا دے رہا ہے۔ مگر خدا مسکرا رہا تھا کہ ہم تو تمہیں سزا سے بچا رہے ہیں، کیونکہ ان بچوں کا تہذیبی رنگ شاید تمہاری برداشت سے باہر ہوتا۔۔۔ جب سے خالد نے اپنی پاکستانی شناخت انسانیت کے رومانوی تصور میں غرق کر دی تھی تب سے امریکن ماں کے آزاد منش بچوں کو امریکن ماحول نے پورا نگل لیا تھا۔

خانہ، خالی را دیو می گیرد

11 ستمبر کا واقعہ ہوتا ہے۔ ایک دن خالد کے دوست کو نماز پڑھتے دیکھ کر انگریز لڑکے گھیر لیتے ہیں۔ خالد بڑی مشکل سے اس کو تو بچا لیتا ہے لیکن اپنے اندر ہونے والی توڑ پھوڑ سے خود نہ بچ سکا۔ پاکستان جانے کا ارادہ کرتا ہے۔ بستر مرگ پر پڑا والد اس خوشی کو نہ سہہ سکا۔ اس کے مرنے کے بعد خالد اور بکھر گیا۔ واپس امریکہ گیا جہاں ایک دن اس کی بچی اپنے دادا کی تصویر کے سامنے صلیب کا نشان اور بائبل رکھ کر گانا گانے لگی اور بتایا کہ سکول میں وہ اسی طرح امریکہ کے بڑے لوگوں کی یاد مناتے ہیں۔ بچوں کے جانے کے بعد وسکی لے کر والد کی تصویر کے سامنے بیٹھ گیا۔ اندر کی توڑ پھوڑ برداشت نہ کر سکا، وسکی بھی کام نہ آئی اور بے ہوش ہو گیا۔ ہوش آنے کے بعد۔۔۔ بے دھیانی سے مسجد کی طرف چل پڑا۔ یوں شناخت مکمل ہوئی۔

" سالانہ ڈنر" عورت کی ہوشیار فطرت کا منہ بولتا شہکار ہے۔ کس طرح اونچی سوسائٹی کی ایک عورت ہر سال گھر پر ڈنر کے لیے بیس پچیس جوڑوں کو مدعو کرتی۔ چاند کی چودھویں رات، بہار کا موسم، خوبصورت لان، بے حد نفیس بندوبست، پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو، زرق برق ملبوسات میں سجی ہوئی خواتین۔ غرضیکہ سب ہی کو اس ڈنر کا انتظار رہتا۔ خاتون خانہ ہر میز کو ناموں کے کارڈ کے ساتھ مخصوص کرتی۔ ہر دفعہ اس کی اپنی میز پر بیٹھنے والے مہمانوں کی فہرست بھی تبدیل ہوتی۔ 'جاوید' ایسے ہی ایک ڈنر میں میزبانوں کے ساتھ ان کی میز پر بیٹھا۔ چنگی یعنی میزبان خاتون کھانے کے دوران اپنے پاؤں کی مدد سے جاوید کے پاؤں سے شناسائی کا آغاز کرتی ہے اور ذومعنی جملوں سے اس کو ترغیب دلاتی ہے۔ دونوں ملنے ملانے کی حدوں کو عبور کر گئے۔ جاوید کو گویا جنت مل گئی۔ دونوں ملاقات کا وقت طے کرتے، ملتے، اپنے گھروں کو چل دیتے۔ سال گزر جاتا ہے۔ اگلے سال کے ڈنر میں جاوید کی جگہ کوئی اور بیٹھتا

ہے جس کا جاوید کو دکھ ہے۔ وہ گلہ کرتا ہے تو پنکی کہنے لگی "تمہاری کوئی حق تلفی نہیں ہوئی جاوید۔۔۔ ہر دفعہ یہ معاہدہ صرف سال بھر کا ہی ہوتا ہے۔" یہ ہے ہمارے معاشرے کے اونچے طبقے کا کلچر۔

'گواہی' کہانی ہے دو سول افسروں کی جس میں سے ایک نہایت ایماندار، قانون کا وفادار ہے جبکہ دوسرے کی نظر میں وفاداری صرف حاکم کی ضروری ہے۔ پہلا ریٹائرمنٹ کی عمر سے دو سال پہلے ہی فارغ کر دیا جاتا ہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد، دل کا مریض بنتا ہے۔ اس کی مالی مدد کی درخواست کے جواب میں سرکار سے معذرت ملتی ہے۔ گھر کا تمام سامان ایک ایک کر کے بک جاتا ہے۔ کسمپرسی کے عالم میں اس کا انتقال ہو جاتا ہے۔ دوسرا افسر ترقی کے زینے طے کرنے کے ساتھ معاشی طور پر بھی انتہائی خوشحال ہو جاتا ہے۔ نوکری میں طوالت اور وسعت حاصل کرتا ہے۔ اچانک ایک دن دفتر میں بیٹھے بیٹھے دل کے جاں لیوا درد کا شکار ہوتا ہے اور فوت ہو جاتا ہے۔ دونوں اسلام آباد میں دفن ہیں یوں ایمانداری کا مجسمہ اور بے ایمانی کا ماہر ایک ہی قبرستان میں مقیم ہیں بقول مصنف:۔

"ویسے تو ہر قبرستان مقام عبرت ہوتا ہے مگر راولپنڈی، اسلام آباد کے قبرستانوں کا درجہ عبرت کے معاملے میں بہت بلند ہے۔ کیونکہ یہاں ذات اور اقتدار کی اندھی دوڑ میں بے دم ہونے والے اب زمین کے نیچے سانس روکے پڑے ہیں۔۔۔ ہوا ساکن تھی۔۔۔ شہر خموشاں خاموش تر تھا۔۔۔ مگر نہ معلوم کیوں، قریشی صاحب کی درمیانی کیاری میں پھولوں کا نکھار قبرستان کے دیگر پھولوں سے مختلف لگ رہا تھا۔"

اور یہی پھول قریشی صاحب کی بے داغ اور ایماندار زندگی کی گواہی پیش کر رہے تھے۔

'میکدہ' اور 'نابینا' دونوں کہانیاں جدید طرز معاشرت اور اس کے پیدا کردہ مسائل سے متعلق ہیں۔

'میکدہ' کہانی ہے دو ایسے جوڑوں کی جن میں سے ایک آدمی اپنی محبوبہ کو نہ پا کر شادی نہ کرنے کا عہد کرتا ہے۔ محبوبہ خاندانی دباؤ کی وجہ سے اپنے بہنوئی سے جو عمر میں اس سے بہت بڑا ہے شادی کرنے پر مجبور ہے کیونکہ اس کی بہن چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ کر فوت ہو چکی ہے۔ بہنوئی، پہلی بیوی کی زندگی میں ہی اس کی سہیلی سے عشق کرتا ہے۔ تعلق پیدا کرتا ہے۔ یہ سہیلی بھی شادی شدہ ہے۔ یہ ہیں ہمارے جھوٹے معاشرے کی بکھرتی اور ٹوٹتی ہوئی اخلاقی قدریں۔ ایک دن صبح کے وقت میاں اپنی دوست کے ساتھ، بیوی اپنے سابقہ منگیتر، جس نے ابھی تک شادی نہیں کی، کے ساتھ تمام دن، تمام تر قربتوں کے ساتھ گزارنے کے بعد ساری سہ پہر بظاہر تو اپنے پلنگ پر سوتے رہے مگر دراصل اپنی صبح کے واقعات کو اپنے ذہن میں دہراتے رہے۔۔۔ مگر سہ پہر ڈھلنے لگی تو چائے پیتے ہوئے وہ دونوں دیر تک آپس میں لگاوٹ کی باتیں کرتے رہے۔

'نابینا' ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جو شادی کے کچھ عرصے بعد بینائی سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس کی بیوی ایک بچی کی ماں ہونے کے باوجود خاوند سے طلاق کا مطالبہ کرتی ہے یہ کہہ کر کہ ''میں چاہتی ہوں کہ میں دیکھی جاؤں۔۔۔ یہی میری تسکین ہے۔۔۔ عورت کی تکمیل ہمیشہ مرد کی آنکھوں سے ہوتی ہے۔'' لیکن جب بچی کی سوچتی ہوئی روئی روئی آنکھیں دیکھتی ہے تو اس کے اندر 'ماں' اور 'محبوبہ' آپس میں الجھ جاتی ہیں۔ جس کی وجہ سے وہ اپنا ارادہ تبدیل کر لیتی ہے اور جب اس کا عاشق اس تبدیلی کا سبب پوچھتا ہے تو اس کو انکار کی یہ وجہ بتاتی ہے:-

> ''بس دو ہی وجوہات ہیں۔۔۔ ایک تو اب مجھے احساس ہوا کہ نابینا اسلم، مجھے جیسے دیکھ سکتا ہے کوئی آنکھوں والا نہیں دیکھ سکتا۔۔۔ نہ پہلے کبھی ایسی بات ہوئی نہ پتہ چلا۔۔ اور دوسرے یہ کہ اگر پہلی بیوی تمہاری آنکھوں کی آوارگی نہیں روک سکی، تو میں کیسے روک سکوں گی۔۔۔''

'قیامت' ایک مختصر علامتی افسانہ ہے۔ مقابلہ ہے غیروں اور اپنوں کی زندگیوں کا۔ صدیوں پہلے غیروں کی کھلی آنکھوں کی بینائی دھندلا رہی تھی۔ اس زمانے میں اپنوں کی آنکھیں کھلیں تو ان کی خیرہ کن چمک سے غیروں کی آنکھیں چندھیا کر بالکل بند ہو گئیں۔۔۔ تب وقت کی داستاں بدلنے لگی۔ اپنوں کی نوشگفتہ آنکھ نے حیرت اور تجسس سے کائنات کو دیکھا، بصارت کو تیز کیا، بصیرت کو گہرا کھودا اور حدِ نظر تک پھیلے ہوئے منظر کے بڑے حصے کا احاطہ کر لیا۔ جذب و کشید کا یہ عمل ابھی جاری تھا کہ نظر بازوں نے مل کر آنکھ کی پتلی پر قبضہ کر لیا۔ آنکھ کسمسائی۔۔ مزاحمت لہرائی۔۔ تو قابضوں نے مقدر کے لٹھ سے سہلا دیا اور مسلسل سرگوشی کی کہ یہ موتیا بند نہیں بلکہ آنکھ کی اپنی قسمت ہے۔ سرگوشی کا یہ مدہوش کن ورد مسلسل جاری رہا تو تاثر کی طوالت سے بصارت قابضوں کی ہم رنگ ہو گئی۔ بصیرت ان کے تابع بن گئی۔ تجسس مفلوج ہو گیا اور چمک دھندلا گئی۔ وقت گزرتا گیا۔۔۔ غیروں کی آنکھ صبر آزما خودشناسی سے دوچار ہوتی رہی۔ لگاتار مزاحمت کرتی رہی اور بالآخر آگہی کی چڑھائی چڑھنے لگی۔ اپنوں کی آنکھ کے گرد قابضوں کا حصار تنگ ہوتا گیا۔ اتنا تنگ کہ خود فراموشی کا گڑھا بن گیا۔ برس اور صدیاں گزرتی رہیں۔ دریافت نے چڑھائی کی۔ بصارت میں سوال لہرائے۔ مگر اپنوں کے گہرے گڑھے کے قابضوں نے سوال پوچھنا یا سوچنا گناہ قرار دے دیا تھا۔ اس لیے ان کی بصارت ساکن اور بصیرت جامد ہونے لگی۔۔ غیروں کی زندگی پیدائش کے فوراً بعد شروع ہو جاتی ہے لیکن گڑھے حالات بدستور رکھنے کی خاطر اپنوں کے قابض ان سے یہ کہتے تمہاری اصل زندگی موت کے بعد شروع ہوگی۔ غیر ماضی کی کھاد سے زمین کو توانا بناتے رہے تاکہ مستقبل میں اچھا پھل مل سکے۔ مگر اپنوں کے نظرباز قبضہ رکھنے کے لیے مستقبل کو ماضی سے جدا نہ دیکھنا چاہتے۔ نتیجتاً ان کی تباہی ہوئی۔ ہزاروں مارے گئے۔ عزرائیل کے پاس فریاد لے گئے جواب

ملا" قیامت؟ کون سی قیامت؟۔ احمق لوگو! وہ تو گزر گئی۔ دراصل بندوں کی بندگی ہی قیامت تھی۔"

'خوانچے والا' ایک سچی کہانی ہے۔ 'بھوک' کہانی ہے ایک افغانی عورت کی۔ اسلام آباد میں کوڑے کے ڈھیر سے پرانی بوتلیں، ڈبے اور کھانے کے ٹکڑے تلاش کرنے والی عورت۔ ایک امیر جب گھر کی کھڑکی سے دیکھتا ہے کہ وہ اور ایک آوارہ کتا دونوں کوڑے کے ڈھیر سے کھانے کی اشیاء کی تلاش میں ہیں اور بھوکے ہیں تو نوکر کے ذریعے کھانا بھجوا دیتا ہے۔ اور نوکر کو تاکید کرتا ہے کہ جب بھی اس کو دیکھے کھانا دے دیا کرے۔ عورت اور کتا ساتھ ساتھ نظر آتے۔ ایک دن وہ آئی اور کوٹھی کے ملازم سے بیگم صاحبہ یا صاحب سے بات کرنے کی درخواست کی۔ بیگم باہر گئی ہوئی تھی اس لیے صاحب بات کرنے لگے۔ وہ بولی کہ میں، اگلے دو روز میں واپس افغانستان جا رہی ہوں میں چاہتی ہوں کہ اس کتے کو آپ روزانہ کھانا دیا کریں۔ ساتھ ہی کہنے لگی "صاحب بھوک بڑی ظالم ہے۔ آپ کو تو پتہ نہیں مگر مجھے پتہ ہے کہ بھوک کیا ہوتی ہے۔" بیگم اپنی کیلی کے ساتھ مرسڈیز میں آتی ہے خاوند کو انگریزی میں کہتی ہے کہ اسے کیوں آنے دیا گھر کے اندر؟۔ افغانی عورت بیگم کے الفاظ کو سنے ان سنے کر کے سکتے کے انداز میں گاڑی کو دیکھنے لگی، دھیرے دھیرے قریب جا کر اس کے بونٹ کو چھو کر اس کی شفاف چمکیلی سطح پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ بیگم ایک دم چلانے لگی "گاڑی پر گندے ہاتھ مت لگاؤ۔" عورت جیسے خواب سے چونک گئی۔ آنکھوں میں غصے کا ریلا۔ انگریزی میں جواب دیا۔ "Exactly the same car used to be parked in my porch too." (بالکل ایسی ہی کار میرے گھر کے پورچ میں بھی کھڑی رہتی تھی) پھر اس نے زور سے پاؤں پٹخا۔۔۔ زمین کی طرف دیکھ کر "تھو" کیا اور تیزی سے چلتی ہوئی گیٹ سے باہر نکل گئی۔ کتا اس کے ساتھ بھاگ رہا تھا۔ نوکر کو بھیجا گیا کہ بلا لائے مگر وہ نہ آئی۔ تیسرے دن نوکر نے بتایا کہ وہ چلی گئی ہے۔ جاتے ہوئے کتے کو مار کر گڑھے میں دبا گئی ہے۔ دباتے ہوئے رو رہی تھی اور کہہ رہی تھی "خدا نے میرے تمام عزیزوں کو مار دیا ہے اب ایک عزیز کو میں نے خود مار دیا تو کون سا ظلم ہو گیا۔"

'جوہڑ' کہانی ہے دو سگے بھائیوں کی۔ باپ کے بے وقت انتقال پر بڑے بھائی نے ایم اے میں تعلیم کا سلسلہ منقطع کر دیا اور چھوٹی سی نوکری کر لی تاکہ چھوٹے بھائی کی تعلیم اور گھر کا خرچہ پورا کر سکے۔ ماں نے بھی ادھیڑ عمری میں نوکری کر لی۔ ماں بیٹے کی محنت رنگ لائی۔ چھوٹا پڑھ لکھ کر بڑا افسر تو بن گیا لیکن اب وہ ان لوگوں سے بہت دور ہو گیا جن کی قربانی سے وہ اس عہدے کے قابل ہوا تھا۔ بڑے بھائی کا جوان بیٹا مناسب علاج نہ ہونے کی وجہ سے مر گیا اور چھوٹے بھائی کی بیٹی کی سالگرہ اور بیٹے کے سوٹ پر ہزاروں روپے خرچ ہو گئے۔ چھوٹا بھائی ایک دن اپنے ضمیر کی آواز سے مجبور ہو کر قبرستان کی طرف مڑ گیا۔ قبرستان کے باہر کھوکھے سے پھول خرید کر وہ اپنے جواں مرگ بھتیجے کی قبر کی طرف چلا مگر چال

میں ایسی بے یقینی سی تھی جیسے کوئی راستہ کھو گیا ہو۔ قبر پر پہنچ کر اس نے پھول بکھیرے فاتحہ پڑھی۔ اور پھر دونوں ہاتھ قبر پر ٹکا کر زمین پر بیٹھ گیا، کچھ ایسے ہی جیسے کوئی ملزم دست بستہ معافی مانگ رہا ہو۔ اس کی بند آنکھوں سے دھیرے دھیرے آنسو بہتے رہے۔

'آج' کہانی ہے 1990 کی رہائی کی۔ ایک شریف آدمی کی بیٹی کے لیے ایک آدمی نے اپنے ایسے بیٹے کے لیے رشتہ بھیجا جس کی پہلے دو شادیاں ہو چکی ہیں۔ اس نئی شادی کو وہ صرف اپنی (PR) پی آر بڑھانے کا وسیلہ بنانا چاہتا ہے۔ انکار پر وہ اس آدمی کے گھر ڈاکہ ڈلواتا ہے۔ اس کے بیٹے کو کالج سے نکلواتا ہے۔ غنڈوں سے تنگ کراتا ہے۔ ایک دن ایک ریسٹورنٹ میں بیٹے کو ان ڈاکوؤں میں سے ایک ڈاکو نظر آتا ہے۔ وہ ریسٹورینٹ کے مالک کو بتاتے ہوئے کہتا ہے پولیس کو فون کرے تو مالک جواب میں یہ کہتا ہے "تو گویا آپ چاہتے ہیں کہ کل ڈاکہ میرے یہاں پڑ جائے۔ آپ جو چاہیں کریں مگر ---میرے کاروبار میں مشکل پیدا نہ کریں۔" حیرت اور پریشانی کے عالم میں وہ پولیس سٹیشن کی طرف چل دیتا ہے مگر تھانیدار اس کی بات پر یقین نہیں کرتا۔" بچہ---ڈاکو اس طرح نہیں گھومتے۔ تمہیں غلطی لگ رہی ہے" محسن کہتا ہے کہ" سر! میں اسے پہچانتا ہوں۔ وہ دو تین گھنٹے ہمارا گھر لوٹتا رہا۔ میں اسے کیسے بھول سکتا ہوں۔"

تھانیدار جواب دیتا ہے" اور میرا پچیس برسوں سے مجرموں سے واسطہ رہا ہے، وہ جس شہر میں ڈاکے مارتے ہیں۔ وہاں کے ریسٹورانوں میں نہیں گھومتے---دو گھنٹے اور پچیس برسوں میں فرق ہے۔" "مگر سر" محسن کے دوست نے کہا" آج کے ڈاکو ماضی والے نہیں۔ ماضی والے ڈاکو مجرم ہوتے تھے۔ آج کے ڈاکو حاکم ہیں یا ان کے چیلے۔" "تو بیٹے" تھانیدار بات ختم کرنے کے انداز میں طنزیہ بولا" ہم تو سرکاری ملازم ہیں---جو بھی حاکم بن جائے۔ ہم تو اس کے ماتحت ہیں۔" اور پھر وہ کسی کو فون کرنے لگا۔ جب ایک فون ختم ہوا تو اس نے دوسرا کر دیا---پھر تیسرا---تنگ آ کر محسن واپس چلا گیا۔ اور گھر جا کر باپ کو کہتا ہے---کہ وہ رشتے سے انکار واپس لے لے، باپ یہ سنتا ہے تو دل کے دورے کا شکار ہو کر سرکاری ہسپتال پہنچتا ہے جہاں پر انہیں ایک خطیر رقم پیشگی جمع کرانے کا کہا جاتا ہے۔

'دو اینٹوں کی کہانی' گورنمنٹ کالج لاہور کی بیرونی دیوار کی دو اینٹوں کی کہانی ہے جنہوں نے گزشتہ پینتالیس برسوں کے سرگرم واقعات کا مشاہدہ کیا ہے۔ اسی طرح 'باپ بیٹا' معاشرے کے ایسے ناکام شخص کی کہانی ہے جو خود تعلیم حاصل نہ کر سکا، فوٹو کاپی کی مشین سے وہ کنبے کا پیٹ بھرتا ہے۔ بیٹے کو اعلیٰ تعلیم دلانے کا خواب دیکھتا ہے۔ بیٹا بھی باپ کے آدرشوں کے سہارے ایمانداری اور محنت کے اصولوں پر عمل پیرا ہے۔ بیٹا کالج میں زیرِ تعلیم ہے لیکن کالج میں اساتذہ دن کے وقت تو صرف وقت گزاری کے لیے آتے ہیں اور شام کو ٹیوشن سنٹر میں تعلیم دیتے ہیں۔ بیٹا ٹیوشن فیس برداشت نہیں کر سکتا

فیل ہو جاتا ہے۔ وہ مایوس ہو کر خودکشی کر لیتا ہے۔ اس کو سرکاری ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں لے جایا جاتا ہے تو وہاں ڈاکٹر ان مریضوں پر مصروف تھے جن کے عزیز اپنے اپنے موبائل فون پر ڈاکٹروں کے اوپر والوں سے رابطہ کر رہے تھے۔ بیٹے کی قبر پر مٹی ڈالے اب کئی ماہ گزر چکے ہیں مگر باپ کے ذہن میں ہر وقت یہ سوال کھٹکتا رہتا ہے کہ اس کے بیٹے کا قاتل کون ہے؟۔۔۔اس کا باپ۔۔۔باپ کا خیر خواہ دوست۔۔۔یا وہ ماحول۔۔۔اب خدا ہی جانے آگے کیا ہونے والا ہے۔"

'معاہدہ'، 'بڑے باپ کی چھوٹی بیٹی'، 'ٹائم ایکسپریس'، 'فوڈ سٹریٹ'، 'فریاد' اور 'اسلام آباد' بھی موجودہ معاشرے کے ستائے ہوئے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔" معاہدہ" میں 'ابلیس' زمین پر آ کر پاکستان کے سرکردہ لوگوں سے معاہدہ کرتا ہے اور صرف چند سو پاکستانیوں کے ساتھ ابلیس کے معاہدوں کی وجہ سے دنیا والے پاکستان کو ناکام ریاست کہنے لگے۔ میں یہاں یہ سوال قاری کی بصیرت پر چھوڑتی ہوں کہ کیا یہ افسانہ ہمارے حالات کی بچی اور تلخ حقیقت نہیں!! افسانہ بڑے باپ کی چھوٹی بیٹی۔ بڑا باپ گاؤں کے ترکھان کا بیٹا رمضو تھا جو اپنی ہوشیاری کی وجہ سے رمضو سے رمضان، پھر رمضان احمد چوہدری اور بالآخر آرائے چوہدری بن گیا۔ شہر میں آیا تو ایک فیشن ایبل خاتون بھی گھر میں رکھ لی۔ اس خاتون نے بیٹی کو جنم دیا۔ بیٹی کے جوان ہونے تک چوہدری صاحب سیاست میں بھی بلند مقام حاصل کر چکے تھے۔ ایک دن وہ ایک سیاسی لیڈر سے ملنے گئے معلوم ہوا کہ ڈاکٹروں نے تبدیلی آب و ہوا کا مشورہ دیا ہے۔ چنانچہ چوہدری صاحب نے مری میں موجود کوٹھی کی پیشکش کی اور کہا کہ" میری چھوٹی لڑکی لیڈی ڈاکٹر ہے۔۔۔ یہ جوابھی آپ سے ملی تھی۔۔۔ یہ ہر دفعہ آپ کے ساتھ جائے گی۔ گھر میں کھانے پینے کا بھی خیال کرے گی اور علاج بھی کرے گی۔" اور ساتھ ہی مطالبہ کیا کہ" اگر آپ مجھے ذرا اور بڑا بنا دیں گے۔ تو اگلی سیاسی تبدیلی میں مجھے بھی فائدہ ہو گا اور آپ کا بھی ایک جان نثار مضبوط ہو جائے گا۔ لیڈر صاحب نے کہا کہ اعلان تو وہ مری پہنچتے ہی کر دیں گے۔ لیکن لڑکی تو راضی ہے نا بعد میں کوئی بدمزگی نہ ہو۔ تو بڑے باپ نے مسکرا کر کہا" بڑی سگھڑ بیٹی ہے جی۔۔۔ خدمت کرنا جانتی ہے۔ ایک آدھ خاص دوست کا پہلے بھی اسی طرح علاج کر چکی ہے۔"

'فریاد' ایک پاکستانی کی کہانی ہے جو خدا کے دربار میں پیش ہو کر فریاد کرتا ہے کہ وہ اپنی اصلی شکل میں زندہ رہنے کا حق مانگتا ہے۔ وہ کہتا ہے" میرے چہرے، جسم اور روح کو مسخ نہ کیا جائے۔۔۔ میرے ذہن و سراپا کو بگاڑا نہ جائے۔" جب اس سے سوال ہوتا ہے کہ اسے کون زندہ رہنے سے روکتا ہے تو وہ کہتا ہے پاکستان کے بادشاہ۔۔۔ ان کے درباری۔۔۔ اور زرخرید ابن الوقت حواری۔" فرشتہ اپنے کاغذات دیکھ کر کہتا ہے کہ پاکستان میں تو جمہوریت ہے واں بادشاہی کا کیا کام؟ تو فریادی جواب دیتا ہے۔ " عالی جاہ۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی۔ وہاں جمہوریت کا کیا کام۔ وہاں تو محض الیکشن کی نقل سے مطلق العنان

بادشاہ بچے جاتے ہیں۔ یا جمہوریت کی حفاظت کے لیے ڈکٹیٹر آجاتے ہیں۔ اور وہ اس وقت تک اپنی من مانی کرتے رہتے ہیں۔ جب تک موت۔ سازش یا عوام کے جلوس انہیں ہٹا نہیں دیتے۔۔ان کے اپنے شاعر اقبال کے مطابق "دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب۔"۔۔۔جیسی ان کی جمہوریت ہے۔ویسی ہی زندگی وہ مجھ پر ٹھونسنا چاہتے ہیں۔۔۔اس لیے میں فریاد کر رہا ہوں۔"

مقدمہ کا فیصلہ کرنے کے لیے پاکستان سے گواہ پیش کئے جاتے ہیں۔ جو مختلف مسالک سے تعلق رکھتے ہیں اور ہر گواہ فریادی کو اپنے مسلک کا چوغہ پہنانا چاہتا ہے۔ فریادی انکار کرتے ہوئے اپنے مقدمے کا فیصلہ جاننا چاہتا ہے۔جس کے جواب میں فرشتے نے قہقہہ لگایا اور بولا" تم زمینی مخلوق خدا کے عرشی نظام کو بالکل نہیں سمجھ سکو گے۔۔دیکھو! خدا مقدمے ضرور سنتا ہے۔ دعائیں اور بددعائیں بھی سنتا ہے۔مگر فیصلے کبھی نہیں سناتا۔اس کے فیصلوں کا ظہور حالات کی کروٹ سے ہوتا ہے۔۔ بعض مجرموں کو تو پتہ بھی نہیں چلتا کہ یہ ان کے خلاف فیصلہ ہے۔مگر زمانہ فوراً جان لیتا ہے۔اس لیے کہ خدا کے فیصلے کسی ایک فرد کی سزا کے لیے نہیں ہوتے۔ بلکہ سب کی عبرت کے لیے ہوتے ہیں۔" فریادی کہنے لگا" تو پھر میرے لیے کیا حکم ہے؟۔" "واپس جا کر انتظار کرو" فرشتے نے کہا۔فریادی جب واپسی کے لیے مڑنے لگا تو فرشتے نے دھیمی سرگوشی کی"۔۔۔انتظار کے دوران خدا کے سابقہ فیصلوں پر دھیان دو۔"

7۔ ڈائری نویسی

مشرقی پاکستان کے آخری دنوں کی ڈائری کے کچھ حصے 'لیے' کے عنوان سے شائع ہو چکے ہیں۔اس کو مصنف نے "اس پاکستان کے نام۔۔جو ٹوٹ رہا تھا" کے نام کیا ہے۔مسعود مفتی جب مئی 1971 کو لاہور سے ڈھاکہ کے لیے روانہ ہوئے تو انہوں نے اسی وقت سے ڈائری لکھنی شروع کر دی۔ جون کے آخر میں جب وہ لاہور آئے تو اس وقت تک کی لکھی ہوئی ڈائری یہیں چھوڑ گئے۔ جولائی سے دسمبر تک کی ڈائری ان کے پاس تھی۔ جب وہ 14 دسمبر 1971 کو کانٹی نینٹل ہوٹل کے غیر جانبدار علاقے میں پناہ گزین ہوئے تو انہیں ڈائری کی فکر ہوئی کہ وہ ہندوستان کے ہاتھ نہ لگ جائے۔اسی ہوٹل میں ایرانی تاجر مسٹر ایم ایچ کاشانی بھی پناہ گزین تھے۔ مسعود مفتی نے ان سے گزارش کی کہ وہ اپنے سفارت خانے میں رکھوا دیں اور جب بھی موقع ملے چاہے وہ برسوں بعد ہی کیوں نہ ہو، پاکستان بھجوا دیں اور اگر کسی وقت وہ یہ سمجھیں کہ ڈائری محفوظ نہیں رہ سکتی تو اسے جلا کر تلف کر دیں۔ کاشانی صاحب نے بکمال مہربانی ڈائری ان کے گھر بھجوادی۔اس کے پیش لفظ میں یہ یوں لکھتے ہیں:۔

"دشمن کی دو سالہ قید میں کئی لمحے ایسے بھی آئے تھے جن میں یقین سا ہو جاتا تھا

کہ شاید ہم کبھی بھی زندہ وطن نہ جا سکیں گے۔ ان کربناک لمحوں کا واحد سہارا یہی
تسلی تھی کہ میری ڈائری تو پہنچ چکی ہے۔"

"لمحے" مشرقی پاکستان کے ڈوبنے کی لمحہ بہ لمحہ روداد ہے اور اس کو انہوں نے تاریخ وار لکھا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ اس لیے کیا گیا تا کہ قاری کو واقعات کے ادراک کے ساتھ ساتھ وقت کا ادراک بھی ہو۔ کہنے کو یہ ڈائری ہے لیکن اس کا کمال یہ ہے کہ کہیں بھی ڈائری جیسی بوریت نہیں ملتی۔ ہر صفحے پر ایک حساس دل اور اردگرد ہونے والے حالات و واقعات کو بیان کرنے کے پیچھے ایک دردمند، حساس سوچ کا حامل اور پاکستانیت کے رنگ میں ڈوبا ہوا تخلیق کار منظر آتا ہے۔ ہر تاریخ روزنامچے کی بجائے خود ایک مکمل واردات معلوم ہوتی ہے جس میں جزئیات نگاری اور زبان و بیان کا فسوں اپنے تمام ادبی تقاضوں سمیت ملتا ہے ڈائری کو پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ اگر ایسے ادیب موجود نہ ہوتے تو آنے والی نسلوں کو معلوم بھی نہ ہو پاتا کہ کبھی بنگلہ دیش بھی ہمارا ہی ایک بازو تھا۔ دشمنوں کی عیاری اور اپنوں کی سازش سے ہمیشہ کے لیے دولخت کر دیا گیا اور احساسِ زیاں بھی قوم میں نہ رہا۔

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

پروفیسر فتح محمد ملک اپنے ایک مضمون "مسعود مفتی کا شہرِ افسوس" میں ان کے ادب کا موازنہ سقوطِ ڈھاکہ کے موضوع پر انتظار حسین کے افسانے "شہرِ افسوس" سے کرتے ہوئے یہ فرماتے ہیں:-

> "مسعود مفتی ہم سب کو یہ گھڑی یاد دلانے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں اور گذشتہ پندرہ برس سے ہمیں اس مقامِ عبرت کی سیر کرانے میں مصروف ہیں۔ پہلے انہوں نے ہمیں اپنے رپورتاژ "چہرے" میں مشرقی پاکستان کی جانکنی کی داستان سنائی۔ سبز ہلالی پرچم کے چاند تاروں کے غروب ہونے اور اس کے بعد کی اتھاہ تاریکی کے منظر دکھاتے ہوئے اپنے دل کی بے چینی اور ذہن کے کرب کو اس نکتۂ بصیرت میں سمیٹا کہ:-
>
> "برصغیر کی تاریخ میں یہ منظر بار بار دیکھنے میں آیا ہے۔ جب بھی مرکز میں نا اہل اور بددیانت لوگ آئے تو دور کے علاقوں میں غداروں نے کمریں کس لیں، کسی بیرونی طاقت سے سازش کی اور سلطنت کی کمر میں چھرا گھونپا۔"

اب ڈائری سے کچھ اقتباس پیش کیے جاتے ہیں۔

منگل یکم جون 1971

بریگیڈئر قادر صاحب 15 اپریل کو مشرقی پاکستان آئے تھے۔ اور پھر ادھر ادھر کے حالات کا جائزہ لے کر کہنے لگے:۔

> "جب میں نے چٹاگانگ دیکھا، تو میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مارچ کے شروع میں اصفہانی جوٹ مل کی کلب میں عورتوں اور بچوں کو قتل کیا گیا تھا۔ وہاں میں نے خون کے چھینٹے دیکھے۔ ایک دیوار پر بچے کا سر پھٹنے کے نشانات دیکھے کیونکہ کھوپڑی کے اندر سے مغز نکل کر دیوار پر چپکا تھا۔ عورتوں کے تار تار برقعے دیکھے۔ ایک چھوٹی بچی کا نیا پاجامہ دیکھا جسے شاید وہ ابھی تک استعمال بھی نہ کر سکی تھی۔ اور بالآخر ایک بچے کی کتاب دیکھی جس میں ہرن کی تصویر تھی۔ یہ وہی کتاب تھی جو میرا بچہ لاہور میں اپنے سکول میں پڑھتا ہے۔ میں نے کتاب اٹھائی تو اس پر مجھے خون کے دھبے نظر آئے۔ مجھے یوں لگا کہ یہ میرے اپنے بچے کا خون ہے۔ اور میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے۔"

مئی 1971 کے آخری دن تھے اور میں ریلیف کیمپ کے ہسپتال میں گھوم رہا تھا۔ مارچ اپریل کے مہینوں میں مشرقی پاکستان کے کئی حصوں میں بہاریوں کا قتل عام ہوا۔ مگر مغربی پاکستان میں لوگوں کو خبروں کے بلیک آوٹ کی وجہ سے بالکل علم نہ تھا۔ یہ ہسپتال ان تمام سانحوں کا عنوان بنا تھا جس کی تفصیلات کئی شہروں میں بکھری پڑی تھیں۔ اس ہسپتال میں میمن سنگھ کا عزیز الحق چارپائی پر بے کل تھا۔ جس کی پیٹھ پر تیرہ دفعہ خنجر سے وار کیے گئے تھے اور دونوں ہاتھوں کی ساری انگلیاں ٹوکے سے کاٹی گئی تھیں۔ پچیس سالہ رابعہ کے سارے گھر والے بہراب بازار میں اس کی آنکھوں کے سامنے قتل کیے گئے۔ اس کی جوانی اسے بچا گئی۔ جس سے پورا فائدہ اٹھانے کے بعد کلہاڑی سے اس کے کندھے کو لکڑی کی طرح پھاڑ دیا گیا تھا۔ بارہ سالہ قسیم کے سر کا گہرا زخم پٹی میں چھپا تھا اور اسی سر کے اندر وہ دماغ تھا۔ جواب چل گیا تھا۔ لڑکا صدمے سے نیم پاگل تھا اور اس کے سارے گھر والے لاپتہ تھے۔

جمعرات 10 جون 1971

ساڑھے بارہ بجے بھاگم بھاگ واپس ریسٹ ہاؤس آیا۔ کیونکہ نسیم صدیقی ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر اور خالد مسعود کو وقت دیا تھا کہ ان کے ساتھ جا کر شاگی پاڑا کی بستی دیکھیں گے۔

ان کے ساتھ وہاں پہنچا تو دل دہل گیا!!

شانتی پاڑا میمن سنگھ کا ہی حصہ ہے جس میں صرف غیر بنگالی رہتے تھے۔ کئی ہزار کے قریب آبادی تھی۔ یہ صاف ستھری آبادی تھی۔ جو سرکار نے سستے داموں کسی سکیم کے تحت بنوائی تھی۔ صاف ستھری کھلی سڑکیں اور گلیاں اور بیچ میں چھوٹے سبک سے مکان۔ ہم کوئی ایک بجے کے قریب وہاں پہنچے اور وقت کی کمی کی وجہ سے ساری آبادی تو نہیں دیکھ سکے مگر ایک حصے میں اچھی طرح گھوم پھر کر جائزہ لیا۔

دوپہر کے وقت بھی وہاں پر ہو کا عالم تھا۔ نہ آدم، نہ آدم زاد۔ بالکل موہنجوداڑو کے کھنڈرات کا سماں تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ یہاں کھنڈرات کی بجائے مکمل عمارتیں تھی۔ ان مکانوں کے بیشتر مکین مزے لے لے کر قتل کیے گئے تھے۔ ہتھیار ان سے چند دن پہلے لیے جا چکے تھے۔ اور نہتے لوگ ایسٹ پاکستان رجمنٹ کے مسلح اور تربیت یافتہ لوگوں کے سامنے بے بس تھے۔ خصوصاً جب مقامی افسران بھی وہاں موجود تھے۔۔۔ اور موسلا دھار بارش میں قتل وغارت کا یہ ڈرامہ چھ گھنٹے تک جاری رہا۔

قریباً ہر دوسرے تیسرے مکان کے ساتھ تازہ بھرے ہوئے گڑھے تھے۔ تسنیم نے بتایا کہ یہ مشترکہ قبریں (Mass graves) ہیں وہ خود فوج کے ساتھ 24 اپریل کو یہاں آئے تھے۔ تو تعفن سے کھڑا نہیں ہوا جاتا تھا۔ کوے، کتے، گدھ اور بلیاں جوق در جوق گھوم رہے تھے۔ کافی لاشیں امام مسجد نے دفن کر دی تھیں۔ مگر پھر بھی دو تین سو کے قریب کھلی پڑی تھیں۔ زیادہ تر مردوں کی مگر ان میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے۔ کسی گھر میں ایک لاش، کسی میں دو تین۔۔۔ کہیں گلی میں چار چھ لاشوں کا انبار۔ کوئی کھڑکی سے باہر لٹکا ہوا۔ کوئی دروازے کی دہلیز کے آر پار۔۔۔ حشر کا سماں لگتا تھا۔ خود تسنیم نے اپنے ہاتھوں سے چند ایک لاشوں کو ایسے گڑھوں میں ڈالا۔ جن میں پہلے بھی لاشیں پڑی تھیں مگر ابھی کچھ گنجائش باقی تھی۔

اسی طرح ایک بنگالی جو ان حالات میں بھی پاکستان سے محبت رکھتا تھا۔ کیونکہ وہ تحریک پاکستان میں بہت سرگرم تھا۔ اپنی قربانیوں کا ذکر کرتے ہوئے تسلیم کرتا کہ اس کا بیٹا مکتی باہنی میں تھا اور گوریلوں میں شامل ہو کر فوج کے ساتھ جھڑپوں میں بھی حصہ لیتا تھا۔ وہ شکایت کرتا ہے کہ "میرے بیٹے کا پتہ لینے کے لیے پاک فوج مجھے تنگ کرتی ہے۔ میں لاکھ کہتا ہوں کہ میں پکا پاکستانی ہوں آپ کے ساتھ شامل ہو کر اپنے بیٹے کے خلاف لڑنے کو تیار ہوں۔ میں مغربی پاکستانیوں کو بھائی سمجھتا ہوں مگر وہ ان کو دشمن سمجھتا ہے۔ لیکن میری کسی بات کا یقین نہیں کیا جاتا۔ بتایئے میرا کیا قصور ہے؟" جب اس کو کہا جاتا کہ آپ کو تو خواہ مخواہ اپنے بیٹے کے قصور کی سزا مل رہی ہے تو وہ جواب دیتا ہے۔

"مجھے اپنے بیٹے کے قصور کی سزا نہیں مل رہی۔ بلکہ آپ کے قصور کی سزا مل رہی ہے۔ بحیثیت ایجوکیشن سیکرٹری آپ جس کرسی پر بیٹھے ہیں مجھے اس کرسی کے تساہل کی سزا مل رہی ہے۔ میرا بچہ پیدائشی

پاکستانی تھا، مگر آپ کے نظام تعلیم نے اسے غیر پاکستانی بنا دیا۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ میں تو اس ملک کے قیام کی تحریک میں تن من اور دھن لٹا دوں اور یہی ملک پہلے تو میرا بیٹا بگاڑ دے اور پھر مجھے اس کے بگڑنے کی سزا دے۔''

''لمحے'' میں مسعود مفتی کا ایک مضمون ''لمحوں کی سوچ'' بھی چھپا ہے جو یکم جولائی 1975 کو راولپنڈی میں شام ہمدرد کی تقریب میں پڑھا گیا۔ اس میں انہوں نے بیان کیا:-

''خواتین وحضرات! آپ میں سے بیشتر نے وہ ماحول نہیں دیکھا۔ اس کے ناقابل برداشت تناؤ کو محسوس نہیں کیا۔ بے آسرا اور یتیم لہو کو بلا شکایت اور چپ چاپ ٹپکتے نہیں دیکھا۔ سہمی ہوئی آنکھ کو غمناک نہیں دیکھا۔ کربناک چہروں کو منجمد نہیں دیکھا۔ اس لیے آپ کے ذہنوں میں وہ ہیجان اور سوچوں میں وہ طوفان نہیں آیا جو آپ کو اس تاریکی سے دوچار کرتا۔ اسی وجہ سے آپ شاید میری باتیں پوری طرح سمجھ نہ سکیں۔ چنانچہ اس تاریکی کا تھوڑا سا اندازہ دینے کے لیے میں مشتے از خروارے کے طور پر چند واقعات اور ان سے قدرتی طور پر پیدا ہونے والی سوچیں آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

ہسپتال میں ایک نو سالہ بچہ بھاگ کر مجھے لپٹ گیا اور میری ٹانگوں میں منہ چھپا کر سسکیاں دینے لگا۔ منتظمین نے مجھے بتایا کہ کمرے میں ابھی ایک شخص داخل ہوا ہے جس نے خاکی پتلون پہنی ہے۔ یہ بچہ جب بھی کسی خاکی کپڑے والے کو دیکھتا ہے تو انتہائی خوفزدہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ان کی بستی میں ایسٹ پاکستان رائفلز کے فوجیوں نے قتل عام کیا تھا۔ اور اب یہ کسی کو بھی ان کے ہم رنگ کپڑے پہنے دیکھتا ہے تو خوف سے بے قابو ہو جاتا ہے۔ اس بچے کے سارے عزیز مارے گئے تھے۔ بچے کے بازو پر پٹیاں بندھی تھیں۔ جو کٹے ہوئے ہاتھوں کا بدل بن رہی تھیں۔

ہسپتال سے ہٹ کر ریلیف کیمپ گئے تو وہاں کمزور نحیف اور پریشان حال بچوں کے غول کے غول گھوم رہے تھے۔ ویرانڈے اور کمروں میں جابجا لٹکی ہوئی چادروں یا ساڑھیوں کی اوٹ میں عورتیں اپنی گھر بستی جمانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اجڑے ہوئے مرد خلاء میں گھور گھور کر نوشتہ تقدیر پڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ چند روز پہلے یہ خوشحال گھرانے تھے۔ گھروں میں آرام تھا۔ خوشیاں تھیں۔ گھروں پر امیدوں کی چھت تھی۔ چھت کے پار مستقبل کے خواب تھے۔ مگر اب کچھ بھی نہیں تھا۔ گھر لٹ گئے۔ گھرانے اجڑ گئے۔ امیدیں مٹ گئیں۔ مستقبل تاریک ہو گئے۔ سہانے خواب بھیانک خوف میں ڈھل گئے۔۔۔۔ یہ سب کیوں ہوا؟۔ ان کا قصور کیا ہے؟ یہ تماشا کیوں بنے؟ ہم تماشائی کیوں بنے؟ یہ سوال بار بار سر اٹھاتے تھے۔

8۔ مسعود مفتی بحیثیت مکتوب نگار

غالب نے خطوط کو مکالمہ بنادیا۔ ان کے خطوط ان کے عہد کی عکاسی کرتے ہیں۔ اور آج کا قاری جب ان کو پڑھتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے گویا غالب اس سے ہم کلام ہیں۔ خطوط کو اردو ادب میں ہمیشہ ہی ایک خاص مقام حاصل رہا ہے۔ اسی طرح سانحہ مشرقی پاکستان میں جب کہ ہمارے نوے ہزار کے قریب جنگی قیدی بھارت میں تقریباً دو سال تک رہے۔ تو ان کے خطوط جو انہوں نے اپنے گھر والوں کو لکھے۔ آج بھی وہ کئی گھروں میں اہم امانت کے طور پر محفوظ ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ''اردو ڈائجسٹ'' میں جناب الطاف حسن قریشی نے ایک سلسلہ شروع کیا تھا ''جنگی قیدیوں کے خطوط'' اور اس سلسلے میں وہ منگلا چھاؤنی میں بذات خود دو دفعہ آکر قیدیوں کے اہل خانہ سے خطوط لے گئے۔ اسی سلسلے میں میرے والد محترم جناب کرنل محمد اکبر (مرحوم) کے بھی تین عدد مکمل خطوط انہوں نے فروری 1973 کے شمارہ میں شائع کیے تھے۔ ان خطوط میں ہمارے اسیروں کا 'حوصلہ' اور ان کی ہمت جھلکتی تھی اور معلوم یہ ہوتا تھا کہ ان شیروں کو قید میں رکھ کر بھی دشمن کی نیندیں حرام تھیں۔

مسعود مفتی نے بھی اس دوران ایسے ہی جذبوں سے بھرپور خطوط اپنے اہل خانہ اور دوست احباب کو لکھے۔ ان کے کچھ خطوط ''نقوش'' میں جناب محمد طفیل نے شائع کیے تھے۔ ان خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسعود مفتی بہت اچھے مکتوب نگار بھی ہیں۔ وہ قید میں بھی اپنے وطن اور اہل وطن سے باخبر رہنا چاہتے ہیں۔ ان کے خطوں سے ان کی فطری شگفتگی اور شائستگی کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ اور یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو پاکستان میں اپنے تمام دوستوں کا دشمن کی قید میں رہ کر بھی کتنا خیال ہے۔ نمونے کے لیے ملاحظہ ہو ان کا یہ خط جو انہوں نے بریلی کیمپ سے لکھا:-

کیمپ نمبر 29

26/06/1973

طفیل بھائی:

السلام علیکم۔ ڈھاکہ کی خط و کتابت کا سلسلہ جنگ نے منقطع کیا۔ تو اس کے بعد نہ آپ مجھ تک پہنچے نہ میں آپ تک پہنچ سکا۔ مگر بیگم کے خطوں سے آپ کی خیریت کی اطلاع ملتی رہی۔ تازہ ترین خط میں آپ کے صاحبزادے کی شادی کی نوید تھی۔ سوچا کہ پہلے نکاح کے چھواروں سے محروم رہا اب مبارک سے تو نہ رہوں۔ چھوہارے مجھے ملتے تھے مگر مبارکباد مجھے دینا تھی۔ ملنے والی چیز نہ ملے تو الزام قسمت کے سر منڈھا جاسکتا ہے۔ لیکن اگر دینے والی چیز خود نہ دی جائے تو اپنے پر بخل کا الزام لگتا ہے۔ جو شخص پہلے ہی

ناکردہ جرائم کے لیے قید بھگت رہا ہو۔ وہ ایک اور الزام کا بوجھ کیسے سہے گا؟ اور وہ بھی دوستوں کی طرف سے۔ لہٰذا بذریعہ خط۔ اس تمہید کے بعد مبارک باد قبول فرمائیے۔ میری طرف سے دلہن اور دولہا کو بھی مبارک پیش کریں۔ خداوندِ تعالیٰ ان کو نئی زندگی کی ساری خوشیوں سے نوازے۔

ویسے آپ سے دھندلی سی عکسی قسم کی ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ نقوش کا غالب نمبر 3، ان چار کتابوں میں سے ہے جو بمشکل بچا کر ساتھ لا سکا۔ وہ جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی والا کام کر دیتا ہے۔ مگر اس سے آگے بڑھ کر نصف ملاقات تک آنا چاہا تو غالب والی ہی تکلیف ہوئی کہ:

نامہ لاتا ہے وطن سے نامہ بر اکثر کھلا

اور میں یہی سوچ کر خاموش رہا کہ خطوط کے قیمتی راشن کو صرف ”خیریت خدا سے نیک مطلوب“ وغیرہ کے لیے استعمال کرنا اسرافِ نعمت ہوگا۔

بات کرنے کے سو طریقے ہیں
خامشی بھی زباں ہوتی ہے

چلو اسی زبان میں ملاقات ہوتی رہے۔

یہاں کا تعارف یہ ہے کہ

چاند تارے ادھر نہیں آتے
ورنہ زنداں میں آسماں ہے وہی

شب و روز یکساں ہیں بہت ہی یکساں مگر ہر لمحے کا اپنا علیحدہ موڈ ہے۔

کبھی تو یہ حال ہے کہ

کنج میں بیٹھا رہوں یوں پر کھلا
کاش کہ ہوتا قفس کا در کھلا

اور کبھی

چل اے جوشِ جنوں دیوارِ زنداں ہم بھی دیکھیں گے

کبھی دل مچلا

کوئی نغمہ، کوئی خوشبو، کوئی کافر صورت

اور کبھی اسی دل کا یہ عالم کہ

قفس میں چیخ اٹھتا ہے سکوتِ تنہائی

یوں بھی ہوا ہے کہ

ادھر تقاضے ہیں مصلحت کے، ادھر تقاضائے دردِ دل ہے

زباں سنبھالیں کہ دل سنبھالیں، اسیرِ ذکرِ وطن سے پہلے

دن یوں شروع ہوتا ہے۔

ہم اہلِ قفس تنہا بھی نہیں ہر روز نسیمِ صبحِ وطن
یادوں سے معطر آتی ہے، اشکوں سے منور جاتی ہے

اور ختم یوں ہوتا ہے

درِ قفس پہ اندھیرے کی مہر لگتی ہے
تو فیض دل میں ستارے اترنے لگتے ہیں

مگر ان سب پر یہ موڈ حاوی رہتا ہے

مسکراہٹ ہی رہی لب پہ بہرحال ندیم
یوں بھی پوچھا ہے مزاجِ غمِ دوراں ہم نے

اور ساتھ یہ تسلی بھی ہے کہ۔

کوئی تو بات تھی ہم کو ملا جو رتبہء دار
وگرنہ شہر میں کچھ کم نہیں تھے سودائی

دریں اثناء سیاسی افق پر ہندو پاکستان مذاکرات ایسے آتے اور گزر جاتے ہیں جیسے سواریوں سے بھری ہوئی بس منتظر مسافروں کو بس سٹاپ پر چھوڑ کر آگے نکل جائے اور ہم سوچتے رہ جاتے ہیں کہ۔

بُلبُل چه گفت و گل چه شنید و صبا چه کرد

اگر آپ کو یہ خط مل جائے تو ان تمام دوستوں کے پاس میری وکالت کر دیں جنہیں گلہ ہے کہ میں خط نہیں لکھتا۔ میری کوشش تو اس ورد تک ہے۔

اے صبا گر بہ جوانانِ چمن باز رسی خدمتِ ما برساں سرو و گل و ریحاں را

ندیم صاحب، انتظار حسین، عبدالعزیز خالد، شہزاد احمد، انور سجاد، اشفاق احمد، محمد خالد اختر اور ناصر زیدی کی خدمت میں میرا سلام عرض کر دیں۔۔۔!

خدا کرے آپ کی صحت پہلے سے اچھی ہو۔

P.S معلوم نہیں ریڈ کراس والے رسالہ پہنچانے میں مدد کریں گے یا نہیں ان سے دریافت کر لیں اور اگر وہ راضی ہوں تو براہِ کرم "نقوش" کا ایک آدھ پرچہ بھجوا دیں۔ ویسے وہ کتابیں وغیرہ تو پاکستان سے ادھر پہنچا رہے ہیں۔

نیاز کیش۔ مسعود مفتی

دیکھیے شگفتگی، مزاح، انسانی رشتوں کی اہمیت کا احساس، شگفتہ استعارے، برمحل اشعار کا انتخاب، علم

دوستی اور یاران وطن کی محبت کیا کچھ نہیں ہے۔ نمونے کے اس ایک خط میں ابلا شبہ یہ خط ان کے بہترین مکتوب نگار ہونے کی دلیل ہے۔ اس طرح یہ خط جو انہوں نے سقوط ڈھاکہ سے کچھ عرصہ بیشتر لکھا۔

ڈھاکہ

نقوش بھائی

السلام علیکم۔ آپ کے خطوط برکھا کی موسلا دھار بوندوں کی طرح یکے بعد دیگرے مل رہے ہیں۔ اور ذہن میں سرور کی وہی کیفیت پیدا کر رہے ہیں۔ مجھے بھی اندازہ نہیں رہا کہ میرے کس خط کے جواب میں آپ کا کون سا خط ہے۔ بہر حال یہ تسلی ہے کہ میرے خط آپ کو مل رہے ہیں اور آپ کے مجھے مل رہے ہیں۔

ابھی ابھی ریڈیو پر سنا ہے کہ پاکستان کی ہاکی ٹیم نے سپین میں ہندوستان کی ٹیم کو ہرا دیا۔ یوں مجھے سوکھے دھانوں میں پانی پڑ گیا۔ خدا کرے یہی نمونہ سیاسی محاذ پر بھی ہو۔" باقی سب خیریت ہے۔"

امید ہے آپ ٹھیک ٹھاک ہوں گے۔

خاکسار مسعود مفتی

22 اکتوبر 1971

اس طرح ایک اور خط جو انہوں نے محمد طفیل کو 5 اکتوبر کو لکھا پیش ہے۔

ڈھاکہ

5/10/71

طفیل بھائی

السلام علیکم۔ آپ کا عنایت نامہ ملا۔ پڑھ کر تسلی ہوئی کہ آپ افسانہ بغیر قطع برید کے چھاپیں گے۔ اگر وہ سب کچھ اسی انداز میں چھپتا رہا جو میں یہاں کا گرد و پیش دیکھ کر لکھنے کا ارادہ کر رہا ہوں۔ تو مجھے یہاں آنے پر ملال نہیں بلکہ خوشی ہے۔

صفحہ 19 پر جو فٹ نوٹ ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو اس میں اس طرح ترمیم کر دیں۔

"درج ذیل واقعات کی سند کے لیے ملاحظہ کریں" مشرقی پاکستان پر حکومت پاکستان کا وہائٹ پیپر"

صفحہ 49 (انگریزی ایڈیشن)"

خط کے متعلق بھی آپ کا رد عمل دیکھ کر بہت تسلی ہوئی۔ آپ اسے شوق سے شائع کریں۔ اور میری سرکاری پوزیشن کا خیال کرتے ہوئے کچھ کاٹنے کا ارادہ نہ کریں۔ بلکہ سب کچھ بھول کر اسی انداز میں شائع کر دیں۔ اگر آج بھی یہ ملا باتیں کہنے سے ہم لوگ جھجکیں گے تو نہ معلوم پھر کب کہیں گے۔ اگر میری قسمت میں گورنمنٹ کے ہاتھوں پھانسی لکھی ہے تو چلئے اسی خط سے شروع کرتے ہیں۔ آپ اللہ کا نام لے کر سارا ہی شائع کر دیں۔

یہاں کے حالات پر مصطفیٰ زیدی مرحوم کا یہ شعر یاد آتا ہے

کس طرف سجدہ کروں کس سے دُعائیں مانگوں
اے مرے شش جہت قبلہ و کعبہ مدد ے!!

آپ کے خطوط کے وعدہ کے لیے از حد مشکور ہوں۔

خاکسار مسعود مفتی

ان خطوط سے جہاں اس وقت کے حالات کی ایک سچی اور کھری تصویر نظر آتی ہے وہیں ادبی لطافت بھی۔ شعروں کا برمحل اور خوبصورت استعمال اور جملوں کے بے ساختگی بھی۔ یہاں پر محمد طفیل مدیر نقوش کے وہ الفاظ جو انہوں نے ان خطوط کے پیش لفظ میں لکھے، پیش خدمت ہیں۔

ہم لٹ گئے۔ آدھا ملک دے بیٹھے

ہم سے مشرقی پاکستان کوئی نہیں چھین سکتا تھا۔ مگر ہم نے خود دے ڈالا۔ پیہم غلطیاں کیں۔ کچھ نادان دوستی میں، کچھ دانا دشمنی میں، مجرم کون ہے۔ یہ راز نہیں مگر راز رہے گا۔

میں کسی کو قصور وار نہیں ٹھہراتا۔ خود کو مجرم گردانتا ہوں۔ میرے ہاتھ میں قلم کی نعمت تھی مگر میں نے اس سے فائدہ نہ اٹھایا۔ میں نے کسی کو نہ بتایا کہ بوڑھی گنگا کا پانی لہولہان ہوگیا ہے۔

صرف میں ہی قصور وار نہیں۔ اس دور کے سارے اہل قلم مجرم ہیں۔ جو صرف ترانے لکھتے رہے مگر اس پر کسی نے غور نہ کیا کہ ترانے لکھنے کی نوبت آئی کیوں کر؟

اس سلسلے میں مسعود مفتی آپ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ دل ان کا دکھا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ جب بھی لکھنے لگتے ہیں ان کے قلم سے خون ٹپکنے لگتا ہے۔

اس نازک موڑ پر، میں اپنے اہل وطن سے کہوں گا کہ ذرا تاریخ اسپین کے اوراق کی طرف تو دیکھئے وہ رو رہے ہیں۔

محمد طفیل

بجا کہتے ہیں محمد طفیل کہ ادیب کے ہاتھ میں قلم کی نعمت تھی مگر اس نے اس سے فائدہ نہ اٹھایا۔ کسی نے مغربی پاکستان میں رہنے والوں کو یہ نہیں بتایا کہ بوڑھی گنگا میں پانی کی بجائے لہو بہہ رہا ہے۔ لیکن مسعود مفتی کی حد تک ان کا یہ بیان درست نہیں۔ انہوں نے قلم سے فائدہ بھی اٹھایا اور قید سے واپس آ کر مغربی پاکستان والوں کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگایا اور ان کو یہ بتانے کی بھرپور کوشش کی کہ بوڑھی گنگا کس طرح لہو ہوئی۔

تنقیدی جائزہ

مسعود مفتی کا ادبی سفر ایک مزاحیہ مضمون سے شروع ہوا۔ بعد میں انہوں نے نثری ادب کی تقریباً تمام اصناف میں اپنے فن کے جوہر دکھائے۔ جس میں مزاح، ناول، ڈرامے، افسانے، ڈائری اور رپورتاژ شامل ہیں۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ وہ خود کس صنف میں لکھنا پسند کرتے ہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ کہانی اور موضوع کے اعتبار سے میں جس صنف کو موزوں سمجھتا ہوں اس میں لکھتا ہوں۔ بعض کہانیاں افسانے کے روپ میں بہتر طور پر پیش کی جا سکتی ہیں اور بعض، ڈرامے یا ناول کی صورت میں، میں خط نہیں کھینچ سکتا کہ کون سی صنف بہتر ہے۔ اسی طرح میں ادب سے صحافت کی طرف اس لئے آیا ہوں کہ یہ خیالات افسانے میں ظاہر نہیں کیے جا سکتے۔ انہوں نے مزید فرمایا کہ:-

> ''مجھے دورانِ ملازمت مختلف جگہوں پر جانے اور مختلف رسم و رواج دیکھنے کا موقع ملا۔ میری بیشتر کہانیاں سچے واقعات پر مبنی ہیں۔ میں نے اپنی کہانیاں اپنے اردگرد کے ماحول سے لی ہیں۔ وہ واقعات جو میرے اردگرد میرے اپنے ملک میں ہو رہے ہیں انہی سے میں نے موضوعات لیے ہیں اور جیسے جیسے مجھے نئے مقامات پر جانے کا اتفاق ہوا میری 'Themes' بدلتی گئیں۔ ابتداء میں میں نے مشترکہ خاندانی نظام کے بارے میں لکھا۔ جب میں بلوچستان میں تھا وہاں کے حالات بالکل مختلف تھے۔ سندھ میں لکھتے ہوئے مقامی رنگ غالب رہا۔ میری بنیادی Theme ہمیشہ 'فرد' اور اس پر ہونے والے مختلف قسم کے جبر ہیں۔ فرد کو ہمیشہ ہی دبایا گیا ہے۔ کبھی مشترکہ خاندان، کبھی مذہب اور کبھی فضول قسم کے رسم و رواج کے نام پر۔''

یہ تینوں عناصر یعنی مذہب کے نام پر ہونے والا جبر، مشترکہ خاندانی نظام کے تحت فرد کی شخصیت پر روا رکھا جانے والا جبر، معاشرتی رسم و رواج کی قیود، آج بھی اسی طرح فرد پر اثر انداز ہو رہی ہیں۔ خدا نے جس بشر کو آزاد پیدا کیا معاشرے، مذہب اور خاندان نے اس کو مختلف قسم کی زنجیروں میں جکڑ کر اس کی

ذہنی اور فکری آزادی سلب کر لی۔ اس پسے ہوئے انسان سے مسعود مفتی کو بہت ہمدردی ہے۔ ان کی تمام تخلیقات میں 'فرد' اور اس کی 'آزادی' مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ اپنے اردگرد پیش آنے والے بے شمار سچے واقعات ان کے ادب میں مختلف کہانیوں کی شکل میں موجود ہیں۔ جوں جوں حالات بدلتے گئے، زندگی بدلتی گئی ان کی کہانیوں کی Themes بے شک بدلیں مگر فوکس ہمیشہ فرد پر ہونے والا جبر ہی رہا۔

ہمارا معاشرہ ایک جابر معاشرہ ہے جہاں پر جبر کی بدترین شکلیں موجود ہیں۔ تینوں متذکرہ اقسام میں مذہب اور معاشرتی رسوم و قیود کے نام پر ہونے والا جبر تو آج بھی مکروہ شکل میں موجود ہے لیکن مشترکہ خاندانی نظام کا جبر اب کچھ کمزور پڑ چکا ہے۔ مذہب کے نام پر ہونے والا جبر، تو آج کے دور میں پہلے سے کہیں زیادہ شدت سے نمایاں ہو چکا ہے۔ اس سے پہلے کم از کم مذہب کے نام پر مسجدوں اور امام بارگاہوں میں گولیاں چلانے اور خودکش دھماکے کرنے کے بارے میں تو سوچا بھی نہیں جاتا تھا۔ اسلام جس کے نام پر مُلا، ملٹری، وڈیرہ گٹھ جوڑ ظلم کر رہے ہیں، ہمیں رواداری کا سبق دیتا ہے، دوسروں کی مذہبی رسومات، مقامات کی حرمت کا درس دیتا ہے، کجا کہ اپنے ہی ہم مذہبوں کی عبادت گاہوں کو بم دھماکوں سے تباہ و برباد کرنا شروع کر دیں۔ رسم و رواج کا جبر بھی انسان کے اوپر قدغن لگاتا ہے۔ اس جبر کی زد میں زیادہ تر خواتین آتی ہیں۔ مسعود مفتی نے کئی کہانیوں میں اس جبر پر لکھا ہے جن میں ''توبہ''، ''خوش قسمتی''، ''کفارہ''، ''بھیڑیے'' اور 'وقار' ایسی ہی شہکار کہانیاں ہیں۔ جن کے بارے میں ڈاکٹر اسد فیض کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا:۔۔

> ''جو احتجاج برسرِ عام ہو سکتا وہ میں افسانے کے ذریعے کرتا ہوں اسی لیے میں
> علامتی افسانے کی بجائے حقیقت پسندی کا قائل ہوں''

مسعود مفتی نے جس عمر میں لکھنا شروع کیا اُس میں انسان کی سوچنے کی صلاحیت بہت تیز ہوتی ہے۔ اس کے ذہن میں ہر وقت سوالات اٹھتے رہتے ہیں جن کے جوابات حاصل کرنے کی تحریک ہوتی ہے۔ کالج کا زمانہ، ہر طالب علم کی ذہنی صلاحیتوں کے عروج کا زمانہ ہے۔ یہ اردگرد کے ماحول کا مشاہدہ اور ذہن میں اٹھنے والے لاتعداد سوالات کے جوابات حاصل کرنے کے لیے تگ و دو کا زمانہ ہے۔ اُسی دور میں مسعود مفتی نے محسوس کیا کہ فرد کس قدر مظلوم ہے اور ایک عام آدمی کو زندگی گزارنے کے لیے کیسی کیسی اذیتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ رسم و رواج کی گرفت تو اس قدر مضبوط ہے کہ ایک اوسط درجے کی ذہانت کا آدمی اس میں پس کر رہ جاتا ہے۔ اس کی تخلیقی صلاحیتوں کو ابھرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ جس کی وجہ سے اس کی شخصیت صحیح طرح سے نشوونما نہیں پاتی۔ یہ جبر ان معاشروں میں زیادہ واضح نظر آتا ہے جہاں پر علم کی روشنی نہیں ہے یا نہ ہونے کے برابر ہے۔ ہمارے دیہی معاشرے میں یہ جبر زیادہ نمایاں ہے۔ عملی زندگی کی پہلی پوسٹنگ ایک دور افتادہ اور پس ماندہ علاقہ پنڈ دادن خان میں ہونے کی

وجہ سے انہیں دیہی زندگی قریب سے دیکھنے اور پرکھنے کا موقع ملا اور انہیں معلوم ہوا کہ مشترکہ خاندانی نظام نے فرد پر بہت جبر روا رکھا ہے۔ خصوصاً جب معاملہ رشتوں یعنی شادی بیاہ کا ہو یا جائیداد کا۔ زمین اور زن دونوں اس جبر کا باعث ہیں۔

مسعود مفتی نے بڑی ہمت اور جرأت سے اپنی تحریروں میں فرد کو مرکزی حیثیت دیتے ہوئے جبر کی متذکرہ بالا تمام اقسام پر قلم اٹھایا ہے۔ انہوں نے پوری دیانت داری سے ان مسائل کو اجاگر کیا ہے۔ انہوں نے ایک ماہر نفسیات کی طرح زندگی کو پرکھا وہ اپنا رشتہ قاری سے قائم رکھنا چاہتے ہیں ڈاکٹر اسد فیض سے گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ:۔

"میں ہر اُس تجربے کا خیر مقدم کرتا ہوں جو ادب سے زندگی اور مصنف سے قاری کا رشتہ قائم رکھے مگر ایسے تجربات سے بھاگتا ہوں جو یہ رشتے توڑ کر ادب کو خلاء میں اڑا لے جائے۔"

ان کا کہنا ہے کہ میں نے فرد کی ذات کو اپنے ادب کا محور بنایا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ خدا نے فرد کو آزاد پیدا کیا ہے۔ پیدائش کے وقت اس پر کوئی لیبل چسپاں نہیں ہوتا۔ اس لیے ہر فرد کو یکساں ترقی کے مواقع میسر آنے چاہئیں۔ وہ ہر اس شے کے مخالف ہیں جو فرد کی آزادی کی راہ میں حائل ہوتی ہے۔ یہی ان کے پسندیدہ موضوعات ہیں۔ ممتاز نقاد اور افسانہ نگار ڈاکٹر محمد احسن فاروقی نے اس بارے میں یوں تبصرہ کیا ہے:۔

"جنگ والے افسانوں میں بھی زور فرد پر ہے اور فرد عام ہنگامی حالات سے مخصوص طرح پر مجروح ہو کر انسان کی انفرادیت کا اعلان کرتا نظر آتا ہے جو عام اصولوں سے بالاتر ہے۔ مسعود مفتی کو اگر "فرد" کا مفکر اور اس کی حالت کا عکاس کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اور اس معنی میں وہ تمام اردو افسانہ نگاروں سے الگ نظر آتے ہیں۔"

فرد کے تشخص کے ساتھ ساتھ مسعود مفتی یہ بھی چاہتے ہیں کہ فرد اپنے حق کے حصول کے لیے جدوجہد کرے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اپنے حق کے لیے آواز اٹھانا فرد کا بنیادی حق ہے۔ وہ "ستون" میں رقم طراز ہیں:۔

"میرا ایمان ہے کہ جب تک ہمارا فرد احتجاج کرنا نہیں سیکھتا اس وقت تک قوم کو اپنی گردن پر سوار متعدد قسم کے تسمہ پاپیروں سے نجات نہیں مل سکتی۔ احتجاج کی کوئی بھی آواز ہو اور چاہے کسی بھی انداز میں ہو، ہماری قوم کے لیے نیک فال ہے۔"

ان کے خاندانی پس منظر، ان کی تربیت اور شخصیت کو دیکھتے ہوئے یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ وہ معاشرے کی منفی قدروں کے خلاف ہیں اور فرد کو معاشرے پر ترجیح دیتے ہیں لیکن انہیں سوشلسٹ ہرگز نہیں کہا

جا سکتا وہ اندر سے ایک کٹر مسلمان ہیں جو اسلام کے علاوہ اور کسی ازم کے قائل نہیں۔ وہ بنیادی طور پر ایک ادیب ہیں اور ایک سچا ادیب ہر دور میں ظلم کے خلاف آواز اٹھاتا ہے۔ اس کے لیے ہر ظالم اور جابر حکمران کے سامنے کلمہ حق کہنا جہاد کا درجہ رکھتا ہے۔ لیکن جہاں تک اسلامی قدروں کا سوال ہے وہ کبھی ان کے خلاف نہیں ہوئے۔ ڈاکٹر انور سدید کہتے ہیں:۔

> ''مسعود مفتی نے ہر اس کی کو نمایاں کیا ہے جس سے معاشرہ داغدار ہوتا ہے اور جس سے صحت مند معاشرے کی ترقی میں رخنہ پڑتا ہے۔ چنانچہ ان کے افسانوں میں مذہب کی کشادگی کے خلاف شاید کوئی جذبہ مرتب نہیں ہوتا لیکن افراد اور اداروں کے خلاف واضح ردعمل مرتب ہوتا ہے۔ جو مذہب کو معاشرتی ریاکاریوں کے لیے استعمال کرتے ہیں اور عقیدے کی تقدیس کے نام پر فسادات برپا کرتے ہیں۔ انہوں نے کسی خاص ازم کو قبول کیے بغیر صرف معاشرے کے تضادات، پاکستانی پس منظر میں نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔
> مسعود مفتی ایک ایسے ادیب ہیں جو اپنے مذہب، روایات، اپنے ملک اور اس کے باشندوں سے شدید محبت کرتے ہیں۔ اگر ان کی تحریروں میں کہیں کہیں ان کے قلم کی زبان بہت زیادہ تلخ بھی ہو جاتی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک سچے، کھرے اور انسانیت سے پیار کرنے والے انسان ہیں۔''

نعیم صدیقی نے اپنے ایک مضمون میں ان کے بارے میں یوں تحریر کیا ہے:۔

> ''میں اس کی تحریروں کی شہادت سے یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہوں کہ وہ انسانوں سے اور انسانیت سے محبت کرتا ہے۔ وہ پاکستان سے اور نظریہ پاکستان سے محبت کرتا ہے۔ وہ ملت و وطن سے محبت کرتا ہے اور دین اور اس کی تہذیبی اقدار سے محبت کرتا ہے۔ مجھے یہ کہنے دیجئے کہ مسعود مفتی ہمارے ادب میں سرتاسر ایک نیا پیکر ہے۔ ایک نیا تجربہ ہے۔ اور ایک نئی دنیا ہے یا نئی دنیا کا معمار۔ ایک ایسا ادیب جس کی رگوں میں پاکستانیت رچی بسی ہے۔''

ادبی کام کی نمایاں خصوصیات

مسعود مفتی کے تمام ادبی کام کی نمایاں خصوصیات کچھ اس طرح سے ہیں۔

مزاح نگاری

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے وہ پہلی ادبی کاوش جس کا خود مسعود مفتی نے یوں تذکرہ کیا کہ "تل کی اوٹ میں پہاڑ چھپا تھا" ایک مزاحیہ مضمون تھا۔ اس طرح ان کی پہلی ادبی کاوش "مسیر راہ ہے" بھی مزاحیہ تحریروں پہ مبنی تھی۔ اس میں مزاحیہ مضامین، افسانے اور انشائیے شامل ہیں۔
مسعود مفتی فرد کا مطالعہ قریب سے کرتے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے زندگی کا بڑے قریب سے مشاہدہ کیا ہے۔ فاصلہ اجنبیت پیدا کرتا ہے اور اجنبیت طنز کو جنم دیتی ہے۔ یہی قربت ان کے ہاں اغماض و درگزر اور ہمدردی کا وہ میلان ابھارتی ہے جو مزاح کا سب سے بڑا محرک ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے ان کے بارے میں ایک جگہ یوں لکھا ہے:۔

"وہ فٹ پاتھ پر اتر کر انبوہ کو چیر کر اور اشیاء سے دست و گریباں ہو کر آگے بڑھتے ہیں لیکن ایک ایسے شخص کی طرح جس نے اپنی شریف آنکھ بند اور شریر آنکھ مستقلاً کھول رکھی ہو۔ وہ راستے کی ہر مضحک شے کو چھیڑتے اور اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ وہ ناہمواریوں کو طنز کا نشانہ اس قدر نہیں بناتے جتنا ان سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ یہی ایک طنز نگار اور مزاح نگار کا مابہ الامتیاز بھی ہے۔ وہ ڈرامائی کیفیات سے مزاح پیدا کرنے میں مشاق ہیں اور چھوٹے چھوٹے واقعات سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔"

مسعود مفتی کا شمار ہمارے ان چند مزاح نگاروں میں ہوتا ہے جن کے اسلوب میں شوخی اور نیم بازسنجیدگی بیک وقت ساتھ ساتھ نظر آتی ہے۔ وہ محض لفظوں کے ہیر پھیر سے مزاح پیدا نہیں کرتے بلکہ وہ اپنے نیم سنجیدہ اور مضحک کرداروں کے لیے ایسے مواقع پیدا کرتے ہیں کہ کامیڈی ناگزیر ہو جاتی

ہے۔واقعات کی ستم ظریفی ان کا خاصہ ہے۔ان کے مزاح کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ وہ زندگی کے مضحکہ خیز پہلوؤں ہی کی ایسی تصویر کشی کرتے ہیں کہ قاری ہنسنے پر ہی نہیں بلکہ سوچنے پر بھی مجبور ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کہتے ہیں:۔

"میرے خیال میں ایک اعلیٰ مزاح نگار کی پہچان محض یہ نہیں کہ وہ اشیاء کے مضحک پہلوؤں کو فی الفور دیکھ لیتا ہے بلکہ یہ کہ خود اشیاء مزاح نگار کو دیکھتے ہی پالتو پلوں کی طرح ناچنا کودنا اور اس کے گرد اچھل اچھل کر چکر لگانا شروع کر دیتی ہیں۔اپنے مضامین میں مسعود مفتی سرکس کے رنگ ماسٹر کے روپ میں ابھرے ہیں اور اشیاء کے علاوہ قارئین بھی ان کے چابک کے ہلتے ہی لس پر اپنی نارمل شریفانہ زندگی کو ترک کر کے اسٹولوں اور تپائیوں کی طرف لپکنے لگتے ہیں۔مزاح کی دنیا میں ایسی شعبدہ گری کوئی معمولی بات نہیں۔"

ترپ چال میں ایک جگہ یوں لکھتے ہیں:۔

"خاکوں کو دیکھ کر اندازہ ہی نہ ہوتا تھا کہ کس چیز کی ڈرائنگ بنائی گئی ہے (بشرطیکہ آپ کسی مجبوری کی وجہ سے اسے ڈرائنگ مان لیں) خطوط کا انداز یہ تھا کہ

نہیں ساحل تری قسمت میں اے موج
ابھر کر جس طرف چاہے نکل جا

کونوں کی جگہ گولائیاں تھیں۔۔۔گولائیوں کی جگہ مربعے۔۔۔اور بعض خطوط اگر بھرپور انگڑائیاں نہ لے رہے ہوتے تو شاید سیدھے خطوط کہلا سکتے۔کسی خاکے کا مجموعی تاثر یوں تھا جیسے اونٹ میز کرسی پر بیٹھا کھانا کھا رہا ہو۔کوئی ایسا لگتا تھا جیسے ساحل کی چکنی ریت پر کیڑے چل رہے ہوں۔ایک میں دیگچی کی ہلکی سی تشبیہ ضرور تھی لیکن وہ بھی ایسی جیسے میاں بیوی کی لڑائی میں بطور دلیل استعمال کی گئی ہو۔۔۔ٹیڑھی میڑھی۔۔۔دبی پچکی ہوئی۔"

مسعود مفتی کے افسانے خواہ زندگی کے عام مسائل کے بارے میں ہوں، جنگ کے بارے میں ہوں یا مشرقی پاکستان کے بارے میں، ان میں ہلکا پھلکا مزاح اور بھرپور طنز ایک پسندیدہ عنصر کی طرح شامل ہے جس کی وجہ سے ان کے مزاح میں ایک خاص قسم کے نئے پن اور تازگی کا احساس ہوتا ہے۔مزاح مسعود مفتی کی اولین صفت ہے۔گو کہ بعد میں یہ سنجیدہ افسانہ نگاری کی طرف چل پڑے لیکن ان کے اندر کا انسان جو تخلیقی جذبہ کے ساتھ مزاح کی حس سے بھی آشنا ہے، ہمیشہ اپنا اثر دکھاتا رہا۔ان کے سنجیدہ

افسانوں پر بھی اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ صرف موضوع کی سنجیدگی نے ان کو سنجیدہ افسانہ نگار بنا دیا۔

انہوں نے اپنی سنجیدہ تحریروں میں صرف تشبیہوں اور استعاروں سے ہی شگفتگی پیدا نہیں کی بلکہ خالصتاً مزاح بھی لکھا۔ مثلاً:

"وکیل صاحب نے اس کی رپورٹ ایسی رازداری سے سنی جیسے ایک ہمسائی دوسری ہمسائی سے تیسری کی بات کرتی ہے اور رپورٹ سن کر ایسے مایوس ہوتی ہے جیسے دوسری ہمسائی کو پہلے سے ہی علم تھا۔" (لاعلم)

سلیم الرحمان نے پاکستان ٹائمز میں ان کے فن کی اس خوبی کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:-

"Masud Mufti does not jiggle with words - his pose is straight and matter of fact - but he does jiggle with situations and the idiosyncrasies and occasionally idiocies, of his standard characters or his countrymen at large."

تنوّع اور رنگارنگی

ایک اور خاصیت جو مسعود مفتی کے ہاں بڑی نمایاں ہے وہ ان کے ادب میں رنگارنگی ہے۔ ان کے ہاں کردار، حالات اور واقعات میں بے حد تنوع پایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ بظاہر یہ نظر آتی ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی میں بے شمار جگہیں دیکھیں، قسم قسم کے لوگوں سے ان کا واسطہ پڑا۔ دیہی زندگی، شہری زندگی، یورپی ملکوں کی زندگی، مشرق بعید کے ملکوں کی زندگی، انہیں سب کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور انہوں نے اس کے اچھے اور بُرے دونوں پہلوؤں کا مشاہدہ کیا۔ اسی طرح اپنے ملک کے سرداری نظام، جاگیرداری نظام، مشترکہ خاندانی نظام کے ساتھ ساتھ مغربی ملکوں کے معاشرتی نظام کا بھی بڑے قریب سے مطالعہ کیا۔ عملی زندگی میں انہوں نے تقریباً ہر قسم کے حالات و واقعات کا مشاہدہ کیا۔ دورانِ ملازمت سوائے صوبہ سرحد کے ان کو ملک کے چاروں صوبوں بشمول مشرقی پاکستان جانے کا موقع ملا۔ نہ صرف ملک، بلکہ بیرون ملک انگلینڈ اور منیلا میں بھی مقیم رہے۔ اس کے علاوہ بھی وہ قریباً آدھی دنیا گھوم چکے ہیں۔ اس چیز کا فائدہ اور تو ان کو ہوا یا نہ ہوا، یہ ضرور ہوا کہ ان کی تحریروں میں قاری کو

یکسانیت نظر نہیں آتی۔ اس کا تذکرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر اسد فیض کے اس سوال کے جواب میں انہوں نے کہا:۔

> "زندگی کے جس راستے سے میں گذرا وہاں سے پھول اور کانٹے چن کر ادب کے گلدستے بناتا رہا ان میں میری اپنی سوچ اور اپنے زمان و مکاں کی محتاط تفصیلات اس طرح جھلک رہی ہیں کہ قاری میری زندگی کے خاکے سے آگاہ ہو جاتا ہے۔"

انہوں نے فرد، اس کی مذہبی اور اجتماعی زندگی کے تضادات اور ان سے ابھرنے والی حقیقتوں کو افسانوں کا رنگ دیا ہے۔ ان کے افسانے محدب شیشہ، دعا، یا خدا، توبہ، کفارہ اور صدیوں پار وغیرہ ایسے افسانے ہیں جو اس ضمن میں مثال کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔

روزنامہ نوائے وقت کے اختر امان نے اپنے کالم میں مسعود مفتی کی اس خاصیت کے بارے میں یوں تبصرہ کیا ہے:۔

"مسعود مفتی کے ہاں نہ صرف موضوعات کا تنوع ہے بلکہ کردار بھی مختلف انواع کے ہیں۔ ان کے کرداروں میں وہ تمام خامیاں موجود ہیں جو انسانوں میں عام پائی جاتی ہیں۔ وہ نہ فرشتے ہیں نہ شیطان، ان پر واقعات، بدلتے ہوئے حالات کا اثر ہوتا ہے۔

> "مسعود مفتی نے موضوع اور کرداروں کے تنوع سے اس یکسانیت کو توڑا ہے جو ترقی پسند افسانہ نگاروں کے ہاں پیدا ہو گئی تھی۔ انہوں نے ترقی پسندوں کی طرح افراد کو بری الذمہ قرار نہیں دیا اور نہ ہی تمام تر سماجی برائیوں کی ذمہ داری معاشرے یا معاشرے میں مروج نظام کے سر تھوپ دی ہے۔ بلکہ معاشرے اور افراد کے ایک دوسرے پر مرتب ہونے والے اثرات اُن کے افسانے کا موضوع ہیں۔"

مسعود مفتی کے افسانوں میں مثبت اور منفی قوتوں کا واضح تصادم قدم قدم پر ملتا ہے۔ معاشرے کے حالات کچھ ایسے ہو گئے ہیں کہ انسان کی شخصیت ریزہ ریزہ ہو کر ٹکڑوں میں بٹ کر رہ گئی ہے۔ ہر ایک نے اپنی اصلی شخصیت کو اس طرح رکھا ہے کہ اس کی اصل شخصیت کی پہچان مشکل ہے۔ یہ انہی کا ہی کمال ہے کہ انہوں نے ان دبیز پردوں سے بھی انسان کی اصل شکل تک رسائی حاصل کر لی ہے قاری کو احساس دلایا ہے کہ انسان جو کچھ ہوتا ہے اس "ہونے" تک پہنچنے میں اس کو بہت سے ایسے واقعات و حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے جن پر اس کا کوئی بس نہیں چلتا وہ محض ایک ایسا 'کھلونا' ہے جس کا کنٹرول کسی دوسرے ہاتھ میں ہے۔ ان تمام عوامل کے ادراک نے اُن کے ادب کو تنوع اور رنگا رنگی بخشی ہے۔

یہ بات ان کی شخصیت میں بھی نمایاں نظر آتی ہے۔اُن سے مل کر دیکھیں، وہ آپ کو پہلی نظر میں ایک اعلیٰ درجے کے بیوروکریٹ نظر آتے ہیں۔ چہرے پر وہی سنجیدگی، گردن میں وہی تختی اور عمدہ درجے کا تازہ تازہ استری شدہ لباس، تھوڑی دیر بات کر کے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ یہ ایسا شخص ہے جو ہنستا بھی جانتا ہے اور رونا بھی۔ سنجیدگی تو خول ہے۔انہیں تو بات بات پر کھل کر قہقہہ لگانا بھی آتا ہے۔ان کا تکیہ کلام ہے "بڑی مزیدار بات ہے جی۔" وہ کوئی بہت دلچسپ واقعہ سناتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک عام آدمی جیسے ہیں اور دوسروں کی بات بہت توجہ اور دلچسپی سے سن کر اُسے اہمیت بھی دے رہے ہیں۔ ہمارے ذہن میں خشک بیوروکریٹ کا تاثر جلد ہی وہ اپنی گفتگو سے زائل کر دیتے ہیں۔ ان کے وسیع و عریض ڈرائینگ روم میں مغربی آرائش اور مشرقی مہمان نوازی بیک وقت نظر آتی ہے۔ان کے ڈرائینگ روم کی کھڑکیوں کے پردے ہٹا کر باہر جھانکیں تو بہت خوبصورت پھول پودے اُن کی فطرت سے محبت ظاہر کرتے ہیں۔غرض یہ کہ تنوع اُن کے ادب اور ذات میں بیک وقت دکھائی دیتا ہے۔

یہ تنوع ان کی ادبی کاوشوں کے انتخاب میں بھی نمایاں ہے۔انہوں نے خود کو کسی ایک صنف تک محدود نہیں رکھا بلکہ تمام اصنافِ نثر میں قلم کے جوہر دکھائے ہیں۔ ناول ہو یا افسانہ ہو۔ رپورتاژ ہو یا مزاح، انہوں نے سب میں انفرادیت دکھائی ہے اور ہر صنفِ نثر سے انصاف کیا ہے۔ ناول لکھا مگر بہت ہی مختصر لیکن اس قدر جامع اور موثر کہ اس کو ٹیلی ویژن والوں نے ایک سیریل کی شکل میں پیش کر دیا۔ڈرامے ایسے لکھے کہ اُن پر بنیادی طور پر ڈرامہ نگار ہونے کا گماں ہونے لگا۔اُن کے افسانے پڑھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تمام کہانیاں حقیقت کا تاثر لیے ہوئے خوبصورت طرزِ تحریر کی حامل ہیں جو اُن کو افسانہ نگاروں میں ممتاز درجے پر فائز کرتی ہیں۔ اُن کی انعام یافتہ رپورتاژ "چہرے" اس قدر پُراثر ہے کہ قاری خود بھی مشرقی پاکستان کو آخری ہچکی لیتے ہوئے محسوس کرتا ہے اور سقوطِ ڈھاکہ کے وقت وہاں موجود ہے۔'چہرے' کے متعلق احمد ندیم قاسمی نے یوں تبصرہ کیا:-

> "پاکستان کی تاریخ کا وہ نازک ترین اور المناک ترین لمحہ مسعود مفتی نے جس کربِ لامحدود کے ساتھ بسر کیا، اس کی نہایت سچی اور نہایت سلیس روائیداد جب تک پڑھی جاتی رہی، نیشنل سنٹر کا ہال سنانے میں آیا رہا۔۔۔حاضرین کی اکثریت کو رُلا دیا۔ جو رو نہ سکے وہ لرزتے رہے اور سوچتے رہے کہ تاریخ کے حامل کردار بعض اوقات ملکی آبادیوں سے کیسے کیسے قیامت خیز مذاق کر جاتے ہیں۔"

28 جنوری 1974 کو پاکستان نیشنل سنٹر کی ایک تقریب میں پڑھے جانے والے 'چہرے' کے انہی اقتباسات کے بارے میں انتظار حسین نے روزنامہ "مشرق" میں اپنے کالم میں لکھتے ہوئے کہا:-

"۔۔۔یہ محفل، محفلِ گریہ بن گئی۔ مسعود مفتی اپنا مضمون سنا رہے تھے اور لوگوں کی آنکھوں سے آنسو امڈ رہے تھے۔ مشرقی پاکستان کے آخری لمحوں کی داستان تھی۔ وہ بیان کر رہے تھے کہ مشرقی پاکستان نے کیسے دم توڑا۔ نزع کے وقت کیا عالم تھا اور بنگلہ دیش کی پیدائش کیا رنگ لائی۔۔۔؟"

ان کی زندگی کے تجربات کا تنوع اُن کے ادب میں بھی نظر آتا ہے مزاح لکھنے اور کارٹون بنانے سے ادبی سفر کا آغاز کرنے والے مسعود مفتی اس وقت اپنے انگریزی اور اردو کے اخباری کالموں کے ذریعے قارئین کو ملکی مسائل سے روشناس کرانے اور ان کے حل کے لیے عملی جدوجہد کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان پر یا اُن کے ادبی کام پر کوئی ایک چھاپ نہیں لگائی جا سکتی۔ انہوں نے اپنی انفرادیت کو کسی بھی لمحہ نہیں کھویا۔ ان کے لکھے ہوئے کسی بھی افسانے کو پڑھیں، ایک دو پیراگراف پڑھنے کے بعد اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ قلمکار کون ہے؟ اور یہ کسی بھی قلمکار کی بہت بڑی صفت ہے۔ انہوں نے کسی تحریک سے وابستہ ہوئے بغیر استحصالی نظام اور معاشرتی جبر کے خلاف خوب لکھا ہے۔ سعادت حسن منٹو، غلام عباس اور انتظار حسین جیسے بڑے افسانہ نگار بھی کسی تحریک سے وابستہ رہے، نہ کسی منشور کے پابند ہوئے مگر بنیادی طور پر ایک دانشورانہ جدوجہد ان کے ہاں ملتی ہے ایسی ہی جدوجہد کی مثالوں سے مسعود مفتی کی تحریریں بھری پڑی ہیں!

نوائے وقت میں اختر امان یوں تبصرہ کرتے ہیں:۔

"مسعود مفتی ترقی پسند افسانہ نگاروں کی طرح حقیقت پسند تو ہیں، مگر ان کی حقیقت پسندی ترقی پسندوں کی طرح ایک ہی طبقے کے مصائب بیان کرنے سے مشروط نہیں ہے۔ بلکہ انہوں نے زندگی کے تمام پہلوؤں اور معاشرے کے تمام طبقوں کی انفرادی اور اجتماعی رویّوں کی عکاسی کرتی ہے اور پھر وہ جس مخصوص ماحول یا فضا میں رہ کر کرداروں کا مطالعہ کرتے ہیں وہ فضا خالصتاً پاکستانی فضا معلوم ہوتی ہے۔

مسعود مفتی نے ایک طرف افسانہ میں اس خلا کو پُر کیا جو ترقی پسند افسانوں یا علامت نگاروں کے ادب اور تخلیقی زوال کے سبب پیدا ہو گیا تھا تو دوسری طرف موضوعات کے اعتبار سے افسانے میں ایک نئی روایت کی بنیاد بھی رکھ دی۔ اس طرح مسعود مفتی نے افسانے کو موضوعات کی یکسانیت سے نکال کر بند دروازوں کو کھول دیا اور نئے موضوعات کے تازہ جھونکوں سے افسانے کے پودے کو مرجھا جانے سے بچا لیا۔

کچھ دوسرے افسانہ نگاروں کے برعکس مسعود مفتی کا فکری اور مطالعاتی پس منظر زیادہ وسیع ہے۔ لیکن محدب شیشے کے کچھ افسانوں میں جہاں انہوں نے کرداروں اور ماحول کا انتخاب تاریخی تناظر میں کیا، وہاں رگ سنگ، چہرے اور ریزے میں شامل تحریریں اپنے ملک میں رونما ہونے والے واقعات، اجتماعی جبر سے انفرادی رویوں میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں، مشکلات کے بھنور میں گھرے انسانوں کی امید و بیم کی کیفیات اور نفرت کی گود میں جنم لینے والے انسانوں کی بربریت کا اظہار کرتی ہیں۔''

حقیقت نگاری اُن کا اولین مقصد ہے اپنے ایک انٹرویو میں ڈاکٹر اسد فیض سے گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے کہا:۔

''ادیب کو حقیقت نگار ہونا چاہیے اگر وہ اپنے گرد و پیش سے بے خبر ہے تو اُسے کوئی حق نہیں کہ وہ فرضی تصویریں پیش کرتا ہے اگر وہ ادیب ہے تو حقیقت اور صداقت پر مبنی تحریریں تخلیق کرے گا اور اگر مصلحت کوش ہے تو نہیں کرے گا''

روزنامہ مشرق میں انتظار حسین نے مسعود مفتی کے ادب میں تنوع کی خاصیت کا یوں ذکر کیا ہے:۔

''ویسے افسری انکی افسانہ نگاری کو مہنگی نہیں پڑی۔ افسری کے ہی واسطے سے وہ ایسے تجربے سے دوچار ہوئے جو اب افسانہ نگار مسعود مفتی کے بہت کام آرہا ہے۔ ان کی پوسٹنگ ڈھاکہ میں ہوئی تھی وہاں انہوں نے خانہ جنگی کی قیامت دیکھی، مشرقی پاکستان کا زوال دیکھا، اسیری کی زندگی دیکھی، اس بڑے تجربے نے افسر کو کچھ دیا ہو یا نہ دیا ہو، افسانہ نگار کو بہت کچھ دیا ہے کہ ایسے تجربے آدمی کو بے شک بہت اذیت پہنچاتے ہیں مگر لکھنے والے کو وہ بہت دولت بخش جاتے ہیں۔''

حقیقت نگاری

مسعود مفتی نے ایک موقع پر کہا ''حقیقت نگاری میرا مسلک ہے۔'' ان کی خوبی ہے کہ انہوں نے اپنے قاری کو کبھی تخیلاتی دنیا کی سیر نہیں کرائی۔ بلکہ یہ دنیا جیسی بھی ہے، اپنی تمام تر اچھائیوں، برائیوں، خوبصورتیوں کے ساتھ اس کو ویسا ہی پیش کر دیا ہے اور فیصلہ کرنے کا اختیار قاری کو سونپ دیا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید نے مسعود مفتی کے افسانوں پر بحث کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے:۔

''مسعود مفتی کے افسانوں میں ان کے کردار حقیقی زندگی سے آشنا ہی نہیں بلکہ یہ اس ماحول کے بڑے عمدہ عکاس ہیں جس میں مسعود مفتی اور اس کے زمانے کے دس کروڑ لوگ سانس لے رہے ہیں۔ ''محدب شیشہ'' کا ماسٹر برکت علی جو اپنی آخرت سنوارنے کے لیے ایک بیوہ کے آنسو پونچھنے لگتا ہے اور خود مجسم آنسو بن جاتا ہے۔ ''گورکن'' کا اللہ بخش جس کے لیے ہر میت زندگی کی نوید لے کر آتی ہے لیکن جب اپنا لڑکا مر جاتا ہے تو انسانی زندگی کی قدر و قیمت آشکار ہوتی ہے اور جو پدری شفقت سے مغلوب ہو کر قبر کھودنے سے ہی انکار کر دیتا ہے۔ یہ سب کردار ایسے ہیں جو ہمارے لیے قطعاً اجنبی نہیں۔ یہ ہمارے معاشرے کا اہم ترین حصہ ہیں۔ ہم ان سے ہر روز ملاقات کرتے ہیں اور انہیں زندگی کے المیوں کا شکار ہوتے دیکھتے ہیں۔''

انہوں نے اپنے افسانوں میں کردار، قاری اور اپنے درمیان کوئی خلیج حائل نہیں کی۔ وہ اپنے افسانے کو تخلیق کرتے وقت پلاٹ کی اہمیت کو کبھی نہیں بھولتے۔ وہ حقیقت کا ادراک رکھتے ہیں اور پھر اس کو کرداروں کے عمل اور ردعمل کے ذریعے سے پیش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کردار قاری کو کسی اجنبی دنیا کے باسی نہیں لگتے بلکہ وہ محسوس کرتا ہے کہ یہ اس کے اردگرد پھیلے ہوئے ہیں جو زندگی کے نشیب و فراز میں اس کے ہمراہ ہیں۔ انہوں نے زیادہ تر متوسط طبقے کے مسائل کو پیش کیا ہے۔ یہ وہ طبقہ ہے جس پر ہمارے معاشرے کا ڈھانچہ کھڑا ہے۔ لیکن اس طبقے کا یہ المیہ ہے کہ معاشرتی دباؤ بھی سب سے زیادہ اسی پر ہے۔ ''نام'' کی گمنام لڑکی جو 'اخلاق' کا تحفظ کرتے کرتے کنواری رہ جاتی ہے سمجھتی ہے کہ اس کے لیے 'نام' ہی اہمیت کا حامل ہے۔ ہمارے اردگرد کتنے ہی ''محدب شیشہ'' کے ماسٹر برکت علی یا پھر 'نام' کی اس گمنام لڑکی جیسے کردار چل پھر رہے ہیں۔ چونکہ مسعود مفتی ایک دانشور ہیں اور مفکر بھی اور مفکر کا کام ہے کہ وہ اپنے اردگرد پھیلی ہوئی برائیوں کے حل کے لیے بہتری کی راہ سوچے۔ اس لیے کسی اور کو یہ کردار نظر آئیں یا نہ آئیں، اُن کی نظر ان کرداروں کو ضرور دیکھتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ انہیں معاشرے کے سامنے احتساب کے لیے پیش کرتی ہے تاکہ معاشرے کو ان برائیوں سے پاک کیا جائے لیکن اس سارے عمل میں وہ قاری کو یہ احساس بالکل نہیں ہونے دیتے کہ مصنف اس کا ہاتھ پکڑ کر کسی خاص راہ پر لے جا رہا ہے۔ منیر احمد شیخ نے کتاب سرِ راہے پر تبصرہ کرتے ہوئے ادب لطیف میں یوں تبصرہ کیا:۔

''مسعود مفتی ہماری زندگی کی برائیوں اور خرابیوں کو اس انداز میں چھوتے ہیں کہ وہ سطح پر تیرتی ہوئی نظر نہیں آتیں بلکہ ان کے بیان کو کسی خاص واقعے کے

اندر رکھ کر سمویا گیا ہے۔ اس طرح وہ بات ایک سید ھے سپاٹ بیان کی بجائے
فنی طریق اظہار کا حصہ بن جاتی ہیں۔''

متوسط طبقہ ہمارے ملک میں سب سے زیادہ مظلوم اور معاشرے کی ریاکاری کا سب سے بڑا شکار ہے۔ عددی اعتبار سے سب سے بڑا ہونے کی بنا پر معاشرے کی تعمیر نو میں سب سے اہم کردار بھی ادا کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسعود مفتی نے خصوصی طور پر اسی طبقے کو چنا۔ 'ان کی کہانیوں کی متوسط طبقے کے گرد گھومنے کی وجہ اُن کی شعوری کوشش ہے۔ اس کوشش میں کئی بار منٹو کے بہت قریب نظر آتے ہیں۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ وہ ادب کے کسی مخصوص طبقے سے تعلق رکھتے ہیں میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔ وہ 'اچھے ادب' سے متاثر ضرور ہیں مگر بغیر کسی تعصب کے۔ 'ترقی پسند ادب' کی تحریک چلی تو انتہا پر پہنچ گئی ہر مروجہ چیز سے بغاوت کا علم اٹھالیا گیا۔ اسی طرح 'تجربات' کی تحریک چلی تو علامتی افسانے کا دور ہوا جس میں Symbolism پر بہت زور دیا گیا۔ مسعود مفتی کا خیال ہے کہ وہ اگر کسی بھی تحریک سے متاثر ہوتے تو ان کو اس تحریک کی پابندیوں میں رہنا پڑتا اور جو کچھ وہ کہنا چاہتے تھے کہہ نہ پاتے۔

اپنی انفرادی فکر کے بارے میں خیالات کا اظہار کرتے ہوئے انہوں نے کہا:۔

''میں کسی افسانہ نگار سے اس طرح متاثر نہیں کہ باوضو ہو کر پیروی کروں مگر بطور قاری فرانسیسی ادیب موپاساں کو بے حد پسند کرتا ہوں وجہ یہ ہے کہ ان کا قلم منافق نہیں۔ اس میں اظہار کی جرأت ہے۔ مگر شعوری طور پر کسی کی بھی نقالی نہیں کرتا۔''

ڈاکٹر انور سدید ماہنامہ تخلیق میں اپنے مضمون ''مسعود مفتی۔ سوشلسٹ حقیقت نگاری کی ایک مثال'' میں یوں تبصرہ کرتے ہیں:۔

''میری نظر میں سعادت حسن منٹو کے بعد نئے افسانہ نگاروں میں مسعود مفتی ایک ایسے افسانہ نگار ہیں جنہوں نے معاشرے کے تضادات کو رومانی لب ولہجہ اختیار کیے بغیر بڑے حقیقت پسندانہ انداز میں بے نقاب کیا ہے۔ یوں انہوں نے اپنے افسانے کی مدد سے معاشرے اور اس میں جنم لینے والے کرداروں کو آئینہ دکھانے کا عمل جاری رکھا ہے اور ادب میں اس چراغ کو نئی روشنی کی آرزو میں اپنے خونِ جگر، فکری تازگی اور نظریاتی سچائی سے تیل مہیا کیا ہے جو پاکستان میں موجود استحصالی نظام اور زوال پذیر اقدار کے اندھیروں میں ٹمٹما رہا تھا۔''

ترقی پسندوں نے چند موضوعات کو اپنے لیے چن کر خود کو ان میں محدود کر لیا تھا اور تجریدی ادب میں علامت ہی فن کی معراج ٹھہری تھی۔ مسعود مفتی پر الزام لگا کہ یہ تجریدیت کے منکر ہیں حالانکہ ان کا کہنا ہے کہ 'افسانہ' میں 'کہانی' ہو جو قاری تک پہنچ سکے۔ اگر علامت میں ابلاغ ہے اور قاری ادیب کے مافی الضمیر سے آگاہ ہو جاتا ہے تو ٹھیک ہے لیکن اگر افسانے میں سے کہانی کا عنصر خارج کر دیا جائے تو افسانہ، افسانہ نہیں رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے تجریدیت کے علمبردار ادیبوں نے بھی دوبارہ حقیقت نگاری کی طرف رجوع کر لیا ہے۔

وہ مقصدیت کے ساتھ فن کے تقاضوں کو بھی پورا کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں ادیب کے اپنے نکتہ نظر اور مقصد میں فرق صرف ڈگری یا درجے کا ہوتا ہے۔ گڑ کو پانی میں شامل کرنے سے بے شک مٹھاس آتی ہے لیکن ایک حد سے زیادہ ڈالنے سے وہ مٹھاس بھی ناقابلِ برداشت ہو جائیگی۔ ادیب کو بھی بس اسی طرح سنبھل سنبھل کر 'مقصد' کو اپنے فن میں شامل کرنا چاہیے۔ یہ نہ ہو کہ اس کا قاری یہ محسوس کرے کہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کسی خاص سمت لے جانے کی کوشش ہو رہی ہے۔ جہاں قاری کے ذہن میں اس خدشے نے سر اٹھایا وہیں 'فن' کی موت ہو جائے گی۔ ادب میں اس کی مثال یوں لی جا سکتی ہے کہ اقبالؔ اور فیضؔ اپنے اپنے عہد کے بہت بڑے نام ہیں ان دونوں کے ہاں اپنا اپنا نکتہ نظر تو ہے لیکن انہوں نے اپنی جمالیاتی حس کا بڑا خوبصورت استعمال کیا۔ اقبالؔ کے سامنے بڑا واضح مقصد ملتِ اسلامیہ کی نشاۃِ ثانیہ تھا جبکہ فیض کے سامنے 'سوشلزم'۔ ان دونوں کی عظمت اس سے عیاں ہے کہ انہوں نے فن کے تمام تقاضوں کو ملحوظ رکھا اور جمالیاتی پہلوؤں کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ غالب کے ہاں Universal Wisdom پایا جاتا ہے۔ مسعود مفتی کے ادب کا مرکز فرد اور تحریر کا محور حقیقت نگاری ہے۔

نعیم صدیقی سہ ماہی "سیارہ" میں اپنے مضمون "نقوش کا عصری نمبر۔ایک تاثر" میں لکھتے ہیں۔:۔

> "ڈرامہ 'روپے' میں معاشرے میں پائی جانے والی دولت اور اخلاق کی کشمکش کی بھرپور عکاسی ہے۔ مکالمے اگرچہ اعلیٰ ادبی انداز کے ہیں مگر ہیں بالکل ویسی ہی باتوں پر مشتمل جیسی آج گھروں میں، بسوں میں، ہوٹلوں میں اور بازاروں میں وقتاً فوقتاً سنی جاتی ہیں۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ مفتی نے اپنے ماحول سے بے شمار مکالمے اور ذہنوں سے خیالات چن کر ان کا رس نکال لیا ہے۔ کوئی بات مصنوعی اور خلافِ واقعہ معلوم نہیں ہوتی۔ کہیں بیرونی تہذیب کو پاکستانی معاشرے پر زبردستی اوڑھایا نہیں گیا ہے۔"

انتظار حسین نے کیا خوب کہا "خاندان کی مذہبیت نے مسعود مفتی کو افسانہ نگار بنادیا۔" مگر یہ بات بھی حقیقت ہے کہ اس مذہبیت نے روایتی مُلائیت کا روپ ہرگز نہیں دھارا۔ بلکہ انہوں نے اسلام اور اس کی عبادات کی روح کو سمجھا اور سچے دل و دماغ سے ان کو قبول کیا۔ مذہب کے نام پر معاشرے میں جو ظلم وستم ہوئے اور جس جس طرح سے فرد کی آزادی کو کچلا گیا، مسعود مفتی کی نظر میں یہ ہرگز اسلام کی خدمت نہیں۔ اسلام دینِ فطرت ہے۔ جس نے احترامِ آدمیت سکھایا۔ عربوں کے اس معاشرے میں جس میں بیٹی کو پیدا ہوتے ہی دفنا دیا جاتا اور عورت کی تذلیل کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا جاتا تھا، اس میں جنت کو ایک عورت یعنی ماں ہی کے قدموں میں تلاش کرنے کا حکم دیا۔ کجا اس مذہب کے نام پر قتل وغارت اور فرد کو مصلوب کرنا۔ بظاہر یوں لگتا ہے کہ مسعود مفتی نے مذہب کے خلاف لکھا ہے لیکن ان کی تحریریں پڑھ کر قاری یہ 'سوچنے' پر مجبور ہوتا ہے کہ یہ مذہب نہیں بلکہ اُس کی بگڑی ہوئی شکل ہے، جس کے خلاف لکھا گیا ہے۔ ان کا مسلک ہے کہ فرد کی آزادی کی راہ میں کسی کو حائل نہیں ہونا چاہیے خواہ وہ مذہب ہی کیوں نہ ہو۔

روزنامہ مشرق میں اپنے کالم 'باتیں اور ملاقاتیں' میں مشہور افسانہ نگار انتظار حسین، مسعود مفتی کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:-

> "اردو افسانے میں مفتی یک نہ شد دو شد۔ ممتاز مفتی بھی کچھ کم نہ تھے کہ اب ان کے بعد مسعود مفتی اپنے رنگ کے ساتھ افسانے کی دنیا میں آ گئے ہیں۔ ویسے وہ کہتے یہ ہیں کہ افسانے کی دنیا میں آنے کا مجھے کوئی شوق نہیں تھا، میں تو صحافی بننے کی دھن میں تھا۔ مسعود مفتی ایک مذہبی گھرانے کے بیٹے ہیں۔ انہوں نے اپنے خاندان سے اپنے معاشرے کو پہچانا کہ دونوں جگہ ایک ہی صورت تھی، بات بات پر کفر کا فتویٰ لگتا تھا اس کے ردعمل میں وہ افسانہ نگار بن گئے۔ کہتے ہیں کہ میں کھل کر تو کچھ نہیں سکتا تھا اس لیے افسانے لکھنے شروع کر دیے۔ مسعود مفتی کتنے فائدے میں رہے سانپ بھی مر گیا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹی۔ معاشرتی اور خاندانی جبر کے خلاف نعرۂ حق بھی بلند کر دیا اور بال بھی بیکا نہ ہوا۔"

ڈاکٹر انور سدید اپنے طویل مضمون "مسعود مفتی۔ سوشلسٹ، حقیقت نگاری کی ایک مثال" میں مسعود مفتی کے مذہبی رنگ کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:-

''مسعود مفتی نے مذہبی عقائد اور غیر صحت مند غیر انسانی رسم و رواج کے شکنجے میں پھنسے کردار پیش کیے ہیں جو مذہب کے لیے ایک دوسرے کا خون بہاتے ہیں اور مذہب کی بنیاد پر ہی انسانی معاشرے کو ایک خاص سانچے میں ڈھالنے کی جستجو میں اس بت کی قربان گاہ پر سینکڑوں افراد کو قربان کر دیا جاتا ہے۔ کچھ لوگ مذہب کے نام پر ایک دوسرے کا خون بہاتے ہیں اور کچھ لوگ عمر بھر مذہب کو دوسروں کے استحصال کے لیے آلہ کار کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ گویا مسعود مفتی نے مختلف مذاہب کی بنیاد پر استوار ہونے والے معاشروں، ان کے تضادات اور ان تضادات کے نتیجہ میں ہونے والے تصادموں کا ذکر کیا ہے۔ اور انسانی تاریخ کے وسیع کینوس پر بعض افسانے لکھے ہیں جن میں مختلف مذاہب کے علمبردار اپنے پرچم کو بلند۔۔۔ اور دوسروں کے پرچم سرنگوں کرنے کے لیے ہولی کھیلتے رہے۔ مسعود مفتی کے نزدیک مذہب نہ صرف معاشرتی جبا ئزم کی علامت ہے بلکہ مذہب نے مختلف افراد کو بھی شکنجے میں کر رکھا ہے اور افراد اپنے فکر و عمل کے دائرے کو اس مذہب کے مقرر کردہ رویوں سے مشروط کر لیتے ہیں اور مذہب کے سحر میں مبتلا ہو کر انسان لاتعداد غیر انسانی، غیر فطری عادات کا اظہار کرتا ہے۔ ان کو جنم دیتا چلا جاتا ہے۔ میرے نزدیک مسعود مفتی پاکستان کا واحد افسانہ نگار ہے جس نے مذہب اور اجتماعی زندگی پھر مذہب، اجتماعی زندگی اور انفرادی زندگی کے تضادات اور تضادات سے ابھرنے والی حقیقتوں کو افسانے کا رنگ دیا ہے۔''

غالباً آلڈوس ہکسلے (Aldous Huxley) کا قول ہے کہ:-

''بالغ نظر شخصیت وہ ہوتی ہے جو ایک سسٹم کے تحت پروان چڑھے اور بعد میں وہی شخصیت اسی سسٹم کی منفی چیزوں کے خلاف علم بغاوت بلند کر سکے۔''

مسعود مفتی پر یہ قول حرف بہ حرف صادق آتا ہے۔ وہ مذہبی ماحول کے پروردہ تھے لیکن اپنی بالغ نظری سے معاشرے کی منفی قوتوں کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے کے قائل ہوئے۔ ادب ماحول کا عکاس ہوتا ہے ادب زندگی کی جھلک پیش کرتا ہے۔ مسعود مفتی کے بقول ''ادب کو اگر جہنم میں ڈالیں گے تو وہ جہنم کی تصویر پیش کرے گا اور اگر جنت میں ڈالیں گے تو جنت کی۔'' یہی وجہ ہے کہ ان کے ادبی شاہکار پڑھتے ہوئے قاری خود کو بھی اس کا ایک حصہ سمجھتا ہے۔ اسے احساس ہوتا ہے کہ جو کچھ اس افسانے میں ہو رہا ہے، ایسا ہی اُس پر بیت چکا ہے جس سے مصنف پوری طرح باخبر ہے۔

ڈاکٹر انور سدید نے ان کی مذہبیت کے بارے میں یوں تبصرہ کیا:-

''سچا ادب ہمیشہ آزاد اور غیر مقلد ہوتا ہے۔ وہ ہر دور میں ظلم کے خلاف آواز اٹھاتا ہے اور جابر سلطان کے سامنے کلمۂ حق کہتا ہے۔ مسعود مفتی چونکہ ایک ادیب ہے اس لیے اس نے بھی یہ آواز بڑے موثر انداز میں بلند کی ہے اور ہر اس کی کو نمایاں کیا ہے جس سے معاشرہ داغدار ہوجاتا ہے اور صحت مند معاشرے کی ترقی میں رخنہ پڑتا ہے۔ چنانچہ اس کے افسانوں میں مذہب کی کشادگی کے خلاف تو شاید کوئی جذبہ مرتب نہیں ہوتا لیکن ان افراد اور اداروں کے خلاف واضح ردِّعمل مرتب ہوتا ہے جو مذہب کے نام کو معاشرتی ریاکاری کے لیے استعمال کرتے ہیں اور عقیدے کی تقدیس کے نام پر فسادات برپا کرتے ہیں۔''

فرد کی شخصیت کو بنانے میں بہت سارے عوامل اثر انداز ہوتے ہیں۔ وہ بے شمار فطری صلاحیتیں لے کر پیدا ہوتا ہے۔ جنھیں موافق گھریلو ماحول، بچپن کی تربیت اور معاشرہ جلا بخشتا ہے۔ تعلیمی درسگاہیں اور اساتذہ کرام اُسے کندن بناتے ہیں۔ مسعود مفتی اس لحاظ سے خوش قسمت ہیں کہ فطری صلاحیتوں کی نشوونما کے لیے اُنھیں حالات ہمیشہ سازگار ملے۔ گھریلو ماحول مذہبی تھا لیکن اس میں اسلام کی اصل روح کو سمجھنے کی بھی تربیت دی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ مسعود مفتی کی تحریروں میں مُلا ازم اور مُلائیت کی تنگ نظری کے خلاف مواد ملتا ہے۔ ان کے ہاں اسلام کی وسیع النظری تو ہے لیکن تنگ نظری یا تعصب کی کوئی جھلک نظر نہیں آتی۔ ان کا ایمان ہے کہ خدا 'محبت' ہے اور وہ اپنے بندوں سے بھی یہی توقع رکھتا ہے کہ وہ دنیا میں محبت عام کریں نہ کہ نفرت کے بیج بوئیں۔ وہ کبھی کبھار مذہب کے نام پر ہونے والے جبر کے زیرِ اثر تلخ بھی ہوجاتے ہیں۔ مثلاً اپنے ایک افسانے ''انصاف'' میں کہتے ہیں:-

''یہ زندگی خدا کا مذاق ہے انسان کے ہاتھوں انسان کی گت بنتے دیکھ کر یزداں ہنستا ہے اور اس میں اور تیکھک ڈال دیتا ہے۔ ایسی زندگی کے بارے میں انصاف ناممکن ہے انصاف محض ایک واہمہ ہے، تصور ہے جو اس زندگی میں کہیں بھی ممکن نہیں۔''

انہوں نے فنون لاہور میں جولائی۔ دسمبر 1993 کے شمارہ میں ایک مضمون ''اور پھر وہ بھی زبانی میری'' لکھا۔ ان کے ذہن میں اسلام کا جو آفاقی، ہمہ گیر اور فطرت سے قریب تر تصور موجود ہے، اس کا اظہار یوں کیا:-

''ایک دن میں نے احمد فراز سے کہا کہ ہزار برس پہلے جب مسلمان امت نے

اجتہاد کا دروازہ بند کیا تھا تو سوچ اور سوال بھی ساتھ ہی دفن ہو گئے۔ اسی وجہ سے
ریسرچ دشمنی ہمارا اسلامی مزاج بن گئی ہے۔ اور تحقیق کے اس خلا کو ہم الزام
تراشی سے پُر کرتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے معاشرے کی فضا میں بے بنیاد
الزامات پتنگوں اور پرندوں کی طرح اڑتے رہتے ہیں۔ اس لیے میں نے اپنا
مسلک بنالیا ہے کہ کسی بھی الزام پر اعتبار کرنے سے پہلے اپنے طور پر تحقیق کرتا
ہوں کہ آیا یہ درست ہے یا غلط۔"

جبر کبھی تو جہالت کی فرسودہ روایات سے ہوتا ہے۔ کبھی معاشرے کی غلط اور ناہموار ساخت سے جنم لیتا ہے، کبھی مذہب کے غلط تصورات سے دوزخ کی آگ کی طرح ابلتا ہے اور کبھی اقتدار کے ایوانوں سے زہریلی بارش بن کر برستا ہے۔ بدقسمتی سے پاکستان میں یہ ساری صورتیں بیک وقت کارفرما ہیں اور ہمارا فردمایوسی کی اس انتہا تک پہنچ گیا ہے کہ بیدلؔ کے الفاظ میں:۔

شب رفت، سحر نہ شُد، شب آمد"

عورت کی فطرت کے کئی رنگ

علامہ اقبال نے کہا تھا کہ:

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ

تو یہ کیسے ممکن تھا کہ ایک ایسا ادیب جس کا مسلک حقیقت نگاری ٹھہرا، وہ 'زن' کے وجود سے لاتعلق رہتا۔ دنیا کے تمام مسائل ہی زن، زر اور زمین سے وابستہ ہیں۔ ادب چونکہ زندگی کا عکاس ہے اس لیے زن کا ذکر لازم ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مسعود مفتی نے عورتوں کے جذبات اور احساسات کا اس طرح احاطہ کیا ہے کہ قاری کو لطیف پیرائے میں حقیقت سے آشنا کردیا۔ انہوں نے عورتوں کی نفسیات کا گہری نظر سے مشاہدہ کیا ہے۔ جس میں ادراک اور خلوص کی چاشنی موجود ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ عورت بحیثیت مرکزی کردار ان کی تخلیقات پر حاوی ہے تو بے جانہ ہوگا۔ انہوں نے عورت کی نفسیات اور جذبات کے ہر رُخ کی عکاسی انتہائی دلیری اور خوبصورتی سے کی ہے۔

اکثر ادیبوں نے عورت کو 'محبت کی دیوی' یا 'مظلومیت کی تصویر' بنا کر رکھ دیا ہے۔ اگر حقیقی زندگی میں دیکھا جائے تو بے شک عورت محبت کی دیوی ہے، خلوص کی پجارن ہے۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ اس کی نفرت کی بھی کوئی انتہا نہیں۔ وہ ایک طرف اگر ظلم سہہ سکتی ہے تو دوسری طرف انتقام کی دیوی بن جائے تو اس کے شر سے کوئی بشر بچ نہیں سکتا۔ یہ حقیقت مسعود مفتی کی تحریروں میں جا بجا دکھائی گئی ہے۔ ایک

طرف اگر 'ماں' کی گمنام لڑکی صرف اپنے نام کی حرمت کو برقرار رکھتے رکھتے ساری عمر کنواری رہ جاتی ہے، کئی لڑکوں کی خواہش کے باوجود فلرٹ کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتی تو دوسری طرف ایک عورت اپنے بیٹے کے ہاتھوں اس کے باپ کا خون کرا دیتی ہے۔ بے وفائی کی انتہا ہے کہ یہ سب کچھ اپنے محبوب کا قرب حاصل کرنے کے لیے کرتی ہے۔ عورت کی فطرت کے یہ تمام رنگ انہوں نے یقیناً بڑے قریب سے دیکھے ہیں۔ اور انہوں نے عورت کو جیسا پایا ویسا پیش کر دیا۔ انہوں نے ثابت کیا کہ عورت صرف محبت کی دیوی اور مظلوم ہی نہیں بلکہ اور بھی کئی پہلو رکھتی ہے۔ اس کائنات کی خوبصورتی میں اس کے رنگ مل کر جہاں اضافہ کرتے ہیں وہیں اس دنیا کو کسی فرد کے لیے دوزخ بنانے میں بھی اس کا کوئی ثانی نہیں۔ انہوں نے جہاں عورت کو مظلوم دیکھا وہاں مظلوم ظاہر کیا اور جہاں 'ظالم' کے روپ میں پایا وہاں ویسے ہی پیش کر دیا۔

ان کے افسانوں میں عورت جتنے زیادہ روپ میں اور جس تناسب سے آئی ہے وہ مردوں کی نسبت یقیناً زیادہ ہے۔ افسانہ ہو یا ناول، ہر جگہ عورت بڑے نمایاں مقام پر نظر آتی ہے۔ اس کی وجہ انہوں نے یہ بتائی ہے کہ :-

> ''میں نے دانستہ طور پر تو عورت کو زیادہ فوکس نہیں کیا، میرا فوکس تو پوری زندگی ہے اور اس زندگی میں جتنا حصہ عورت کا ہے وہ ہی آیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ زندگی میں عورت کا حصہ کافی زیادہ ہوتا ہے۔ اس کائنات کی وسعت میں عورت کا جتنا تناسب ہے وہ موجود ہے۔''

اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے انہوں نے مزید کہا ''عورت صرف رومانس کی دیوی ہی نہیں کیونکہ بقول فیض ؂

اور بھی دُکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا

اور پھر عمر کے کسی خاص حصے میں تو عورت پر سو فیصد فوکس کیا جا سکتا ہے تمام عمر کے لیے نہیں''!

وہ سمجھتے ہیں کہ اردو ادب نے عورت کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ اگر ادیب چاہتے ہیں کہ عورت کی زندگی کے تمام پہلو اور رنگ دکھائیں تو پھر انہیں عورت سے متعلق تمام مسائل پر قلم اٹھانا ہوگا۔ وہ مانتے ہیں کہ زیادہ تر حالات میں عورت مظلوم ہوتی ہے لیکن یہ بات کہ وہ مظلومیت کی تصویر کے علاوہ اور کچھ نہیں، نہیں مانتے۔ مثلاً ایک عورت، دوسری عورت پر جب 'سوتن' کے روپ میں ظلم کرتی ہے تو اس پر تو ہمیں اردو ادب میں کچھ مواد مل جاتا ہے۔ لیکن عورت جب سوتیلے بچوں پر ظلم ڈھاتی ہے یا پھر جائیداد کے لیے جو مظالم عورت پر ڈھاتی ہے اُن کے بارے میں ادیب کا قلم ابھی تک خاموش ہے۔

انہوں نے زیادہ تر کہانیوں کو بیان کرتے ہوئے متکلم کا صیغہ استعمال کیا ہے۔ ان کی کئی کہانیوں میں

جب رومانی لمحوں میں ہیروئن کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے یہ تاثر پیدا ہونے ہی لگتا ہے کہ "منیں" اقرار وفا کا دعویٰ کرنے لگا ہے تو اچانک "میری بیگم" کا تذکرہ آ جاتا ہے۔ انکی کہانی "خوش قسمتی" سے ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے:-

"کیے بعد دیگرے وہ اپنے لچکدار جسم کو ان رقصوں کے خاکے میں ڈھالتی گئی۔ اور ناظرین کے ہوش وحواس پر مشرقی پاکستان کی روح بن کر چھا گئی۔ پس منظر میں دھان کے کھیتوں کی نقاشی، کانوں میں بانسری کی دلنواز لَے اور طبلے کی بھرپور تھاپ سامنے اس کا لہراتا، اڑتا، لہلہاتا، سرسراتا، بل کھاتا، اٹھتا، پھسلتا اور ہر دم نئے نئے جنم لیتا جسم یہ سب مل کر ایسا منظر بناتے کہ بقول شاعر "نظارگی بھی سراپا نظارہ بن گئی۔" شو کے بعد میں نے کہا "میں نے سینکڑوں دفعہ رقص دیکھے ہیں اور سینکڑوں دفعہ تعریف کی ہے لیکن آج سمجھ نہیں آتا کہ آپ کے لاثانی رقص کی تعریف کیسے کروں۔" اس کی ہنسی میں بھی رقص والے گھنگھرو جھنجھنا اٹھے "میں نے بھی سینکڑوں دفعہ اپنے رقص کی تعریف سنی ہے مگر اتنے اچھے انداز میں کبھی نہ سنی تھی۔" اس کی آنکھوں میں بھی ہنسی ناچ رہی تھی اور گول بنگالی رخسار کی نرمی میں ایک ڈمپل دیوانہ وار غوطہ لگا رہا تھا۔ ہم باتیں کرتے رہے مجھے یوں محسوس ہوا کہ وہ خوب کھل کر، بغیر کچھ لیپٹی کے، بات کرتی تھی اور بعض دفعہ تو خاصی منہ پھٹ ہو جاتی تھی۔ پھر میری دعوت پر وہ اگلے دن میرے ساتھ لاہور دیکھنے پر راضی ہو گئی۔۔۔ میری بیوی بھی ساتھ تھی۔۔۔۔"

یوں گویا

"اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل"

ان کی بیگم ان کی ہر رومانی داستان میں ساتھ ساتھ ہیں۔ نعیم صدیقی سہ ماہی "سیارہ" میں یوں رقم طراز ہیں:-

"کوئی بات شائستگی و ثقاہت سے گری ہوئی نہیں۔ کہانی میں جنسیت کے شگوفے چھوڑنے کے بہت راستے نکلتے تھے مگر مسعود نے ایسے شگوفوں سے کہانی کو آراستہ کرنے کا وہ پامال طریقہ اختیار نہیں کیا جسے بہت سے ادیب اپنی تحریروں کو پڑھے جانے کے قابل بنانے کے لیے 'امرت دھارا' کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ یہ لکھنے والے کے ذہن کی پاکیزگی کی شہادت ہے۔"

مسعود مفتی جب عورت کے بارے میں لکھتے ہیں تو یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ ان کے ہاں 'جنس' کا

جذبہ اپنے فطری رنگ میں نظر آتا ہے۔ وہ اسے نہ تو شجر ممنوعہ سمجھتے ہیں اور نہ ہی منزل مقصود۔ بلکہ ان کے ہاں یہ جذبہ اعتدال کی لگام تھام کر قاری کو منزل قرار تک پہنچا دیتا ہے۔ جنس کے متعلقات ان کے اعصاب پر ہرگز حاوی نہیں۔ وہ جس رنگ میں اس کو پاتے ہیں بالکل ویسا ہی پیش کرتے ہیں۔ عورت ذات کے بارے میں چلتے چلتے وہ بظاہر بے ضرر سے فقرے کہہ کر بعض فطری حقائق کا بیان بڑی خوبصورتی سے کر جاتے ہیں مثلاً:۔

''عورتوں کی موجودگی کا احساس ان کے جانے کے بعد ہی ہوا کرتا ہے۔''

یا

''عورت کے مزاج کی طرح عورت کا خیال بھی قابل اعتبار چیز نہیں۔''

یا پھر

''میرے پہلے خاوند علی گڑھ کے تعلیم یافتہ تھے۔ دوسرے کے لیے صرف یہ شرط ہے کہ وہ وہاں طالب علم نہ رہے ہوں۔ کیونکہ میں طبعاً خاموشی پسند ہوں۔''

یا پھر یوں

''میں کسی بھی ایسی عورت سے شادی کرنے کو تیار ہوں جو میری پہلی بیوی سے مختلف ہو۔ بیوی کی عمر کی کوئی پابندی بیان کرنے سے قاصر ہوں، کیونکہ میں جانتا ہوں کہ شادی کی خواہش مند عورتیں ہمیشہ ہی اٹھارہ برس کی ہوتی ہیں اور کئی کئی برس اتنی ہی رہتی ہیں۔ میری شرط صرف اتنی ہے کہ جو عورت بغیر میک اپ کے پچیس (25) برس کی نظر آئے خواہ اصل عمر کچھ بھی کیوں نہ ہو میرے لیے مناسب رہے گی۔''

مسعود مفتی عورت کی فطرت کے رمز شناس دکھائی دیتے ہیں۔ افسانہ ''میکدہ'' کی یہ چند سطور پیش کی جاتی ہیں۔

''جاوید پلے بوائے ٹائپ ہرگز نہ تھا۔ عورتوں کے معاملے میں اس کے محدود سے تجربے رومان کے ابتدائی مراحل تک ہی رہتے تھے۔ کیونکہ وہ خواتین کی ''نہ'' میں یہ فرق بھی بھی نہ جان سکا کہ کون سی اصلی انکار والی ''نہ'' ہے اور کون سے سطحی گریز اور ''ہاں'' والی ''نہ'' ہے۔ اس فرق کو جانچنے کے لیے مرد کو جس جبلت کی ضرورت ہے وہ یا تو اسے ملی ہی نہ تھی یا خوشگوار تجربوں کی کمی کی وجہ سے ابھر نہ سکی تھی اور پتھر تلے دبے ہوئے بیج کی طرح گھٹ کر رہ گئی تھی۔''

عورت کے وہ احساس و جذبات جو اُس کے دل کے نہاں خانوں میں جنم لیتے ہیں اور جنہیں بیان

کرنے سے وہ کتراتی ہے مسعود مفتی نے انہیں بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے وہ "نا بینا" میں شادی شدہ عورت کی نفسیات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"جب شادی شدہ عورت کی زندگی میں کوئی دوسرا مرد آتا ہے تو اُس کی ساری شخصیت بدل جاتی ہے وہ بڑی کامیابی سے دنیا سے خود کو چھپاتی ہے۔۔۔مگر وہ نہیں جانتی کہ اس کا رواں رواں اپنے طور پر اعلان کرتا رہتا ہے۔۔۔شادی کے بعد وہ بھرے برتن کے مانند ہو جاتی ہے اُس میں دو بوند پانی پڑ جائے تو چھلک اٹھتا ہے۔۔۔برتن نہیں جانتا۔۔۔مگر اُس کی ٹپکتی رال دوسروں کو صاف نظر آتی ہے"

یا پھر کہ

"شادی شدہ عورت کی جب آنکھ لگتی ہے تو سب سے پہلے اُس کا لب ولہجہ بدل جاتا ہے اپنی طلب بڑھنے پر مطلوب کا فخر اور غرور ابھرتا ہے۔۔۔اپنی ذات پر اترا ہٹ آجاتی ہے وہ بات بات پر جہاں بینی، جہاں بانی کے دعوے کرنے لگتی ہے۔۔۔خاوند کے لئے دبی دبی حقارت غیر شعوری طور پر ابھرتی آتی ہے۔۔۔ اگر وہ اس کی گود میں بیٹھ کر میٹھی باتیں بھی کرتی ہے تو آواز کسی بلندی سے آتی ہوئی لگتی ہے جیسے کوئی بالا خانے سے خیرات نیچے پھینکے"

انسانی نفسیات کے رمزشناس

مسعود مفتی نے 'فرد' پر لکھتے ہوئے اس کی نفسیاتی کیفیات کی اس خوبصورتی سے عکاسی کی ہے کہ بعض جگہ وہ 'ماہر نفسیات' معلوم ہوتے ہیں۔انہوں نے بے شمار سفر کیے اور انہوں نے بہت سی جگہوں پر کام کیا اس طرح انہیں لاتعداد مختلف قسم کے انسانوں سے واسطہ پڑا۔عدالتی امور کو نمٹانے کے سلسلے نے بھی ان کے "انسانی مطالعہ" کو وسیع کر دیا۔اس طرح وہ انسانی نفسیات کے رمزشناس بن گئے۔خالد حسن پاکستان ٹائمز میں "Book Review" میں یوں قلم کشا ہیں:۔

"The basic human instincts are stronger than acquired values, social or religious only those of Mufti's characters redeem themselves as human beings, who are closer to life and nature. The

themes, however, are the same, namely that human nature must assert itself in the end, no matter how strong and impregnable are the social and religious confines within which it is kept."

فرد کی نفسیات کے اس علم سے انہوں نے خوب فائدہ اٹھایا۔ وہ بخوبی جانتے ہیں کہ ہر عمل کا ردعمل ہوتا ہے۔ اور عمل جتنا شدید ہوگا ردعمل بھی اسی قدر شدت کا حامل ہوگا۔ ان کا ایک مشہور افسانہ "بھیڑیئے" ہے۔ یہ مشرقی پاکستان کے ایک قبائلی علاقے کے بارے میں ہے۔ عورت جسے ٹوٹ کر چاہتی ہے اس کا قبیلہ اس کو اس عورت کے لیے بطور خاوند قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ دونوں بھاگ کر جنگل میں پناہ لیتے ہیں۔ جب بخار کی حالت میں اس کے محبوب کا انتقال ہوتا ہے تو وہ چوری چھپے اس کو اپنے کمرے میں دفن کر دیتی ہے۔ اور یوں اس کو اپنے محبوب کی جسمانی نہ سہی، روحانی قربت مل جاتی ہے۔ بعد میں جب گاؤں چھوڑنے پر مجبور کی جاتی ہے تو وہ خود کو ہلاک کر کے پہلے سے تیار کی ہوئی قبر میں محبوب کے پہلو میں دفن ہو جاتی ہے۔" یہ ایک طرف تو عمل اور ردعمل کو ظاہر کرتا ہے اور دوسری طرف عورت کی نفسیات کا بھی عکاس ہے۔ عورت کتنے مضبوط ارادے کی مالک ہے اور کس شدت سے چاہتی ہے کہ جان بھی دے سکتی ہے۔ اسے محبوب کی قبر کی بھی فرقت گوارا نہیں۔ اسی طرح کے بے شمار افسانوں میں انہوں نے فرد کے کسی نہ کسی نفسیاتی پہلو کو لے کر اپنے افسانے کی عمارت بنائی ہے۔ انہوں نے اپنی کئی کتابوں کو منسوب ہی ظلم اور جبر کے خلاف اٹھنے والی سوچ کے نام کیا ہے۔ جس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ زندگی میں انسانی سوچ کو کس قدر اہمیت دیتے ہیں۔ انہیں احساس ہے کہ یہ سوچ جو معاشرے میں بیک وقت کئی قسم کے جبر کے خلاف ہے اُس کو کسی قدر مزاحمت کا سامنا ضرور ہوگا۔ لیکن انہیں یہ یقین ہے کہ آخر کار فرد کو تمام قسم کے جبر سے ضرور رہائی نصیب ہوگی۔ ان کا خیال ہے کہ زندگی کو نہایت پیچیدہ بنا دیا گیا ہے۔ فرد کے اپنے اختیار میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ جبر سہتے سہتے حالات کے دھارے میں بہہ جانے پر مجبور ہے۔ معاشرہ اپنی پوری استبدادی قوت سے اس پر حاوی ہے اور وہ اکثر اوقات ایک سیدھے سادے انسان کو غلط راستوں پر چلنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ کوئی بھی فرد مجرم پیدا نہیں ہوتا۔ یہ حالات و واقعات ہیں جن کی وجہ سے وہ مجرم بن جاتا ہے۔ یہی حالات و واقعات مسعود مفتی کے افسانوں کے مرکزی پلاٹ ہیں۔ وہ بطور ایک ماہر نفسیات اپنے کرداروں کا تعین کرتے ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ فطری جذبوں کے اظہار کو جب اس گھٹن زدہ ماحول میں اظہار کی شکل نہیں ملتی اور اس پر حد سے زیادہ دباؤ ڈالے جاتے ہیں تو یہی جذبے لاشعوری طور پر فرد کی شخصیت پر شکلیں بدل بدل کر اثر

انداز ہوتے ہیں۔ دور حاضر میں نفسیاتی عوارض کی بڑھتی ہوئی تعداد کو انہوں نے قاری تک پہنچایا ہے۔

ڈاکٹر ایم۔ اے فاروقی نے نوائے وقت میں اپنے کالم "پاکستانی یا قومی ادب" میں مسعود مفتی کے بارے میں اس طرح تبصرہ کیا:۔

> "مفتی صاحب کا نصاب انسانی فطرت ہے اور ان کی کتاب انسانی فرد ہے۔ کسی صاحب دل ودماغ ادیب کے لیے اس سے بہتر کوئی نصاب اور اس سے اچھی کوئی کتاب نہیں ہو سکتی۔ مفتی صاحب نے چھوٹی چھوٹی کہانیوں کے ذریعے ہمیں دعوتِ فکر دی ہے کہ ان کے محسوسات کی روشنی میں ہم خود پاکستانی یا قومی ادب کا تعین کر سکیں۔ ان کی بڑھتی کہانیاں بجا اور دلچسپ ہیں۔ ان کے جذبات اور احساسات قابلِ تعریف ہیں۔"

بازگشت، شمارہ جون۔ جولائی 1970 میں نذیر قیصر نے مسعود مفتی کے فن پر یوں تبصرہ کیا ہے:۔

> "مسعود مفتی کا نام اس عہد کے چند ایک اچھے افسانہ نگاروں میں سے ایک ہے۔ مسعود مفتی کے پندرہ افسانے جو رگِ سنگ کے نام سے جمع کیے گئے ہیں پڑھنے والے کو کسی نہ کسی طرح اپنی زمین، اپنی ثقافت، اپنی روایت اور ان سب سے بڑھ کر اپنے آپ سے آشنا کرتے ہیں۔ اور انہیں پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ مسعود مفتی نے انہیں لکھنے کے لیے خود کو اس تخلیقی ہلاکت سے گزارا ہے جس سے گزرے بغیر آدمی اپنی پہچان حاصل نہیں کر پاتا۔

مسعود مفتی اس عہد کا وہ باشعور اور حساس ادیب ہے جس نے 6 ستمبر کی جنگ کو اپنے شعور اور احساس میں رچا لیا۔ ایسے انداز سے تخلیقی اظہار کا لباس پہنایا کہ پڑھنے والا اس فضا میں اپنے وجود کو اس طرح کھویا ہوا محسوس کرتا ہے جیسے کہ اس نے اپنے آپ کو پالیا ہو۔

سیالکوٹ کے محاذ پر اور شہر میں بم برس رہے ہیں، ٹینکوں اور آگ کے شعلوں کے سامنے پاکستانی فوجی دیواریں بنے کھڑے ہیں، فضاؤں میں جلے ہوئے جسموں اور بارود کی بُو بسی ہوئی ہے، شہر میں مکان گر رہے ہیں، مٹی اڑ رہی ہے، دھواں پھیل رہا ہے، اینٹوں اور پتھروں تلے عورتوں اور بچوں کے نازک جسم کچلے جا رہے ہیں۔۔۔ اور اس ساری فضا میں۔۔۔ آنکھوں کے سامنے سبز پتوں سے لدی، سو چیے کے پھول سے مزین ایک ٹہنی لہراتی ہے، زندگی سے بھرپور۔۔۔ ایک علامت۔۔۔ اور گرد خوشبو بکھر جاتی ہے۔۔۔" اس ماحول میں جہاں کہ زندگی موت کے لیے ہو وہاں زندگی سے اتنی مقدس محبت کی "علامت" صرف ایک باشعور اور حساس ادیب ہی لکھ سکتا ہے۔"

ادیب اور مؤرخ دونوں اپنے عہد کی تصویر پیش کرتے ہیں۔ جو شخص حقائق قلم بند کرتا ہے وہ مؤرخ کہلاتا ہے۔ کوئی واقعہ ظہور پذیر ہوا، وہ کب اور کہاں ہوا، مؤرخ کی رسائی صرف یہیں تک محدود ہے۔ جب حقائق کو انسانی جذبات و احساسات کے ساتھ ملا لیا جائے تو پھر وہ ادیب کا قلم بن جاتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:-

> ''مؤرخ اور صحافی بلند پرواز پرندے کی طرح سیاسی زلزلوں کا مجموعی نظارہ کرتے ہیں مگر ادیب گلی گلی گھومنے والے سیاح کی طرح دروازوں پر دستک دیتا ہے اور افراد کے چہروں کو پڑھتا ہے۔ اسی لیے کسی بھی انقلاب کی تصویر اس وقت تک مکمل نہیں ہوتی جب تک مؤرخ اور صحافی کے ساتھ ادیب کا قلم بھی حرکت میں نہ آئے۔ مؤرخ اور صحافی اگر تواریخ کی آنکھ ہیں تو ادیب تواریخ کی خوردبین ہے۔''

مسعود مفتی تواریخ کی وہ خوردبین ہیں جنہوں نے اپنے عہد کی تصویر دیکھی اور پھر اسے پیش کر دیا۔ مستقبل کا مؤرخ شاید 1965 کی پاک بھارت جنگ اور 1971 میں سقوط ڈھاکہ کے واقعات، ان کے تسلسل اور چند نام تو ضرور تاریخ میں لکھ دے گا۔ لیکن 'فرد' جس ایسے کی جانکنی کے دور سے گزرا۔ اس سے وہ لاتعلق ہوگا۔ اس کو اس پُر آشوب ماحول سے بھی کوئی واسطہ نہ ہوگا جس میں فرد کی ذہنی کیفیات، لمحہ بہ لمحہ المیوں سے گزر رہی تھیں۔ موجودہ نسل تو چونکہ خود ان تجربات سے گزر چکی ہے اس لیے وہ واقف ہے کہ بحیثیت ایک فرد اور قوم، ہمارے جذبات کے دھارے شدت کے ساتھ کس رخ بہہ رہے تھے اور فرد کو مشکلات کے گہرے دریاؤں کو عبور کرنا پڑ رہا تھا۔ اس کی انفرادی شخصیت پر اس کی کیا چھاپ پڑ رہی تھی۔ لیکن وہ نسل جو، ان المیوں کے بعد دنیا میں وجود میں آئی اس کو بتانے کے لیے مؤرخ اور صحافی کا قلم شاید ناکافی ہو۔ اس کے لیے تو ایک ادیب کا قلم چاہیے جو اسے فرد کی ان کیفیات سے آگاہ کر سکتا ہے۔ اور یہ کام مسعود مفتی نے اپنی تحریروں کے ذریعے انجام دیا ہے اور بہت خوب انجام دیا ہے۔ ''رگ سنگ'' جو جنگ ستمبر پر لکھے گئے افسانوں پر مبنی ہے۔ ''چہرے''، ''لمحے'' اور ''ہم نفس'' سقوط ڈھاکہ اور اسیری کے زمانے کے تاثرات پر مبنی ہیں۔ اگر ہم دونوں موقعوں پر لکھی گئی کتابوں کا ہی موازنہ کریں تو اندازہ ہو جاتا ہے کہ دونوں واقعات یعنی جنگ ستمبر اور سقوط ڈھاکہ کی المناکی کی کیفیات میں کس قدر فرق ہے، پہلی جنگ میں قوم ایک فاتح کے طور پر ابھری تھی جبکہ دوسری دفعہ نہ صرف شکست کا سامنا کرنا

پڑا بلکہ ملک بھی دولخت ہوا اور سقوطِ ڈھاکہ کا اندوہناک سانحہ ظہور پذیر ہوا۔ 'ہم نفس' ایک رپورتاژ ہی نہیں بلکہ ایک قوم کا نوحہ ہے جسے مسعود مفتی جیسے ادیب کا قلم ہی لکھ سکتا تھا۔

مسعود مفتی کا خیال ہے "مؤرخ اور صحافی انقلاب کا دسواں حصہ دکھاتے ہیں اور ادیب اس کے وہ نوحصے دکھاتا ہے جو سطح سے نیچے ہیں اور بعد میں آنے والوں کی نظر سے اوجھل رہتے ہیں۔ اس لیے کسی بھی بڑی تبدیلی کے بعد ادیب کا خاموش رہنا گناہ کبیرہ سے بھی بڑا گناہ ہے کہ اس نے خدا کے ودیعت کردہ انعام اور موقع کو ضائع کر دیا۔"

روزنامہ ڈان میں اشفاق بخاری نے ہم نفس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ مسعود مفتی نے بھولا کی زبان میں ان عناصر کی نشاندہی کی جو ان حالات کا سبب بنے۔ وہ لکھتے ہیں:-

"....And its reflection also comes through Bhola's reasoning of why East Pakistan broke away. He names three important decisions that caused the disaster:-

1. End of one unit
2. One man one vote and
3. Adoption of method of simple majority instead of two-third majority for cruicial decisions in the Assembly

اسی طرح سعید انجم نے پاکستانی ادب کے حوالے سے "چہرے" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:-

"یہ کتاب ان تاریخ ساز لمحات کے تناظر میں پڑھنی چاہیے جو مصنف کی جذباتی شکست و ریخت کا باعث بنے اور جس کے نتیجے میں مصنف کو ایک بیکراں کرب سے دوچار ہونا پڑا۔ باقاعدہ طور پر جنگی قیدی بنائے جانے سے پہلے ہوٹل پرل کانٹی نینٹل ڈھاکہ میں پانچ روزہ قیام کے دوران ایک شخص پر جو بیک وقت نوکرشاہی کا نمائندہ، ایک نظریاتی ریاست کا شہری، شکست سے دوچار ہوتی ہوئی قوم کا فرد اور ایک انسان ہے، کیا گزری؟ یہی اس کتاب کی کہانی ہے۔

اختر امان نے نوائے وقت میں اپنے کالم میں یوں تبصرہ کیا:-

"مسعود مفتی کے افسانے تاریخ نہیں مگر تاریخی سچائیوں اور تاریخی عمل کی کوکھ سے جنم لینے والے واقعات اور کرداروں کے ردِ عمل کا افسانوی اظہار ہیں۔"

مسعود مفتی نے مشرقی پاکستان میں ڈھاکہ کو ڈوبتے دیکھا۔ انہوں نے دیکھا کہ ڈھاکہ جہاں سے قیام پاکستان کا آغاز ہوا تھا، کس طرح چوبیس (24) سال میں ہی خود پاکستان کے خلاف ہو گیا۔ مشرقی پاکستان کے قیام کے دوران انہوں نے گہری نظر سے ان تمام اسباب وعوامل کا مشاہدہ کیا۔ اور ان حالات کا ادراک کیا جن کی وجہ سے نوبت یہاں تک پہنچی۔ ان تمام حالات و واقعات اور انسانی جذبات واحساسات کو انہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے اردو ادب میں امر کر دیا۔ مشرقی پاکستان کے بارے میں لکھتے ہوئے انہوں نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ ان کی تحریروں کے مجموعی تاثر سے ان کے قاری کے ذہن میں وہاں کے ماحول کی مربوط تصویر ابھر سکے جو سچی بھی ہو اور مفصل بھی۔ ان کا تخلیق کردہ یہ ادب نہ صرف اردو کے لیے ایک گراں بہا سرمایہ ہے بلکہ یہ مستقبل کے مؤرخ کے لیے بھی مددگار ثابت ہوگا۔ 1971 میں پاکستان کے بکھرنے کا ذکر جب آنے والی نسلیں تاریخ میں پڑھیں گی تو ان کو کچھ مربوط واقعات پڑھنے کو ملیں گے یہ معلوم ہوگا کہ وہ کب وقوع پذیر ہوئے، ساتھ کچھ شخصیات کے نام بھی۔ لیکن تواریخ کی کتب سے ان کو 1971 کے حالات اور انسان نما درندوں کی سفاکی کا کسی طور اندازہ نہ ہو سکے گا۔ اور نہ ہی وہ ان عظیم انسانی المیوں سے آگاہ ہو سکیں گے جو فردی سطح پر اس پُر آشوب دور میں وقوع پذیر ہوتے رہے۔ ان کا اندازہ تو انہیں صرف مسعود مفتی کی تحریروں سے ہو سکے گا جو بظاہر 'تاریخ' تو نہیں ہیں مگر وہ تاریخ کی گونج ضرور ہیں ایک ایسی گونج جو دل کی گہرائیوں سے نکلتی ہے اور دل کی گہرائیوں تک اس کی پہنچ ہے۔ جہاں تک تاریخ کی رسائی کسی طور نہیں ہو سکتی۔

اپنے انٹرویو میں جو اکادمی ادبیات نے شائع کیا مسعود مفتی نے یوں کہا ''اس ادیب کو میں ادیب نہیں سمجھتا جس کی تحریروں میں عصر حاضر کا عکس نہ ہو۔ اگر ہم ادیب کی تحریروں سے اس کے عصری عہد سے آگاہ نہیں ہو سکتے تو وہ بڑا ادیب نہیں۔''

خالد اقبال یاسر ''فنون'' میں شائع ہونے والے اپنے ایک مضمون میں مسعود مفتی کی کتاب ''چہرے'' پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ بیان کرتے ہیں کہ ان کی کہانیاں اس دور کی المناک مگر حقیقی دستاویزات ہیں:۔

''مسعود مفتی نے 'چہرے' کے تسلسل میں ہم نفس، ریزے اور لمحے کے عنوانات سے تین افسانوی مجموعے اب تک سقوط ڈھاکہ کے پس منظر میں تخلیق کیے ہیں انہوں نے ان افسانوں میں ڈھاکہ کے سقوط کی خونچکاں داستان بیان کی ہے۔ ان خاندانوں کے المیہ کو قلم بند کیا ہے جو 1947 میں اپنے گھروں سے نکلے، قتل ہوئے۔ ان کی اگلی نسل 1971 میں دوبارہ اپنے نئے گھروں میں قتل ہوئی۔ مصنف کے تجربے کے ساتھ جزوی اختلاف کے باوصف یہ کہانیاں اس دور کی تلخ اور المناک مگر حقیقی دستاویزات ہیں۔ افسانہ نگار نے نثر میں ایک شہر، ایک تہذیب اور ایک نسل کا نوحہ لکھا ہے۔''

گویا آنے والا مؤرخ جب سانحہ مشرقی پاکستان کے بارے میں تاریخ لکھنے لگے گا تو مسعود مفتی کی

تخلیقات اس کی مدد کریں گی۔ مسعود مفتی کا کہنا ہے کہ ادیب کے فن میں اس کے اردگرد پیش آنے والے واقعات کی تصویر ضرور موجود ہونی چاہیے ادب اپنے موضوعات زندگی سے کشید کرتا ہے۔ وہ زندگی جو اس کے گرد و پیش میں وقوع پذیر ہو رہی ہے۔

منیر نیر نے نیرنگِ خیال راولپنڈی میں چہرے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ ہماری گزشتہ تاریخ بھی ہے اور آنے والے دور کی عبرت ناک نشاندہی بھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

''چہرے مشرقی پاکستان کی آخری ہچکیوں کی داستان ہے۔ اور آخری ہچکیاں ہمیشہ ہی درد و اندوہ، تڑپ اور سوز کی غماز ہوتی ہیں۔ مگر جب انہیں پرکھنے والی عتیورآنکھیں، محسوس کرنے والا احساس دل اور امر بنانے والا قلم مل جائے تو یہ ہچکیاں نسل در نسل صدیوں تک گئے وقت کی بازگشت بن کر سنائی دیتی رہتی ہیں۔ چہرے انسان کی پہچان کا دوسرا نام ہے۔ ہم ہر روز کسی کو گھنٹوں کیوں نہ دیکھتے رہیں بعض اوقات ہم ایک مخصوص وقت اور کسی مخصوص واقعہ کے زیرِ اثر اس کی پہچان کے شاکی ہو جاتے ہیں اس لیے کہ عام طور پر نظر آنے والے چہرے ایک خاص وقت میں نظر آنے والے چہروں سے مختلف ہوتے ہیں۔ مصنف نے ان مخصوص لمحات کو چہرے میں محفوظ کیا ہے جو بیک وقت ہماری گزشتہ تاریخ بھی ہے اور آنے والے دور کی عبرت ناک نشاندہی بھی۔''

مصنف خود جن تکلیف دہ لمحات کے حصار میں تھے ان لمحات کی عکاسی انہوں نے victimized انسان کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک مؤرخ کی حیثیت سے کی۔ یہی وجہ ہے کہ 'چہرے' اپنے سادہ اسلوب بیاں، پُرکشش تحریر کے ساتھ جہاں مصیبت و ابتلا کے ایام کی المناک داستان ہے وہاں وہ 'تاریخ' کے طالب علموں کے لئے مستند تاریخ بھی ہے۔ داستان گوئی اور تاریخ نویسی دو مختلف قسم کے فن ہیں مگر مصنف نے جس خوبصورت انداز میں دونوں کو نبھایا ہے۔ وہ صرف مصنف ہی کا حصہ ہے۔ آپ بھی ملاحظہ فرمایئے:-

> ''یہ آخری دفعہ ہے کہ میں وہ سب چہرے اکٹھے دیکھ رہا ہوں۔ جنہوں نے غم کی شام میں مل کر پرچم کے چاند تارے کا غروب دیکھا ہے۔ اتنے مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے کے باوجود ان کی دھڑکنیں ایک سی ہیں۔ درد کا دیدۂ تر اتنا مشترک ہے کہ ایک کے آنسو دوسرے کے گالوں پر بہے ہیں۔ یہ رسوائی کے ساتھی ہیں۔ سیاہ بختی کے شریک ہیں۔ حشر کے رفیق ہیں۔ ہم نے تنگی کے ایام اکٹھے چکھے و گردشِ دوراں کے ہچکولے اکٹھے کھائے۔ موت کے سائے تلے اکٹھے بیٹھے ہماری امید بھی ایک، حسرتیں بھی ایک اور آہیں ایک۔ ہمارا کارواں ایک زبان ایک اور احساسِ زیاں ایک۔ ہم سب اپنی اپنی گرہ میں، اپنے اپنے

گریبانوں کے تار لیے جا رہے ہیں اور ایک ہی جنون کے کشتہ ہیں۔"
کتاب میں کہیں بھی مبالغہ آمیزی نہیں پائی جاتی۔ کسی قسم کا واویلا نہیں بلکہ واقعات کو سادہ اور عام فہم زبان میں جس میں شگفتگی بھی ہے۔ لطافت بھی ہے، شعریت بھی ہے اور دل پر اثر کرنے والی قوت بھی۔

ادب برائے زندگی

ہر انسان کو کچھ مخصوص صلاحیتیں فطرت کی طرف سے عطا ہوتی ہیں۔ اب یہ اس انسان پر منحصر ہے کہ وہ اپنی ان صلاحیتوں کو کس طرح بروئے کار لاتا ہے۔ ادیب کو جو صلاحیتیں ودیعت کی گئی ہیں ان میں اس کا گہرا مشاہدہ، واقعات کی تہہ تک کھوج لگانے کی جس اور ایک حساس دل و دماغ ہے۔ انھی ودیعت کردہ صلاحیتوں سے وہ انسانی مسائل کا ادراک کر سکتا ہے، حالات و واقعات کا کھوج لگا سکتا ہے اور ان عوامل کا پتہ لگا سکتا ہے جن کی وجہ سے یہ حالات و واقعات پیدا ہوئے، ان کے حل کے لیے بلاواسطہ راہ ڈھونڈ سکتا ہے۔ ادیب 'زندگی' سے ہے اور وہ کسی طور بھی زندگی سے لاتعلق نہیں رہ سکتا۔ اس لیے کسی بھی ادیب کا مصلحتاً خاموش رہنا یا پھر واقعات کا کھوج نہ لگانا گناہ کبیرہ ہے۔
عملی طور پر مسعود مفتی کسی ادبی تحریک سے وابستہ نہیں۔ لیکن وہ ادب برائے زندگی کے قائل ہیں۔ ان کا ادب محض خوش وقتی نہیں۔ ان کے افسانوں کی ایک بڑی بات یہ ہے کہ ان میں ایک خاص حد تک مقصدیت ہے جو کسی طور بھی وعظ کی سطح پر نہیں آتی۔ وہ حالات و واقعات کو کچھ اس خوبی اور خوبصورتی سے ایک خاص موڑ تک پہنچاتے ہیں کہ اپنا نکتہ نظر بھی بیان کر جاتے ہیں اور قاری کو احساس بھی نہیں ہونے دیتے۔ وہ ادب برائے ادب کے قائل نہیں ہیں۔
ڈاکٹر محمد احسن فاروقی ان کی انفرادیت کے حوالے سے کہتے ہیں:۔

> "مسعود مفتی کی منفرد فکر و نظر کے مخصوص پہلو کا تعین ان کے افسانوی مجموعوں سے ہوتا ہے۔ وہ زندگی کی اہم قدروں کو ایک مفکر کی نظر سے دیکھنے والے اور ان کو افسانے کی تنگ نائے میں نہایت خوبی سے رکھ کر دیکھنے والے جانے جا چکے ہیں۔ اور اس سلسلہ میں اپنی مثال آپ بھی ہیں۔ مسعود مفتی کو اگر فرد کا مفکر اور اس کی حالت کا عکاس کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اور اس معنی میں وہ تمام اردو افسانہ نگاروں سے الگ نظر آتے ہیں۔"

مسعود مفتی کو خود بھی احساس ہے کہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو انہیں نے فرد کی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے استعمال کرنا ہے۔ ان کی نظر میں ادیب کا مقام بہت اعلیٰ وارفع ہے اگر وہ اپنی صلاحیتوں کو صحیح طریق

سے بروئے کار لائے تو وہ کہتے ہیں:۔

''ادیب نہ صرف خدا کے سامنے بلکہ فن کی دیوی کے سامنے بھی جوابدہ ہے۔ تخلیقی عمل تخیل کے پل صراط پر سے گزرنے کا عمل ہے۔ جہاں ایک غلط قدم چلنے والے کو ادیب کے نازک منصب سے نیچے گرا سکتا ہے۔''

اسی طرح ایک اور مقام پر انہوں نے ادب برائے زندگی کے حق میں یوں کہا:۔

''طالب علمی کے زمانے میں مزاحیہ مضامین لکھنے شروع کیے۔ بعد میں 1957 میں سنجیدہ افسانہ نگاری شروع کی اور آہستہ آہستہ مزاح نگاری ترک کر دی۔ اس تبدیلی کا محرک یہ تھا کہ اگر افسانے کو ذہنی عیاشی کا ذریعہ نہ بنایا جائے تو اس سے بڑا کام لیا جا سکتا ہے۔ یہ احساس بعد میں اصول بن گیا۔ اسی وجہ سے 1965 کی جنگ میں میں نے زیادہ تر افسانے اسی پس منظر میں لکھے۔ اور افسانوی مجموعہ ''رگِ سنگ'' مرتب ہوا۔ بعد ازاں جب 1971 میں مشرقی پاکستان کے حالات دیکھے تو یہ میرا ایمان بن گیا۔''

آفاقیت اور همه گیری

مسعود مفتی کی تحریروں میں قاری کو آفاقیت کا تاثر بھی ملتا ہے۔ زندگی نے ان کو گوناگوں تجربات کا موقع دیا۔ جس نے ان کی سوچ میں وسعت نظری پیدا کی۔ انہوں نے مغربی ادیبوں موپاساں، ایمے ژولا اور کئی دوسرے روسی ناول نگاروں کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ کچھ ذہنی اپروچ بھی ایسی ہے کہ ہر شے کو تنقیدی نظر سے دیکھتے ہیں۔ نہ جانے اچھے ادیب ہونے کے ناطے یا پھر اچھے بیوروکریٹ ہونے کی وجہ سے۔ ان کی تحریریں صرف اپنے ملک کے کینوس تک محدود نہیں ہیں بلکہ عالمی پس منظر کے تناظر میں ہیں۔

طارق محمود نے ہفت روزہ قندیل میں مسعود مفتی کی اس خوبی کو یوں بیان کیا ہے:۔

''مسعود مفتی کا محدب شیشہ میرے ہاتھ میں، میرے سامنے اپنا معاشرہ ہے۔ اپنا آس پاس، آمد و رفت جاری ہے۔ اس میں شہر کی جھوٹی عظمتوں والے نودولتیے بھی، دیہات کے قلاش اور کم عیار لوگ بھی، آرٹسٹ بھی، سٹیشن ماسٹر بھی، شہر کی تنگ گلیوں کے ایک دوسرے سے ملتے ہوئے مکان بھی، وکیل بھی، مولوی بھی، محدب شیشہ ان چیزوں کو صرف بڑا کر کے ہی نہیں دکھا رہا، بلکہ ان

کرداروں کے اپنے آپ پر چڑھائے ہوئے خولوں کو بھی ہٹا رہا ہے۔

محدب شیشے میں شامل افسانے ہم سب کی کہانیاں ہیں کہیں نہ کہیں اپنا چہرہ نظر آ ہی جاتا ہے۔ میں اسے افسانہ نگاری کی خوبی ہی ٹھہراؤں گا کہ انہوں نے اپنے افسانوں کے لیے موضوعات کے چناؤ میں ہمہ گیری کا ثبوت دیا ہے۔ اس لیے ان کہانیوں کے کردار کسی خاص طبقے اور خاص طرز زندگی کی نمائندگی نہیں کرتے بلکہ افسانہ نویس کی حیثیت ایک ایسے سیلانی شخص کی سی ہے جو قریہ قریہ گھومتا پھرا ہے۔ اس نے اپنے آس پاس سے گزرنے والے ہر شخص کے دل میں جھانکا ہے۔ ہر شخص کے دل کی دھڑکنوں پر کان لگائے ہیں۔"

فلپائن میں قیام کے دوران ان کو وہاں مختلف جزائر میں جانے کے مواقع ملے۔ ایسے ایسے جزیرے جہاں پر جانے سے احساس ہوتا ہے کہ وقت شاید صدیوں پیچھے چلا گیا ہے۔ زندگی کو اتنے مختلف پہلوؤں سے دیکھنے سے ان کی تحریروں پر مثبت اثرات مرتب ہوئے۔ اسی طرح جب وہ اپنے مذہب کی بات کرتے ہیں تو اس کو دوسرے مذاہب کے تناظر میں بھی دیکھتے ہیں۔

اسلام کو امن اور سلامتی کا مذہب مانتے ہیں اور جب وہ دوسرے مذاہب کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان پر یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ کوئی بھی مذہب ایسا نہیں جس میں خون خرابے کا حکم دیا گیا ہو، اسی حقیقت کو جاننے کے بعد انہوں نے "یا خدا"، "سالگرہ"، "فرسٹ کلاس"، "توبہ" اور "شناخت" جیسی لافانی کہانیاں تخلیق کیں۔ مسعود مفتی کی نظر ہمیشہ سے عالم گیر، آفاقی اور دائمی قدروں پر رہی ہے۔ اس آفاقیت نے بھی ان کی تحریروں کو اردو ادب میں ایک اونچا مقام بخشا ہے۔

اپنی مٹی کی مہک۔ قومی ادب

نعیم صدیقی نے سہ ماہی سیارہ میں اپنے مضمون "نقوش کا عصری نمبر۔ ایک تاثر" میں مسعود مفتی کے حوالے سے اپنے تاثرات یوں بیان کیے ہیں:-

"مسعود مفتی کو میں نے 1971 کے سانحہ کے بعد پوری طرح جانا سمجھا ہے میری ان سے ملاقات نہیں، کبھی کوئی گفتگو نہیں ہوئی، مراسلت نہیں ہوئی میں نہیں جانتا، عام زندگی میں کیسا آدمی ہے۔ یہ جانتا ہوں کہ جہانِ فن میں وہ اپنے دل و دماغ کی ایک تڑپ ہے اور بس۔ 1971 کے سانحہ پر میں نے اس کی تڑپ کو دیکھا۔ ایک تحریر میں دوسری نگارش میں، تیسرے پارہ فن میں، ہر

باراس کی تڑپ تڑپا گئی۔ اس کی نگارشات اوراق پریشاں نہیں ہیں۔ ایک ہی
کتاب شعور و احساس کے ابواب ہیں۔ باہم مربوط ہیں۔ اس کا سفر منحنی خطوط
میں نہیں وہ کبھی آگے اور کبھی پیچھے اور کبھی دائیں اور کبھی بائیں نہیں جاتا۔
خط مستقیم میں چل رہا ہے۔ درد کی ایک لکیر وہاں سے یہاں تک کھنچی چلی گئی
ہے۔ اس کا وہی 1971 والا درد روپئے میں نئے رُخ سے ٹیسیں دیتا ہوا
محسوس ہوتا ہے۔

اپنے ملک سے محبت کا عنصر مسعود مفتی کے ہاں ابتداء سے تھا۔ لیکن جب انہیں ہندوستان میں قید کے دوران سوچنے اور لکھنے کا موقع ملا تو ان کے اندر وطن کی محبت نے ایک نئے پن سے جنم لیا۔

پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

شجر سے ان کی مُراد وطنِ عزیز ہے اور وہ پُر امید ہیں کہ ۔

آئے گی اک چمکتی ہوئی صبح آئے گی

اتنا شبِ سیاہ سے میں بدگماں نہیں

بازگشت میں نذیر قیصر، مسعود مفتی کی کتاب رگِ سنگ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان کے افسانوں میں اس ملک کی ثقافت اور یہاں کے باشندوں کے لیے ان کی محبت نمایاں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کہانیاں ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ وہ کہتے ہیں :-

"رگِ سنگ کے افسانوں میں جنگ کو ایک مختصر عرصے کے کینوس تک ہی محدود نہیں رکھا گیا بلکہ ان کا تعلق اپنی ملکی ثقافت، اپنے معاشرے اور اپنے باشندوں کی انفرادی اور اجتماعی صورتوں سے پیدا کیا گیا ہے یہی وجہ ہے کہ یہ افسانے جنگِ ستمبر پر لکھی جانے والی ان بہت سی تحریروں میں سے نہیں ہیں جنہیں شاید ہم بھلا چکے ہیں یا بھلا دیں گے۔"

روزنامہ نوائے وقت میں اختر امان نے ایک مضمون "قومی ادب کیا ہے" میں مسعود مفتی کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہمارے ادب کی قومی روایت کی سب سے روشن مثال مسعود مفتی ہیں۔ وہ کہتے ہیں :-

"میرے نقطۂ نظر کے مطابق قومی ادب کے اجزائے ترکیبی تاریخی شعور، عصری تقاضوں کا ادراک اور جمالیاتی احساس ہیں۔ ان تینوں میں سے اگر کوئی ایک چیز بھی موجود نہ ہوگی تو اس کو ہم شاید تاریخ یا صحافت کے خانہ میں تو رکھ سکیں مگر ادب یا قومی ادب ہرگز نہیں کہہ سکیں گے۔

میں ایک ایسے فن کار پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں جو ادب کی قومی روایت کی سب سے روشن مثال ہے۔ جس کی تحریریں اس حد تک حقیقت پسندانہ ہیں کہ ان میں اسلامی ادب اور عوامی ادب کی جھلک اس طور دکھائی دیتی ہے کہ اسلام اس کی تحریروں کو وسیع تر ثقافتی پس منظر فراہم کرتا ہے اور عوام اس کے کرداروں کی صورت میں سامنے آتے ہیں۔ لیکن اس کی تحریریں صرف تاریخی شعور، عصری تقاضوں اور عمدہ جمالیاتی احساس کی ہی مظہر نہیں ہیں بلکہ وہ اپنے اجتماعی قومی حوالوں سے اپنی سوچ کی راہیں بھی متعین کرتا ہے اور قومی سطح پر رونما ہونے والے مختلف واقعات کے محرکات، انسان کے رویوں پر مرتب ہونے والے اثرات کی تصویر بھی دکھاتا ہے۔ میری مُراد مسعود مفتی سے ہے۔"

"مسعود مفتی نے اجتماعی تجربوں کو اپنے مخصوص تاریخی، سماجی اور ثقافتی پس منظر میں رکھ کر نئے زاویوں سے پیش کیا ہے اور ان کو کچھ اس انداز سے پیش کیا ہے کہ زمین اپنے تمام تر فکری اور جذباتی رشتوں کے حوالے سے ہمارے سامنے ابھرتی نظر آتی ہے ان کے افسانوں میں وطن کی مٹی کا لمس اپنے دیس کی ہواؤں کی خوشبو بھی رچی بسی ہے اور غریب انسان کے پسینے کی بو اور مظلوم کی آہ و بکاہ بھی۔ انہوں نے فرد کو معاشرتی رسم و رواج اور استحصالی سوچوں کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھتے ہوئے بھی دکھایا ہے۔

اگر ہم مسعود مفتی کے افسانوں کا بغور مطالعہ کریں تو ہمیں ان میں وہ قومی شعور جھلکتا نظر آتا ہے جو صدیوں کے تاریخی عمل سے تشکیل پاتا ہے۔"

ان کی تحریروں میں پاکستانیت کا رنگ غالب ہے۔ واقعات کے حوالے سے وہ ایسی تصویر کشی کرتے ہیں کہ قاری ایک رو میں بہہ جانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اور جب وہ کہانی ختم کرتا ہے تو اس کے دل میں بھی وہی محبت کروٹیں لینے لگتی ہے جو مصنف کے اندر ہے اور جسے وہ عام کرنا چاہتا ہے۔ انہوں نے مشرقی پاکستان میں افسری کرتے ہوئے بھی قومی خدمت کی اور بھارت میں جنگی قیدی کی حیثیت سے اسیری کے دوران اذیت کو بھی اپنے لیے یوں نعمت بنالیا کہ اپنے ذاتی تجربوں کی مدد سے اپنی یادداشتیں قلم بند کیں۔ اور یوں پاکستان کو اپنی تحریروں کی شکل میں ایک گراں بہا ادبی سرمایہ عطا کیا۔

ایک عظیم قومی سانحے کو انہوں نے اپنے تجربوں، مشاہدوں اور عینی شہادتوں کے حوالے سے قابلِ قبول بلکہ لائق تحسین انداز میں سپردِ قلم کر کے اپنا قومی فریضہ بھی پورا کیا اور قلم کی ادبی حرمت کا بھی حق ادا کیا۔!!

اپنے ایک خط میں جوڑھاکہ سے 11 اکتوبر 1971 کو نقوش کے محمد طفیل کو لکھا۔ مسعود مفتی کے دکھ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے جو اس وقت کے مشرقی پاکستان کے حالات سے انہیں ہو رہا تھا۔ ان کا ذہنی کرب اور قومی دکھ ملاحظہ کریں:۔

''۔۔۔یہاں آ کر ان لوگوں کی آنکھوں میں جھانکئے۔ ہیبت، بے یقینی، وہم اور اَن دیکھے بوجھوں سے لبریز فضا کو دیکھئے۔ ریلیف کیمپوں کی سسکتی ہوئی خاموشی کو سنئے۔ ہر طرف منڈلاتی ہوئی موت کے پروں کو دیکھئے تو ان دو سطروں کی وضاحت خود بخود ہو جائے گی۔ عام فضا اور لوگوں کی ذہنی کیفیت ایسی ہے کہ روایتی پیمانوں کے مطابق کئی چیزیں جو وہاں ناجائز لگتی تھیں۔ یہاں جائز سی لگنے لگ جاتی ہیں۔۔۔اور اگر ہمارے افسانے اس صورت حال سے منہ چھپاتے ہیں تو ہمیں قلم توڑ کر پھینک دینے چاہئیں۔ کوئی حق نہیں رہتا ہمیں لکھنے کا۔۔۔ایک خط پہلے بھی لکھ چکا ہوں۔۔۔اپنے طویل خط کے متعلق آپ کے استفسار کے جواب میں۔۔۔امید ہے مل گیا ہوگا۔''

خاکسار
مسعود مفتی

تشبیہات و استعارات کا خوبصورت استعمال

مسعود مفتی کے ادب کی ایک اور خوبی ان کا تشبیہات اور استعارات کا خوبصورت استعمال اور منفرد اندازِ بیاں ہے۔ وہ شگفتہ نثر تو لکھتے ہی ہیں اس کے ساتھ ساتھ ان کی سنجیدہ تحریروں میں بھی خوبصورت تشبیہات و استعارات نے اُن کا ادبی رتبہ بلند اور ممتاز کر دیا ہے۔ 'نئی قدریں' میں ان کی اس خوبی کا یوں تذکرہ کیا گیا ہے کہ:۔

''مسعود مفتی کے افسانوں کی زبان شیریں اور شاعرانہ ہے۔ ان کی تشبیہات اور استعارے خاصے دلنشیں اور رسیلے ہیں۔ تحریر میں گھلاوٹ بھی ہے تراوٹ بھی۔''

ریزے میں شامل افسانے ''نیند'' کا آغاز وہ اس طرح کرتے ہیں

''مارچ 1971 میں ڈھاکہ کیتلی میں بند پانی کی طرح تھا جس کے نیچے دھیمی، مگر مسلسل آگ ہو۔ اور ابلنے سے پہلے کی شوں شوں جاری ہو۔ جس میں سینکڑوں ننھے ننھے بلبلے تہہ سے اٹھ کر دیوانہ وار اوپر کو بھاگتے ہیں اور سطح پر آ کر

بلا مقصد پھوٹ جاتے ہیں۔ڈھاکہ کے لڑکے، خصوصاً طلباء ان بلبلوں کا روپ
دھارے چہار طرف اڑتے نظر آتے تھے۔"

ڈھاکہ کو کیتلی میں بند پانی سے اور ڈھاکہ کے لڑکوں خصوصاً طلباء کو بلبلوں سے تشبیہ دے کر انہوں نے کہانی کا کیا خوبصورت آغاز کیا ہے۔جس کا انجام "دائمی نیند" کی صورت میں ہوا۔ان کا ایک اور افسانہ 'خوش قسمتی' ہے جس میں وہ رقاصہ کے فن کو کس خوبصورتی سے بیان کرتے ہیں۔ملاحظہ ہو:۔

"اس کے لہراتے ہوئے انگ گویا فن کی بلندیوں کے ناقوس تھے۔گروپ میں وہ سب سے اعلیٰ اور اکیلے میں لاثانی تھی اس کے پاؤں کی حرکات سیال مادے کی طرح مختلف سانچوں میں ڈھلتی جاتیں۔کبھی ان میں بجلیاں تھرکنے لگتیں۔کبھی وہ خمار آلود ہو کر بوجھل ہو جاتے اور کبھی بادِ نسیم کی طرح مست خرام ہو جاتے۔"

ایک کہانی 'جال' جو ریزے میں شامل ہے اس میں کمرے کی ابتری کی اس طرح تصویر کشی کی:۔

"۔۔۔ٹوٹے ہوئے فوٹو فریم، بوٹ پالش کی پچکی ہوئی ڈبیا اور ٹُنچا کھچا برش، ٹوتھ پیسٹ کی مطلوح ٹیوب، پنسلوں کے ٹکڑے، سادہ لفافے، ایک پاؤں کی میلی جُراب، ٹوٹا ہوا فونٹین پن اور اسی قسم کی چیزیں بکھری پڑی تھیں۔صبح جاگنے والی رنڈی کے بالوں اور کپڑوں کی طرح پریشان اور بے شکن پورے کمرے میں وحشت اور ابتری تھی۔"

کمرے کی وحشت اور ابتری کو کس طرح صبح جاگنے والی رنڈی کے بالوں اور کپڑوں سے تشبیہ دی ہے۔یقیناً ایک اچھوتی اور منفرد تشبیہ ہے۔رنڈی کی زندگی کو لیجئے کیا یہ ٹوٹا ہوا فوٹو فریم نہیں؟ کیا یہ پالش کی پچکی ہوئی بے جان اور بے شکل ڈبیا کی مانند نہیں؟ سادہ لفافے کی مانند ہی تو ہے؟ جو جس کا جی چاہے اس پر لکھ دے۔اس بے چاری کی زندگی بھی تو ایک ٹُنچے کھچے برش کی مانند ہے۔اس کی زندگی بھی پاؤں کی میلی جُراب ہی تو ہے!۔

اسی کہانی میں آگے چل کر وہ کہتے ہیں کہ جنگی قیدیوں کے کیمپ میں آنے کے بعد انہیں گزشتہ دنوں کے مسلسل کھچاؤ سے نجات ملی تھی۔کیونکہ یہاں پر آنے سے پہلے اُس وقت کے حالات کی وجہ سے وہ ایک شدید قسم کی ہیجانی کیفیت سے دوچار رہ چکے تھے۔جبکہ ہندوستانی فوجیں سرحد پر پاکستانی فوج کو مصروف رکھ کر درمیانی فاصلوں سے اندر کو دھڑا دھڑ بڑھتی چلی آ رہی تھیں اور ہیلی کاپٹروں اور پیراشوٹوں کے ذریعے بھی اترنے لگی تھیں۔پاک فضائیہ بے کار ہو چکی تھی۔کوئی جگہ محفوظ نہ تھی۔اوپر سے بم، نیچے سے گوریلوں کے حملے کا خطرہ۔ساتھ ساتھ بنگالیوں کے بدلتے ہوئے اطوار۔ان سب سے بڑھ کر

پاکستانی فوج کے ہتھیار ڈالنے کا سانحہ تھا۔ان سب کیفیات سے گزر کر مصنف جب مغربی پاکستان کے جنگی قیدیوں کے کیمپ میں لائے جاتے ہیں تو اس کیفیت کا بیان یوں کرتے ہیں:۔

''ہمیں ہارے ہوئے جواری کا وہ ٹھہراؤ مل گیا تھا جو سخت ہیجانی کیفیت کے بعد اس کے خالی ہاتھوں، خالی جیب اور خالی ذہن کو ملتا ہے۔'' یا پھر یہ تشبیہ کہ ''بولتے بولتے اچانک یوں رک گیا جیسے کسی تیراک کی ٹانگ نیچے سے مگر مچھ پکڑے۔''

ایک اور جگہ وہ فرماتے ہیں۔

''ریٹائرڈ آدمی سرکار کے آسمان سے گرتا ہے تو گھر کی کھجور میں اٹک جاتا ہے وہ کلی فراغت سے حسب سابق محروم ہی رہ جاتا ہے۔''

'شناخت' مسعود مفتی کا وہ افسانہ ہے جو توبہ میں شامل ہے۔اس میں وہ گزرے ہوئے وقت کو کس طرح خوبصورت تشبیہات سے مزین کر کے قاری کو آگاہ کرتے ہیں۔

''سلسلہ ء روز و شب بڑی ہموار رفتار سے افق کا جھولا جھولتا رہتا ہے۔ ہر جھلا دے سے کسی جگہ امیدوں کے قطرے ٹپکتے ہیں۔ کہیں وسوسوں کے کانٹے ابھرتے ہیں اور کہیں حسرتوں کی کنکریاں گرتی ہیں۔ان سب میں سے کوئی کسی کارگاہ حیات میں اٹک جاتی ہے اور شارٹ سرکٹ سے چنگاریاں اٹھنے لگتی ہیں۔کوئی چنگاری ایک ٹمٹماہٹ کے بعد سو جاتی ہے اور کوئی شعلے اور دھوئیں کے بادل اٹھا دیتی ہے''

اسی طرح آگے چل کر وہ اسی کہانی میں ایک اور جگہ یوں کہتے ہیں:۔

''کنوارا پیاسا تو شہر کے ہر کنوئیں میں جھانکتا ہے مگر جب گھر بس جائے تو کنواں صحن کی گود میں سرک آتا ہے۔مرد ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر چہکتے ہیں۔ عورتیں گھور کر روکتی ہیں۔ باجے کی موسیقی میں بچوں کی کلکاریاں گھنگھرو کی طرح بجتی ہیں۔اور پب کی نیم مخمور بیگانہ کثافت کی جگہ گھر ہستی کی غیر محسوس لطافت لے لیتی ہے۔ گفتگو کے چولے بدل جاتے ہیں۔ترنگ کو لگام پڑ جاتی ہے۔پھکو بازی کی جگہ ڈھکا چھپا مزیہ مزاح لے لیتا ہے اور ہر نظر آنے والی حوا کے تجزیے کی بجائے صرف ایک بیوی کا تذکرہ شروع ہو جاتا ہے۔''

مسعود مفتی نے اپنی تحریروں میں ایک جگہ اپنے بارے میں لکھا ہے کہ ''شعر ان کے غیر شاعرانہ حافظے میں نہیں آ رہا تھا۔'' لیکن ان کے افسانوں میں جا بجا ان کی شاعرانہ تحریر ملتی ہے۔وہ بڑے ہی خوبصورت

الفاظ میں ماحول کی یوں تصویر کشی کرتے ہیں کہ شاعری کا گماں ہوتا ہے مثلاً میکدہ میں:۔

"طارق اپنی ترنگ میں بولے جا رہا تھا۔۔۔" بالکل اسی طرح جس طرح میں پچھلے پچیس برس کی ہر رات تمہیں اپنے تصور میں دیکھتا رہا ہوں۔۔۔ تمہارا خوبصورت گلنار چہرہ۔۔۔ بے باک آنکھیں۔۔۔ بھرے بھرے رخسار۔۔۔ گداز جسم۔۔۔ اور بہشتی لمس۔" فرحانہ کا چہرہ لال ہونے لگا "تم واقعی مجھے یاد کرتے رہے ہو یا اب باتیں بنا رہے ہو؟"

طارق سرگوشی میں بولا "میں تو اتنے برس دل ہی دل میں اس چاند جیسے چہرے کی پوجا کرتا رہا ہوں جس نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے مجھے افریقہ سے الوداع کیا تھا۔۔۔ رسیلے ہونٹوں اور بھیگی آنکھوں والا وہ چہرہ میرے سارے وجود کے اندر چاندنی کی طرح چمکتا رہتا ہے۔۔۔ اب بھی جب میں تمہیں دیکھ نہیں سکتا تھا تو میں تمہارا ہر لمس اسی چہرے اور اسی جسم سے حاصل کر رہا تھا جو پچیس برس پہلے تھا۔۔۔ میری آنکھوں پر پٹی بندھی ہے۔ مگر میں اپنے دل میں وہی چہرہ دیکھ رہا ہوں۔"

یا پھر "سالانہ ڈنر" کے یہ جملے۔۔۔ دھیمی باتیں۔ مترنم ہنسی، ہلکے پھلکے موضوع۔ تیکھی جملہ بازیاں اور چلبلیں چہروں اور جسموں پر۔ کہیں چمکدار چاندنی کے چھینٹے اور کہیں نیم تاریک اور بے اثر سایوں کی ہلکی چھاؤں، جیسے پہاڑوں پر پچھلے پہر کی دھوپ اور چھاؤں باہم بغل گیر ہوتی رہتی ہیں۔ فرش پر چاندنی وسیع چادر کی طرح پھیلی تھی جس پر کھانے والوں کے اعضاء اونچے نیچے چوکور تکون اور بے ڈھنگے سائے کشیدہ کاری کے انداز میں ڈال رہے تھے۔"

ہم عمر بھر دوسروں کا مشاہدہ اپنی نظروں سے کرتے رہتے ہیں لیکن ان نظروں کے بارے میں ایسا بیاں ہم نے کم ہی پڑھا ہوگا:۔

"جس طرح دھوپ اور ہوا آہستہ آہستہ تالاب کے پانی کو ہلا کر اُس میں اَن دیکھی روئیں اور ارتعاش پیدا کرتی رہتی ہیں اسی طرح دوسروں کی نظریں زندگی بھر ہمارے اندر کچھ نہ کچھ کرتی رہتی ہیں۔ چپکے چپکے غیر محسوس انداز میں۔ کبھی بچے کی معصوم نظر بن کر کبھی والدین کی تمنا بن کر۔ کبھی حاکم کی مصلحت بن کر۔ کبھی محبوب کا پیغام بن کر۔ کبھی رقیب کا حسد بن کر۔ کبھی حریف کا چیلنج بن کر اور کبھی تماشائی کا خاموش تبصرہ بن کر۔"

(ہم نفس)

آنکھ جس کی مدد سے ہم دوسروں پر نظر ڈالتے ہیں اس کو مندرجہ ذیل انداز سے بیان کرنا مسعود مفتی ہی کی خوبی ہے۔

"آنکھ جسم کا سب سے زیادہ زندہ حصہ ہے۔ دل اور دماغ کا ڈائل ہے۔ احساسات و جذبات کی عکاس ہے۔ بند قلعے کی واحد کھڑکی جو یہ خبر دیتی ہے کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔ اظہار ہونے سے پہلے ہی چغلی کھاتی ہے اور کبھی دھوکا نہیں دیتی۔ اندر خوشی ہوئی تو آنکھ میں دھنک پھوٹی اندر دل بیٹھا تو آنکھ بجھ گئی۔"

(ہم نفس)

آنکھ کے بارے میں شعراء اور ادیبوں نے بھی اپنے اپنے انداز میں بہت خوبصورت لکھا ہے اقبال نے بھی فرمایا۔

مسعود مفتی نے بھی شاعرانہ نثر میں کس خوبصورتی سے آنکھ کے بارے میں فرمایا ہے۔ اسی آنکھ سے نہ صرف ہم دوسروں پر نظر ڈالتے ہیں بلکہ اس میں آئے ہوئے آنسو سے بھی ہم دوسروں کو پیغام دیتے ہیں۔ آنسو کا یہ بیان تو قاری نے کم ہی پڑھا ہوگا۔

"عورت کا آنسو قدرت کا عجیب کرشمہ ہے۔۔۔۔ یہ انسانی جسم میں ایک آسمانی کشید ہے۔۔۔ قطرے آبی مگر طاقت روحانی، یلغار خدائی اور تاثیر طلسماتی۔۔۔ اس کے سامنے بڑے بڑے اولوالعزم ہمت ہار دیں اولوالامر اپنے اختیار توڑ دیں اولوالابصار کی بصیرت پر پردہ پڑ جائے۔۔۔ مرد کی دنیا کا محور یا تو مشیتِ ایزدی سے بدلتا ہے یا پھر نسوانی آنسو کی یلغار سے۔۔۔ مگر یہ طلسم تو دوسروں کے لیے ہے خود عورت کی ذات پر کیا اثر پڑتا ہے؟۔۔۔ یہ سوال بغیر کسی بازگشت کے خلا میں گم ہو جاتا ہے۔ نہ کوئی سمجھ سکا ہے نہ کوئی اس سوال کا جواب پا سکا ہے۔۔۔ کوئی نہیں جانتا کہ آیا یہ رونے والی کے لئے محض بے چارگی کا تزلزل ہے خلا کا تزکیہ ہے جذبات کی تسکین ہے۔ غصے کا ابال ہے یا پھر حکمتِ عملی کی ترویج ہے اور نہ معلوم اس کا اثر خود نسوانی جسم پر کیا ہے؟ کیمیائی، نفسیاتی یا کچھ بھی نہیں۔"

(نابینا)

آخری ملاقات

احمد ندیم قاسمی 10 جولائی 2006 کو فوت ہوئے۔ اس سے چند روز پہلے تقریباً 20 جون کے آس پاس میری ان سے آخری ملاقات ہوئی۔

مگر اس ملاقات کو سمجھنے کے لیے کچھ اور ملاقاتوں کا ذکر ضروری ہے۔

پہلی ملاقات تو نہیں کہہ سکتا البتہ بے نام سی شناسائی ان کہانیوں کی معرفت ہوئی جو لڑکپن کی نا سمجھی کے باوجود دل و دماغ پر چھا جاتی ہیں۔ آنے والے دنوں میں جب شعور کے تارے دھیرے دھیرے ابھرنے لگے تو ساتھ ہی ایک باریک سا چاند بھی طلوع ہونے لگا۔ جو پسندیدہ کہانی کار احمد ندیم قاسمی کا نام تھا۔ پھر یہ چاند وقت گزرنے کے ساتھ ایک رومانٹک سا ہیولیٰ بنتا گیا۔

اس ذہنی اور جذباتی تعلق سے جب میں نے 1957 میں افسانہ نگاری کا سفر شروع کیا تو دیگر رسالوں میں محدود سی شرکت کی نسبت میری زیادہ تر تحریریں پہلے محمد طفیل کی زیر ادارت ''نقوش'' اور پھر احمد ندیم قاسمی کی زیر ادارت ''فنون'' میں شائع ہوتی رہیں۔ دونوں سے فرداً فرداً پہلی بالمشافہ ملاقات 1964 میں ہوئی جب میں لاہور میں تعینات تھا۔ پھر طویل وقفوں سے ملاقاتیں اور مناسب وقفوں سے خط و کتابت جاری رہی۔ محمد طفیل کے زیادہ تر خطوط نئی تحریر کی فرمائش کے لیے ہوتے تھے اور قاسمی صاحب کے زیادہ تر خطوط نئی تحریر کی رسید ہوتے تھے، جن میں اظہار تشکر کے علاوہ مختصر سا تبصرہ بھی ہوتا تھا۔ عام طور پر قاسمی صاحب کی طرف سے فرمائش خال خال تھی۔ اور طفیل کی طرف سے شکریہ خال خال تھا۔ مگر بعض دفعہ دونوں کی طرف سے دونوں ہی قسم کے مراسلے مل جاتے تھے۔

احمد ندیم قاسمی سے میرا ادبی رشتہ کم و بیش بیالیس برس تک قائم رہا۔ بے تکلفی کی حدوں سے بہت دور اور اتنے ہی فاصلے کے آر پار جو ایک ہمہ وقتی مکمل ادیب اور جز وقتی نامکمل ادیب کے درمیان ہوتا ہے۔ مکمل ادیب یوں کہ قلم پر ایمان کے ساتھ ساتھ وہ اپنے نظریات کے لیے جہاد کی ہمت بھی رکھتے تھے۔ 1951 اور 1958 میں اپنے ترقی پسندانہ نظریات کی وجہ سے جیل جا سکتے تھے اور پھر انہی نظریات کو

پاکستانی سانچے میں ڈھالنے کے اجتہاد کی ہمت بھی رکھتے تھے۔ میرے جیسا پابجولاں سرکاری ملازم ایسے امکانات سے محروم تھا۔ اس لیے یہ باہمی فاصلہ بھی رہا اور اس میں باہمی خلوص اور احترام کے سمندر بھی لہراتے رہے۔

مگر اس فاصلے کے آر پار ہمارے درمیان ایک غیر ادبی تعلق بھی تھا۔ جو کسی پوشیدہ رابطے کی طرح دھیرے دھیرے ابھرا۔ مگر دو درختوں کے درمیان مکڑی کے بنائے ہوئے پھیلے تار کی طرح کسی کو بھی نظر آتا تھا۔ نہ دوسروں کو۔ نہ انہیں۔ نہ مجھے۔ یہ صرف محسوس ہوتا تھا اور اتنا لطیف، غیر واضح اور مبہم تھا کہ اسے بیان کرنا بہت مشکل ہے۔ پھر بھی آج اسی دوسرے رشتے کے متعلق کچھ کہنے کی کوشش کروں گا۔ یہ رشتہ خالصتاً وطن کے عصری حالات کے حوالے سے تھا۔ جس میں مشرقی پاکستان کے سانحے کا بہت دخل تھا۔

آج پس نظری کی بناء پر کہہ سکتا ہوں کہ اس رشتے کا آغاز 1967 میں ہوا۔ مگر بڑے ہی تلخ انداز میں۔ 1965 کی جنگ کے بعد میں نے افسانہ بہ عنوان "دو خون" لکھا۔ اور حسب عادت "نقوش" کو بھیج دیا۔ مگر طفیل صاحب نے اس نصیحت کے ساتھ واپس کر دیا کہ "اس افسانے کو دفن کر دیں۔" تب میں نے قاسمی صاحب کو بھیجا تو انہوں نے بذریعہ رجسٹری واپس کر دیا اور 24 ستمبر 1967 کو خط میں لکھا:

> "۔۔افسانہ واپس حاضر خدمت ہے۔ اس سلسلے میں اتنا شرمندہ ہوں کہ بیان نہیں کر سکتا۔ مگر ایک بار پھر (بحیثیت مدیر نہیں بحیثیت دوست) میری درخواست ہے کہ شہیدوں کے خون اور اس خون کو ملانے کا معاملہ بے حد نازک ہے اور خواہ مخواہ ایک بے معنی احتجاج پیدا کر سکتا ہے۔۔۔ بہر حال باقی باتیں زبانی ہوں گی۔۔"

زبانی باتوں کا وعدہ کافی دیر پورا نہ ہو سکا۔ کیونکہ میں دوروز کے سفر کی مسافرت پر بلوچستان میں تھا۔ مگر جب ملاقات ہوئی تو کھل کر بات ہوئی۔ وہ میری بات کے قائل نہ ہوئے۔ میں ان کی بات کا قائل نہ ہوا اور صرف یہی اتفاق ہوا کہ اختلاف قائم ہے۔ مجھے یوں لگا کہ 1965 کی جنگ نے احمد ندیم قاسمی کی عالمی ترقی پسندی اور قومی پاکستانیت کو تو یک جا کر دیا تھا مگر اندرون خانہ بندوبست کے معاملے میں وہ ابھی محتاط تھے۔ (یہ افسانہ کوئی دو برس مختلف مدیروں سے واپس آتا رہا۔ بالآخر ناصر زیدی نے ادب لطیف میں شائع کیا)

اگلا مرحلہ تین برس بعد آیا۔ پس منظر یہ تھا کہ بلوچستان میں ملازمت کے دوران اردو اور پشتو کے شاعر رب نواز مائل سے پشتو زبان کے سبق پڑھتا رہا۔ بعد ازاں سندھ میں ملازمت کے دوران ایک

مقامی استاد سے سندھی زبان کی ٹیوشن لیتا رہا۔ اسی محدود علم کی بناء پر 1970 میں قاسمی صاحب سے گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ مناسب سکرپٹ کے بغیر پنجابی زبان نظر انداز ہوتی رہے گی۔ اگر ہم پشتو اور سندھی کے حروف ابجد میں سے چند حروف پنجابی کے لیے استعمال کر لیں تو قریباً ہر علاقے کی پنجابی کے تلفظ کے مطابق بڑی موثر سکرپٹ بن سکتی ہے۔ علاوہ ازیں پشتو اور سندھی کے رائج ٹائپ رائٹر اور پریس سے بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

اس وقت تو بات ختم ہو گئی۔ مگر چند دن بعد مجھے شاہ حسین کالج کی طرف سے ایک ادبی محفل کا دعوت نامہ ملا اور ساتھ ہی قاسمی صاحب کا یہ پیغام بھی کہ اس موقع پر پنجابی سکرپٹ کے متعلق اپنی تجویز بھی پیش کر دوں۔ مقررہ تاریخ پر وہاں پہنچا تو غالباً قاسمی صاحب ہی صدارت کر رہے تھے۔ وہاں بلیک بورڈ کی مدد سے میں نے بات ختم کی۔ اس پر نیم دلی سے بحث ہوئی اور وہی حشر ہوا جو آج تک پنجابی سکرپٹ کی ہر اصلاح کا ہوتا رہا ہے۔ اور جس کی وجہ سے یہ معاملہ آج بھی وہیں ہے جہاں 36 برس پہلے 1970 میں تھا۔

اس رشتے کا اگلا قدم 1974 میں بڑھا جب ہندوستان کی قید سے رہا ہو کر میں لاہور پہنچا اور قاسمی صاحب ملنے آئے۔ وہ دیر تک بیٹھے پہلے قید کے زمانے، پھر ہندو پاک سیاست اور بعد ازاں پاکستانی سیاست پر گفتگو کرتے رہے۔ دو چار روز بعد انہوں نے اپنے اخباری کالم میں لکھا کہ مسعود مفتی جسمانی طور پر پہلے سے کمزور مگر نظریاتی طور پر پہلے سے زیادہ طاقتور ہو گئے ہیں۔ انہی دنوں پاکستان نیشنل سنٹر لاہور برانچ کی انچارج کشور ناہید نے ایک پرہجوم تقریب مرتب کی۔ جہاں میں نے اپنی رپورتاژ "چہرے" کے کچھ حصے پیش کیے تو قاسمی صاحب نے اپنے کالم میں سامعین کی اکثریت کے رونے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ "جو رو نہ سکے وہ لرزتے رہے کہ تواریخ کے عامل کردار بعض اوقات ملکی آبادیوں سے کیسے کیسے مذاق کر جاتے ہیں۔"

ان کا یہ اشارہ تو 1971 کے حاکموں کی طرف تھا۔ مگر چند ہی روز بعد مجھے قاسمی صاحب کو بتانا پڑا کہ یہ مذاق تو 1974 میں بھی حسب سابق جاری تھا۔ اس کا پس منظر یہ تھا کہ پاکستان نیشنل سنٹر راولپنڈی سے ایک صاحب میرے پاس لاہور میں یہ دعوت لے کر آئے کہ میں راولپنڈی کی تقریب میں بھی "چہرے" پڑھ کر سناؤں مگر مجھے معذرت کرنا پڑی۔ کیونکہ اس وقت تک حکومت کی طرف سے خاموش رہنے کے اشارے مل چکے تھے۔ اس کے علاوہ پاکستان ٹیلی ویژن سے بھی خط و کتابت ہو چکی تھی۔ جس میں انہوں نے پہلے تو مجھے مشرقی پاکستان کے متعلق کچھ ڈرامے لکھنے کی فرمائش کی اور جب میں نے

آمادگی ظاہر کی تو خبردار کیا کہ ان میں 1971 کے واقعات کا ذکر نہ ہو جس پر میں نے ڈرامے لکھنے سے انکار کر دیا۔

اس صورت حال پر گفتگو کے دوران جب میں نے خدشہ ظاہر کیا کہ تواریخ کے عامل کرداروں کا یہ مذاق اب آئندہ بھی جاری رہے گا تو قاسمی صاحب کے لب تو خاموش رہے مگر ان کی آنکھیں بھرپور تائید سے چھلک رہی تھیں اور مجھے نوید دے رہی تھیں کہ سقوط ڈھاکہ نے 1967 والا اختلاف نہ صرف مکمل طور پر تحلیل کر دیا ہے بلکہ اس تبدیلی کی ایک توانا لہر اندرون خانہ بندوبست تک بھی پہنچ گئی ہے۔

اگلے مرحلے میں ہمارا یہ دوسرا باہمی رشتہ اس وقت پوری طرح مستحکم ہو گیا جب مشرقی پاکستان کے متعلق میری دیگر تحریریں دھیرے دھیرے منظر عام پر آنے لگیں اور سرکاری حلقوں کے علاوہ بعض دیگر حلقوں کے لیے بھی قابل اعتراض ٹھہریں۔ اسی وجہ سے رسالہ فنون میں "اختلافات" کے عنوان سے کھلی بحث شروع ہو گئی۔ جس کا ذائقہ آپ قاسمی صاحب کے خط کے اس اقتباس سے چکھ سکتے ہیں۔ جو انہوں نے مجھے 22 جولائی 1976 کو لکھا:-

> "۔۔ بحث جس نہج پر چلی ہے اس سے میں مطمئن نہیں ہوں۔ مجھے اس سلسلے میں بہت شدید ایڈیٹنگ کرنا پڑی اور انتہا پسندانہ جملوں کو قلم زد کرنا پڑا۔ اس کے باوجود آپ کو اور دیگر احباب کو اور خود مجھے بھی شکایت ہے کہ لہجہ کہیں کہیں کچھ زیادہ ہی "گرم" ہو گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ لہجہ وہیں گرم ہوتا ہے جہاں عقل و منطق ساتھ چھوڑ جاتی ہے۔ چنانچہ میں نے اس بحث کو بند کر دینا مناسب سمجھا۔ آپ کی ذات کے بارے میں جو کچھ کہا گیا اسے خدارا محسوس نہ کیجئے گا کہ بحث میں یہ سب کچھ ہوتا ہے۔ بہرحال یہ طے ہے کہ آپ کا نقطہ نظر، جو دراصل ہم میں سے بہتوں کا نقطہ نظر ہے، کامیاب رہا۔۔۔"

قاسمی صاحب کا یہ خط میرا بہت قیمتی سرمایہ ہے۔ کیونکہ مشرقی پاکستان کے بارے میں میرا نقطہ نظر نقادوں کو تو آج تک نظر یا سمجھ نہیں آیا مگر قاسمی صاحب پر 1976ء میں ہی واضح ہو گیا تھا۔ اس لیے جب میں نے 1986ء میں ملایا میں اپنی کتاب "ہم نفس" مکمل کی تو وہ چار برس تک پانچ قسطوں میں رسالہ "فنون" میں بغیر کسی ترمیم کے اور بلا حیل و حجت شائع ہوتی رہی۔ اس دوران قاسمی صاحب کے جو خطوط بھی مجھے ملے وہ براہ راست یا بین السطور حوصلہ افزائی سے لبریز ہوتے تھے۔ قاسمی صاحب سے مجھے یوں داد ملی کہ چند برس بعد اپنی کتاب "پس الفاظ" عنایت کرتے ہوئے وہ مجھے کہنے لگے:-

''اس میں 1980 کی اہل قلم کانفرنس میں میرا کلیدی خطبہ ہے۔ میں جانتا
ہوں یہ آپ کو ضرور پسند آئے گا۔''

میں اس کانفرنس میں مدعو نہ تھا مگر اس خطبے کا ذکر سن چکا تھا۔ چنانچہ جب میں نے قاسمی صاحب کا یہ فقرہ پڑھا کہ ''ہم ادیبوں کو فخر اور اصرار ہے کہ ہم کسی حکومت کے ترجمان کبھی نہیں رہے۔ ہم صرف اپنی مملکت اور اہل مملکت کے ترجمان ہیں۔'' تو میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔۔۔ اور مجھے یوں لگا کہ قاسمی صاحب کے یہ الفاظ (میں جانتا ہوں آپ کو ضرور پسند آئے گا) میرے لیے کسی بھی سرکاری اعزاز سے بڑا اعزاز تھے۔

یہ تو اس رشتے کی نمو کی داستان تھی مگر اس کی نوعیت کیا تھی۔ یہ سمجھانے کے لیے قاسمی صاحب کی ہی ایک تحریر کا اقتباس پیش کرتا ہوں:-

''اپنے ہم عصر کا صحیح ادراک یہ نہیں ہے کہ ہم عالمگیر بننے کی خاطر دوسروں کی نقالی کریں۔ ہم سے روح عصر کا مطالبہ تو یہ ہے کہ ان لمحوں کو اپنی گرفت میں لائیں جو ہماری سرزمین پر سے گزر رہے ہوں۔۔۔ اس ایک لمحے کے ہزار روپ ہیں۔ مگر ہم پر اس لمحے کے اس رنگ کا حق فائق ہے جو وہ ہمارے وطن پر سے گزرتے ہوئے اختیار کرتا ہے۔ اسی کو روح عصر کہتے ہیں۔ یہ لمحہ ہماری گرفت میں نہیں ہے تو ممکن ہے ہم عالمگیر تو ہو جائیں مگر پاکستانی کیسے کہلائیں گے۔'' (''روح عصر کے تقاضے'' ۔تہذیب و فن۔ جلد اول)

قاسمی صاحب کے یہی جملے ہمارے باہمی رشتے کی روح تھے۔ نوعیت یہ تھی کہ ہم دونوں اب باقی ماندہ پاکستان کے عصری لمحوں سے پریشان رہتے تھے۔ 1994 میں ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد میری صحافتی تحریروں کا قاسمی صاحب کو اندازہ تھا۔ اس کے علاوہ 1998 سے پاک جمہور کے نئے تجربے کا لٹریچر بھی میں انہیں باقاعدہ بھیج رہا تھا۔ اسی طرح ان کے خیالات کالم کے ذریعے مجھ تک پہنچ جاتے تھے۔ اس لیے عصری لمحوں کے تجزیے کے لیے لمبی بحث کی ضرورت نہ تھی۔ مختصر گفتگو، معنی خیز تبصروں یا آہوں کے تبادلے سے ہی ابلاغ ہو جاتا تھا۔ اور فکر و نظر کی یہ وحشت عیاں ہوتی رہتی تھی۔ اس ضمن میں کردار سازی کے متعلق قاسمی صاحب نے ایک ذاتی واقعہ دو تین مختلف مواقع پر سنایا۔

انہوں نے بتایا کہ میری ادبی زندگی اور ملازمت کا آغاز ہی تھا جب ن۔م۔راشد اپنے ایک دوست کے ساتھ میرے گاؤں میں آئے۔ گرمیوں کے دن سہ پہر کا وقت۔ میں نے ان دونوں کے سامنے

شربت کے گلاس رکھے تو دونوں نے جیب سے ایک ایک چونی نکال کر میز پر رکھ دی اور وضاحت کی کہ وہ خاکسار ہیں اور علامہ مشرقی کا حکم ہے کہ مناسب معاوضے کے بغیر کسی قسم کی خاطر تواضع قبول نہ کی جائے۔ یہ تاویل میزبان کو قبول نہ تھی۔ گھنٹہ بھر کی بحث کے بعد وہ دونوں اپنی اپنی چونی اٹھا کر چل دیے اور شربت کے گلاس ویسے کے ویسے ہی دھرے رہ گئے۔

سنگاپور سے پشاور تک پھیلی ہوئی خاکسار تحریک کی جولانیاں اور خاکساروں کا مضبوط کردار ہم دونوں کو یاد تھے اور ہم دونوں پاکستان کے سیاسی سماجی نظام کے ہاتھوں اس مضبوط کردار والی نسل کے بیٹوں اور پوتوں کا مسلسل انحطاط اور تنزل دیکھ رہے تھے۔ پھر ستاروں کے چلن میں وطن عزیز کا مستقبل ڈھونڈتے رہتے تھے۔ میں اکثر سوچتا کہ قاسمی صاحب کے متعلق فتح محمد ملک نے کتنا سچ لکھا ہے "یوں محسوس ہوتا ہے جیسے پاکستان کی بقا، خوشحالی و آزادی و خود مختاری، ندیم کی ذاتی بقا اور اپنے جذباتی استحکام کا ہی دوسرا نام ہو۔ جیسے ندیم خود پاکستان ہو اور اس کے اندر اپنی بنیادوں کو پگھلنے سے بچانے کی جنگ برپا ہو۔" (احمد ندیم قاسمی۔ شاعر اور افسانہ نگار۔ صفحہ 109)

مکمل دیانتداری اور انکساری کی حدود کے اندر اندر میں نے کوشش تو کی ہے مگر معلوم نہیں۔ میں اس دوسرے غیر واضح اور دھندلے رشتے کی وضاحت میں کامیاب ہوا ہوں یا نہیں۔ اگر نہیں تو براہ کرم آپ اسے ہماری آخری ملاقات کے پس منظر کے طور پر قبول کرلیں۔

جون 006 کا مہینہ۔ دوپہر کا وقت۔ اپنا نیا تازہ افسانوی مجموعہ "توبہ" پیش کرنے کے لیے جب میں قاسمی صاحب کے دفتر میں داخل ہوا تو وہ بالکل اکیلے بیٹھے ہوئے تھے۔ بہت ہی نحیف ولاغر۔ دبی دبی دھیمی آواز۔ مگر ذہنی طور پر چاق و چوبند۔ فون پر بھی۔۔ اور میرے ساتھ گفتگو میں بھی۔۔۔ کتاب کے مندرجات کی فہرست پر نظر دوڑائی تو کہنے لگے "ان میں سے بیشتر تو فنون میں ہی شائع ہوئے تھے۔"

پھر افسانوں پر بات چلی تو موضوعات اور نفس مضامین کی وجہ سے چلتے چلتے حالات حاضرہ پر جا نکلی۔ اس گفتگو میں وہ وطن کے حالات پر بہت افسردہ تھے اور پاکستانی معاشرے کے سیاسی طرز عمل سے بہت نالاں تھے۔ جس میں لالچ تھا، خود غرضی تھی اور بے ضمیری تھی۔ میں نے انہی کا ایک شعر سنانے کی کوشش کی مگر میرے غیر شاعرانہ حافظے نے ساتھ نہ دیا۔ تو انہوں نے خود ہی تصحیح کر دی

صبح ہوتے ہی نکل آتے ہیں بازار میں لوگ
گٹھڑیاں سر پہ اٹھائے ہوئے ایمانوں کی!

اور ساتھ ہی چونک کر بولے

"آپ کو میرا خط مل گیا تھا نا؟"

یہ خط ایک افسانے کی رسید تھی جو میں نے چند دن پہلے فنون کے لیے بھیجا تھا۔ اس کا مرکزی خیال یہ تھا کہ آج کے پاکستان میں ہر چہار غیر قدرتی اموات کی فراوانی کا حساس شہریوں پر کیا اثر ہے۔ افسانے کا عنوان تھا "آسیب"۔ یہ افسانہ پڑھتے ہی انہوں نے خط لکھا جس پر 18 مارچ 2006 کی تاریخ تھی۔ اس کا مختصر سا اقتباس یوں ہے:۔

"۔۔آپ کے افسانے نے دو پہلوؤں سے اداس کر دیا۔ ایک اس لحاظ سے کہ فنون کا نیا شمارہ تو پریس میں ہے اور یہ افسانہ آئندہ شمارے میں شامل ہو سکے گا۔۔۔دوسرا اس لحاظ سے کہ افسانے کا مرکزی کردار ہر سوجھ بوجھ والے پاکستانی کا کردار ہے۔ میں نے خود اپنے آپ کو اس کردار میں منعکس پایا ہے اور سڑکوں پر آوارہ پھرنے لگا ہوں۔۔۔آپ کے کمال آگاہی نے افسانے کو ملک کی تواریخ بنا دیا ہے۔۔۔اللہ ہم سب پر رحم فرمائے۔"

چونکہ وہ اسی خط کے بارے میں پوچھ رہے تھے، اس لیے میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

چند لمحے ٹکٹکی باندھ کر مجھے دیکھتے رہے پھر کہنے لگے "یہ افسانہ پڑھ کر میرے تو رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔" میں نے کہا "یہ اس لیے ہوا کہ آپ کے رونگٹے ابھی قائم ہیں۔ ورنہ قوم کے رونگٹے تو عرصہ سے غائب ہو چکے ہیں۔"

سر ہلا کے بولے "واقعی ہم جیسے لوگ جنھوں نے تحریک پاکستان کا جوش اور ولولہ دیکھا ہے اب حیران ہوتے ہیں کہ یہی قوم پچاس ساٹھ برس میں اتنی بے حس کیسے ہو گئی۔"

انہوں نے جس انداز میں یہ بات کی اس کے جذبے کی شدت سے ہم دونوں خاموشی میں ڈوب گئے۔ شاید اپنے رشتے کے درد کی وجہ سے۔۔۔چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ جیسے سٹپٹا کر بولے:۔

"اب تو مر جانے کو جی چاہتا ہے۔ ان حالات میں اب مجھ سے نہیں زندہ رہا جاتا۔"

پچھلے بیالیس برس کے دوران میں نے ان کے لہجے میں درد کی یہ شدت اور شکایت کا یہ انداز کسی بھی بات پر کبھی بھی نہ دیکھا تھا۔ ان کے چہرے پر لامحدود بے بسی اور کرب کے تاثرات دیکھ کر مجھے یوں لگا جیسے وہاں بیٹھے بیٹھے وہ اسی دم بالکل حقیقی انداز میں میرے افسانے کا مرکزی کردار بن گئے تھے۔

شاید۔۔۔اسی لمحے میں ہمارے دھندلے اور غیر واضح رشتے کی وضاحت بھی ہو گئی۔۔۔اور تکمیل بھی ہو گئی۔۔۔ وہ اس طرح کہ پہلی فوجی حکومت کے دوران 1967 میں وہ میرے افسانے کے متعلق جتنے محتاط تھے چوتھی فوجی حکومت کے دوران 2006 میں اسی قسم کے افسانے کے متعلق وہ اتنے ہی بے باک تھے۔

مسعود مفتی

نومبر 2006

اسلام آباد

مسعود مفتی

(سوانحی خاکہ)

1-تعلیمی پس منظر

☆ مڈل۔ اسلامیہ ہائی سکول راولپنڈی

☆ میٹرک (1947) میونسپل کارپوریشن ہائی سکول لاہور۔

☆ ایف ایس سی۔ پری میڈیکل (1949)۔ اسلامیہ کالج لاہور۔

☆ بی ایس سی (1951)۔ اسلامیہ کالج لاہور۔

☆ پوسٹ گریجویٹ ڈپلومہ۔ انٹرنیشنل افیئرز (1953) پنجاب یونیورسٹی لاہور

☆ ڈپلومہ ان جرنلزم (1954) پنجاب یونیورسٹی لاہور۔

☆ ایم اے انگلش لٹریچر (1956) گورنمنٹ کالج لاہور۔

☆ پوسٹ گریجویٹ ڈپلومہ ان پبلک ایڈمنسٹریشن (1960) سینٹ کیتھرین کالج۔ کیمبرج یونیورسٹی انگلینڈ

2-پیشہ ورانہ مصروفیات

(الف) بعد از ملازمت

☆ اردو ادب

☆ صحافت اردو اور انگریزی روزناموں میں سیاسی و سماجی مضامین

☆ سیاست۔ ایک مختلف اور غیر روایتی سیاسی پارٹی۔ "پاک جمہور" کے بانی

(ب) دورانِ ملازمت

- ☆ لیکچرار شعبہ انگریزی۔ دیال سنگھ کالج لاہور۔ ستمبر 1956 تا دسمبر 1958
- ☆ سول سروس آف پاکستان میں شمولیت 1958
- ☆ سول سروس اکیڈمی لاہور۔ 20 دسمبر 1958 تا مئی 1959
- ☆ ڈسٹرکٹ ٹریننگ۔ کاکسز بازار۔ چٹاگانگ مشرقی پاکستان مئی 1959 تا ستمبر 1959
- ☆ ڈپلومہ پبلک ایڈمنسٹریشن۔ کیمبرج یونیورسٹی انگلینڈ ستمبر 1959 تا جولائی 1960
- ☆ اسسٹنٹ کمشنر بہاولپور۔ جولائی 1960 تا فروری 1961
- ☆ ایس ڈی ایم پنڈ دادنخان۔ فروری 1961 تا جنوری 1962
- ☆ ایس ڈی ایم پنڈی گھیب۔ جنوری 1962 تا اپریل 1963
- ☆ سیکشن آفیسر فنانس ڈیپارٹمنٹ لاہور۔ اپریل 1963 تا اگست 1963
- ☆ ڈپٹی سیکرٹری فنانس ڈیپارٹمنٹ لاہور۔ اگست 1963 تا اپریل 1964
- ☆ ڈپٹی سیکرٹری اسٹیبلشمنٹ لاہور۔ اپریل 1964 تا ستمبر 1964
- ☆ ڈپٹی کمشنر پولیٹیکل ایجنٹ لورالائی بلوچستان۔ ستمبر 1964 تا اپریل 1967
- ☆ ڈپٹی کمشنر لائلپور (فیصل آباد)۔ اپریل 1967 تا مارچ 1969
- ☆ ڈپٹی کمشنر لاڑکانہ۔ مارچ 1969 تا جنوری 1970
- ☆ ڈپٹی کمشنر لاہور۔ جنوری 1970 تا مئی 1971
- ☆ سیکرٹری ایجوکیشن حکومت مشرقی پاکستان۔ مئی 1971 تا دسمبر 1971
- ☆ جنگی قیدی ہندوستان۔ دسمبر 1971 تا جنوری 1974
- ☆ ڈپٹی سیکرٹری اکنامک افیئرز ڈویژن۔ اپریل 1974 تا اپریل 1974
- ☆ کمشنر راولپنڈی ڈویژن۔ اپریل 1974 تا جولائی 1975
- ☆ جائنٹ سیکرٹری اکنامک افیئرز ڈویژن۔ جولائی 1975 تا مارچ 1980
- ☆ ایشین ڈویلپمنٹ بنک۔ منیلا (ڈیپوٹیشن پر) فلپائن۔ مارچ 1980 تا اپریل 1991
- ☆ ممبر فنانس اینڈ ایڈمنسٹریشن۔ نیشنل ہائی وے اتھارٹی۔ مئی 1991 تا نومبر 1992
- ☆ او۔ ایس۔ ڈی۔ نومبر 1992 تا مئی 1993
- ☆ ایم۔ ڈی نیشنل زکوٰۃ فاؤنڈیشن۔ مئی 1993 تا جون 1994

☆ ریٹائرمنٹ بطور ایڈیشنل سیکرٹری۔ 10 جون 1994

ریٹائرمنٹ کے بعد مسعود مفتی کو پنجاب پبلک سروس کمیشن میں بطور ممبر نامزد کیا گیا۔ جس پر انہوں نے معذرت کر لی۔

4۔ مطبوعات

الف) قومی ادب

نام		عنوان	پہلی اشاعت
☆ رگِ سنگ (افسانے)	:	1965 کی جنگ کے پس منظر میں لکھے ہوئے افسانے۔ چوتھبر ادبی انعام یافتہ	1962
☆ چہرے (رپورتاژ)	:	مشرقی پاکستان کے آخری لمحوں کی داستان۔ آدم جی انعام یافتہ	1974
☆ ریزے (افسانے)	:	1971 کی جنگ کے پس منظر میں لکھے ہوئے افسانے	1975
☆ لمحے (ڈائری)	:	1971 میں مشرقی پاکستان کے شب و روز	1976
☆ ہم نفس (رپورتاژ)	:	مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی داستان۔ ہجری انعام یافتہ (ڈاکٹر عبدالحق انعام)	1996

(ب) دیگر ادب

نام		عنوان	پہلی اشاعت
☆ سرراہے (مزاح)	:	انشائیے اور افسانے	1964
☆ محدب شیشہ (افسانے)	:	جابر معاشرے اور اقدار میں فرد کے المیے	1964
☆ کھلونے (ناول)	:	ہمارے معاشرے میں رزم خیر و شر۔ ٹیلی ویژن سیریل "جنون" کا ماخذ	1964
☆ تکون (ڈرامے)	:	تقسیم، تقدیر اور تقدیر میں جکڑے ہوئے افراد کے المیے	1982
☆ سالگرہ (افسانے)	:	روایت سے الجھنے والی سوچ کی گونج	1996
☆ توبہ (افسانے)	:	مشکل زندگی اور پریشان فرد	2006

(ج) 1994 سے ان کے مضامین اور کالم اردو اور انگریزی روزناموں میں باقاعدگی سے شائع ہو رہے ہیں۔ ان میں وہ سیاسی اور معاشرتی مسائل پر لکھ رہے ہیں۔

اعزازات

(الف) تعلیمی

☆	ایف۔ایس۔سی (میڈیکل)	یونیورسٹی میں دوسری پوزیشن
☆	بی۔ایس۔سی	یونیورسٹی میں دوسری پوزیشن
☆	پوسٹ گریجویٹ ڈپلومہ	یونیورسٹی میں پہلی پوزیشن
☆	ایم اے انگلش	یونیورسٹی میں تیسری پوزیشن
☆	رول آف آنر (بی ایس سی) اسلامیہ کالج لاہور	

(ب)ادبی

☆ 6 ستمبر ادبی انعام۔1969 پاکستان رائٹرز گلڈ کی جانب سے افسانوی مجموعے "زرگ سنگ" پر دیا گیا۔

☆ آدم جی ادبی انعام۔1974 پاکستان رائٹرز گلڈ کی جانب سے رپورتاژ "چہرے" پر دیا گیا۔

☆ قومی ادبی ایوارڈ۔1417ھ "بابائے اردو مولوی عبدالحق ایوارڈ"
1997 اکادمی ادبیات کی جانب سے رپورتاژ "ہم نفس" پر دیا گیا

☆ ان کے ایک افسانے کا انگریزی ترجمہ 'Good Luck' کے نام سے
امریکن میگزین شارٹ اسٹوریز انٹرنیشنل میں 1985ء میں شائع ہوا۔

☆ مسعود مفتی کا نام "انٹرنیشنل آتھرز اینڈ رائٹرز ہو از ہو" میں 1982ء کے
ایڈیشن میں جو انگلینڈ سے شائع ہوا شامل ہے۔

☆ تمغۂ قائداعظم۔1968۔صدر پاکستان کی جانب سے ملک کی اہم خدمات انجام دینے کے
صلے میں (بعد ازاں حکومت نے تمام قومی اعزازات منسوخ کر دیے)

ناقدین کی آراء

میں نے ملک کے نامور ادیبوں اور شعراء سے مسعود مفتی صاحب کی شخصیت اور فن پر رائے بھیجنے کی درخواست کی تو انہوں نے اپنی قیمتی آراء سے نوازا، میں ان تمام حضرات کی انتہائی مشکور ہوں کچھ سے یہ رائے بذریعہ ڈاک موصول ہوئی جبکہ جناب امجد اسلام امجد اور جناب احمد فراز سے انٹرویو کی شکل میں مسعود مفتی کے بارے میں اپنی رائے سے نوازا۔

آصف فرخی

مسعود مفتی کے افسانے

میں شروع ہی میں یہ تسلیم کرلوں کہ مسعود مفتی میرے انتہائی پسندیدہ و چنیدہ افسانہ نگار نہیں ہیں۔ لیکن مجھے جہاں کہیں ان کا افسانہ نظر آتا ہے میں اس کو ترجیحی طور پر پڑھتا ہوں اور اس سے (اپنی بساط کے برابر) کچھ نہ کچھ سیکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کبھی اپنے موضوع کے انتخاب کی وجہ سے یا کبھی انداز بیاں اور پیرایۂ اظہار کی وجہ سے، ان کے افسانے پڑھ کر کچھ نہ کچھ سیکھنے کا موقع ضرور ملتا ہے۔ کبھی کبھی یہ سبق منفی بھی ہوسکتا ہے اس لیے کہ یہ پڑھنے والے پر منحصر ہے کہ وہ کیا سیکھتا ہے اور کیا نہیں۔ افسانہ نگار نے تو اپنا کام دکھا دیا۔ اس کے بعد کھیل ختم۔

مسعود مفتی میرے لیے دھوپ چھاؤں افسانہ نگار ہیں۔ وہ اندھیرے اجالے کی جھلمل سے کہانی کا تانا بانا تیار کرتے ہیں۔ کہیں اندھیرا غالب آنے لگتا ہے اور کہیں دھوپ کے رنگ۔

میں دراصل اس کہانی کی طرف دیر سے آیا۔ مسعود مفتی کے افسانے میرے لیے حکایت ہستی تو نہیں مگر اس حکایت کی ضرور ہیں جس کو میں نے درمیان سے سننا شروع کیا۔ میں ان کی ابتدائی کہانیاں بعد میں پڑھیں اور اس وقت تک میں نے ان کی وہ تحریریں پڑھ ڈالی تھیں جو مشرقی پاکستان اور 1971 کے آشوب کے حوالے سے تھیں۔ بس میرے لیے مسعود مفتی کے افسانوں کی معنویت اس مقام سے

شروع ہوئی۔اس آشوب کو پڑھا اور سمجھنے کی کوشش کی تو مسعود مفتی کے افسانے کلیدی حوالہ بن کر سامنے آئے۔

آشوب سے گزرنے سے بہت پہلے مسعود مفتی صاحب افسانہ نگار بن چکے تھے۔اور غالباً صاحب کتاب بھی۔لیکن ان کی اس ابتدائی دور کے افسانوں کی بازخوانی اور بازآفرینی کی جائے تو ان کا کھلنڈراپن، شوخی اور شرارت کسی اور زمانے کی بات لگتی ہے۔یہ کہانی میرے دل کو نہیں لگتی۔مگر اس کی وجہ یہ ہے کہ "محدب شیشے" سے پہلے میں "ریزے" اور "چہرے" پڑھ چکا ہوں۔مجھے اب بھی یاد ہے کہ ان کا افسانہ "صدیوں پار" پہلی بار نقوش میں پڑھا تھا۔اس وقت افسانے کے ساتھ افسانہ نگار کے نام کے صرف سوالیہ (؟) نشان شائع ہوا تھا۔(حالاں کہ سوالیہ نشان تو آج کے افسانہ نگار کے سر پر حاوی ہے)اس کہانی کو پڑھ کر جیسے ایک سنسنی سی سارے بدن میں دوڑ گئی۔یہ تو بہت بعد کی بات ہے جب میں نے اس افسانے کی تہہ میں موجود سیاسی رویے کے بارے میں اپنے ذہن میں سوالات اور شکوک وشبہات اور مایوسی و بے بسی کی ایک لہر اٹھتی ہوئی پائی لیکن اس وقت تک افسانہ اپنا نقش قائم کر چکا تھا۔

1971 کے افسانوں کے بعد مسعود مفتی کی افسانہ نگاری کا پورا ایک دور موجود ہے۔جو کئی معنوں میں اہم اور منفرد نظر آتا ہے۔اب وہ پاکستانی کی سیاسی وسماجی صورت حال سے افسانے خمیر اٹھاتے ہیں۔اس ملک کے حالات کے بارے میں غور وخوض اور یہاں کی مشکلات ومراحل ان کے لیے فنی رویہ بن جاتے ہیں۔

وہ اپنے ملک پر تشویش کو افسانہ بنا رہے ہیں۔پاکستان کا ماجرا اور واردات ان کے لیے اس طرح افسانے کے موضوع بن جاتے ہیں کہ بطور افسانہ نگار ان کا اختصاص بھی قائم ہو جاتا ہے۔

دراصل مسعود مفتی کسی ایک جگہ مطمئن اور قانع ہو کر بیٹھ جانے والے افسانہ نگار نہیں ہیں۔وہ اپنے لیے ایک منزل کے بعد اس سے اور آگے کا مقام تلاش کرتے رہے ہیں۔یہاں تک کہ خود 1971 کے بارے میں، جس سے مجھ ایسے پڑھنے والوں پر ان کی افسانوی شناخت کا بھرم قائم ہوا، ان کا رویہ اس حد تک بدلا ہے کہ اس میں مزید پختگی کے ساتھ گداز بھی آیا ہے۔اس سلسلے میں، میں ان کی ایک تازہ افسانے "آج اور کل" کی مثال دوں گا جسے بطور مدیر مجھے شائع کرنے کا اعزاز بھی حاصل ہوا۔وہ آشوب 71 کے ساتھ ختم کہاں ہوا، وہ تو آج بھی جاری اور ساری ہے۔بس اتنا ہوا ہے کہ نادیدہ قوتوں کے نام بدل گئے ہیں۔کارفرما ہاتھ آج بھی پوشیدہ ہیں۔ایک قدیم چینی حکایت کے مطابق مسعود مفتی نے آسیب کے چہرے پر روشنائی مل دی ہے۔آسیب کے خدوخال واضح ہو کر ابھر آئے ہیں اور اس میں چہرہ چہرہ ہماری کہانی ہی تو ہے

ان سے ملاقات تو کم کم ہی ہوتی ہے لیکن میں ایک مدت سے مسعود مفتی کو ایک نامور افسانہ نگار اور ممتاز دانشور کی حیثیت سے جانتا ہوں۔ میں ان کی شخصیت کے اس پہلو سے آگاہ بھی ہوں اور اس کا معترف بھی کہ وہ سچ بولنے اور دل کی بات کے برملا اظہار کی جرأت رکھتے ہیں۔ مسعود مفتی کا یہ اعزاز بھی بڑا منفرد ہے کہ انہوں نے پیشے کے اعتبار سے ایک بیوروکریٹ کی زندگی گزاری لیکن باطنی سطح پر وہ اس منصب سے مفاہمت نہ کر سکے۔ وہ اپنے قول و فعل میں اینٹی اسٹیبلشمنٹ ہیں۔ ہمارے وقتوں میں یہ ایک مشکل کام ہے اور اپنی ذات سے ایک کومٹ منٹ کے بغیر ممکن نہیں۔

مسعود مفتی کے افسانے، رپورتاژ، ادبی اور سیاسی مضامین اور اخباری کالم اپنی ایک ادبی اور ثقافتی حیثیت کے علاوہ ہمارے عہد کے اجتماعی شعور میں اضافے کا باعث بنے ہیں اور ادب کے تخلیقی سفر میں ایک آئیڈیل کی جستجو اور شناخت کا درجہ بھی رکھتے ہیں۔ مسعود مفتی اور ہم نے پاکستان کے مستقبل کا جو خواب دیکھا تھا اسے بعد میں ہم نے اپنی آنکھوں سے غارت ہوتے بھی دیکھا۔ ہمارے بس میں تو یہی تھا کہ وقت کے دفتر میں اپنی چشم دید گواہی کا اندراج کروا دیں۔ سو ہم نے یہ کیا۔ مسعود مفتی کا رپورتاژ 'چہرے' ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ پاکستان کے دولخت ہونے کا المیہ ایک نامیاتی وحدت سے انکار کا المیہ تھا، ایک زلزلے سے زمین کے ٹوٹنے کا المیہ تھا جسے مسعود مفتی نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اور اس کی شدت کو اپنے باطن سے گزار کر اس کی جزئیات نگاری کی۔ وہ تین سال بھارت میں جنگی قیدی کی صعوبتیں بھی سہتے رہے۔ اس دوران بھی انہوں نے اپنے اندر کی عدالت میں معلوم نہیں کتنی سخت پیشیاں بھگتی ہوں گی۔ ان کے بیانیہ میں اگر طنز کا عنصر زیادہ نمایاں نظر آتا ہے تو اس کی وجہ ان کی افتادِ طبع نہیں بلکہ وہ زمینی حقائق ہیں جو اُن میں تلخی پیدا کرنے کا سبب بنے۔

مسعود مفتی کی رپورتاژ 'ہم نفس' اس دور میں لکھی گئی جب ان کی تقرری ٹیکسلا میں ہوئی اور وہ وہاں پر سول سروس اکیڈمی کے دنوں کے ایک بنگالی بیچ میٹ سے ملے۔ اور ملاقات کے دوران دو پرانے دوستوں میں مشرقی پاکستان کے المیے پر مکالمہ ہوا۔ یہ ایک طویل گفتگو ہے جس میں واقعاتی شواہد کے جذباتی تجزیے ایک ذہین اور دردمند دل رکھنے والے تخلیق کار کے داخلی کرب کی ترجمانی کرتے ہیں اور ایسا مواد بھی فراہم کرتے ہیں جس سے مستقبل کا مؤرخ کوئی نتیجہ اخذ کر سکے۔

فن کے حوالے سے مسعود مفتی نے تسلسل سے ایسا افسانہ لکھا ہے جس سے کہانی اور اس کے مفہوم کی

براہ راست ترسیل ہوتی ہے اور واقعہ سبب و نتیجہ کی منطق کو برقرار رکھتا ہے۔ انہوں نے اپنے افسانے کو اپنے دور کے علامتی، اساطیری اور تجریدی تجربات سے محفوظ رکھا ہے۔

احمد فراز

میں بنیادی طور پر ایک شاعر ہوں، نقاد نہیں کہ ان کے فن پر تنقیدی رائے دے سکوں۔ خاص طور پر ناول یا افسانہ پر کیونکہ یہ میرا Field نہیں ہے۔ میں اپنے آپ کو اس کا اہل نہیں سمجھتا کہ ان کے افسانوں کے بارے میں بات کرسکوں۔ میں نے انہیں ایک قاری کی حیثیت سے پڑھا۔ وہ مجھے پسند آئے۔ اس لیے نہیں کہ وہ میرے دوست ہیں بلکہ ان کی تحریریں واقعی میرے خیالات اور آس پاس کی زندگی کی تصویر کشی کرتی ہیں۔

مسعود مفتی کے ایک قاری کی حیثیت سے میں یہ بات وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ان کا شمار ہمارے بہت بلند پایہ افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ وہ ہمہ وقت "Full Time" ادیب نہیں ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں Professional افسانہ نگاروں جیسی تصویر کشی نہیں۔ سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، احمد ندیم قاسمی اور انتظار حسین کی تحریروں سے مسعود مفتی کی تحریروں کا تقابل اس لئے نہیں کیا جاسکتا کہ ان کے موضوعات ان سے مختلف، ان کا نکتہ نظر منفرد اور اسلوب بیان مختلف ہے۔

بنیادی طور پر مسعود مفتی ایک سرکاری ملازم اور آفیسر کیڈر میں ہیں اس لئے ان کی تحریروں میں تھوڑی بہت بغاوت کے ساتھ احتیاط بھی دکھائی دیتی ہے۔ مجھے ان کی سرکاری حیثیت کے بارے میں علم نہیں البتہ ایک دو واقعات یاد ہیں۔

بحیثیت دوست اور بحیثیت ادیب۔۔۔۔۔ دونوں طرح ان کا اخلاص ان کی تحریروں اور زندگی میں چھلکتا ہے۔ سانحہ مشرقی پاکستان کے دوران ہمارے بہت سے ہم وطن ہندوستان کی قید میں اڑھائی تین برس تک رہے، مسعود مفتی بھی ان میں سے ایک تھے۔ اس دوران پاکستانی قیدی کی حیثیت سے جو کچھ ان پر گزری، ممکن ہے وہ کچھ نوٹ لیتے رہے ہوں، چہرے، لمحے، ریزے اور ہم نفس ان کی وہ تصنیفات ہیں جو ہندوستان سے رہائی پانے کے بعد منظر عام پہ آئیں۔ ان کی زمانہ اسیری کے بارے میں لکھی جانے والی تحریروں میں ان کا فن عروج پر نظر آتا ہے۔ ان کی تحریروں میں جاذبیت، گہرائی اور بصیرت کا پہلو نمایاں ہے۔

مسعود مفتی قید و بند کی صعوبتیں جھیلنے کے بعد جب نوے ہزار جنگی قیدیوں کے ساتھ واپس آئے تو وہ کافی عرصے تک اس دکھ کو بھلا نہ سکے جس کا اثر ان کی تحریروں میں بھی نمایاں ہے۔ وہ ایک دیانتدار

شخصیت کے حامل ہیں جن کے دل میں اپنے وطن کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے اور انہیں ان تمام باتوں سے جھنجھلاہٹ ہوتی ہے جو ہمارے سیاسی رہنما اپنی قوم کے معصوم اور مجبور طبقے سے روا رکھے ہوئے ہیں۔ مسعود مفتی کو بھی اسی طرح اپنی فوج کے کردار سے شکوہ ہے جس طرح بے شمار دوسرے اہلِ وطن کو ہے۔ ان کے خیال میں فوج اپنے فرائضِ منصبی ادا کرنے کی بجائے بار بار سیاسی میدان (Arena) میں آجاتی ہے اور اس طرح نہ صرف وہ فرائض کی حد سے تجاوز کر جاتے ہیں بلکہ اس اقدام سے وہ وطن کے لوگوں سے زیادتی بھی کرتے ہیں، جو مسعود یا کسی بھی صاحب شعور شہری کو دکھی کر سکتا ہے۔

مجھے مسعود مفتی کو کریکٹر سرٹیفکیٹ دینے کی ضرورت نہیں ہے کہ میں ان کی اچھائیاں بیان کروں۔ البتہ اتنا ضرور کہوں گا کہ میں جتنا مسعود کو جانتا ہوں۔۔۔ بطور ادیب اور انسان۔۔۔ وہ دونوں طرح ایک متوازن شخصیت کا مالک ہے۔ وہ اچھا دوست اور دلیر شخص ہے جو وقت آنے پر دوستوں کی صف میں وہاں کھڑا ہوتا ہے جہاں سچ کا ساتھ دینا جان سے جانے کے مترادف ہوتا ہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے ایک عملی سیاسی تحریک ''پاک جمہور'' کے نام سے شروع کی ہے۔ مجھے اندازہ نہیں کہ وہ کہاں تک اپنے قومی مقاصد کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوں گے۔ کیونکہ ان کے پاس ان اوزاروں کی کمی ہے جو جہالت، غربت، بددیانتی اور دوسری منفی طاقتوں سے مقابلہ کرنے میں کارآمد ہیں۔ وہ چاہتے ہیں جیسے بے غرض، صداقت پسند اور انسان دوست وہ خود ہیں، دنیا بھی اسی طرح ہو جائے۔

امجد اسلام امجد

مسعود مفتی کا شمار ہمارے ان ادیبوں میں ہوتا ہے جن کو وہ پذیرائی نہیں ملی جس کے وہ مستحق تھے اور ہیں۔ آغاز میں انہوں نے طنز و مزاح بھی لکھا لیکن وہ بنیادی طور پر ایک بہت باکمال افسانہ نگار ہیں اور میں یہ بات بڑے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ موجودہ عہد کے پانچ بہترین افسانہ نگاروں میں مسعود مفتی کو بلا جھجک شامل کیا جا سکتا ہے۔

سانحہ مشرقی پاکستان، ہماری قومی تاریخ کا بہت بڑا المیہ ہے۔ مسعود مفتی اس کے چشم دید گواہ رہے ہیں۔ انہوں نے جس طرح اس سارے المیے کے اندر رہتے ہوئے اس کا بیک وقت موضوعی اور معروضی مشاہدہ کیا اور اس کی تفصیلات کو تحریر میں لائے وہ ان کا بہت بڑا کمال ہے۔ مسعود مفتی نے ان تمام الجھے ہوئے معاملات کو جو اس سانحہ کا باعث بنے، بڑی گہری نظر سے دیکھا اور سمجھا ہے۔ انہوں نے نہ صرف ان حالات و واقعات کا مشاہدہ کیا بلکہ وہ اس آشوب سے گزرے بھی ہیں۔ سقوط ڈھاکہ ہماری تاریخ کا

وہ الم ناک باب ہے جو نہ صرف ہماری نسل بلکہ آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے بھی ایک مبہم تصویر کی طرح ہے جسے لوگ مزید الجھاتے چلے جا رہے ہیں۔ مسعود مفتی ان منتخب اہلِ نظر اور صاحبانِ قلم میں سے ہیں جنھوں نے ان دھندلے شیشوں کو اجالنے کی بھرپور اور کامیاب کوشش کی ہے۔

مسعود مفتی کی یوں تو بیشتر کہانیاں بڑے کمال کی ہیں لیکن میرے خیال میں "توبہ" ان کا شاہکار افسانہ ہے۔ یہ اردو ادب کا ایک ایسا شاہکار ہے جس کے بغیر بہترین اردو افسانوں کا کوئی انتخاب مکمل نہیں کہلا سکتا۔ مفتی صاحب طبعاً خاموشی پسند ہیں اور ہجوم میں نمایاں ہونے کے تو بالکل بھی خواہش مند نہیں لیکن ان کے اندر ایک زندہ ضمیر کی بھڑکتی ہوئی آگ نے ایسا بھانبھڑ لگا رکھا ہے کہ وہ قوم کو مزید بکھرنے سے بچانے کے لیے ہمہ وقت فعال اور مصروف رہتے ہیں۔

آخر میں، میں پھر اپنی آغاز میں کہی ہوئی بات کو اس طرح دہراؤں گا کہ دیر سے ہی سہی لیکن ہمیں ان کی خدمات کا وہ حق ضرور ادا کرنا چاہیے جو ہمارے ذمے ہے۔

انور سدید

اردو افسانے میں مسعود مفتی کا اظہار نہ حادثہ تھا نہ اتفاق بلکہ میری نظر میں یہ ایک سماجی ضرورت تھی۔ ہر دور میں جب اخلاق پر زوال آ جاتا ہے۔ دائم قدریں شکستہ ہو جاتی ہیں۔ انسانیت سر بگریبان نظر آنے لگتی ہے اور شخصیت کے ظاہر اور باطن الگ الگ دنیائیں تعمیر کرنے لگتے ہیں تو ایک سوچنے والے کا ظہور ابدی ہو جاتا ہے۔ یہ سوچنے والا فلسفی بھی ہو سکتا ہے اور نکتہ ور بھی۔ شاعر بھی ہو سکتا ہے اور افسانہ نگار بھی اور اس کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے تفکر کے محدب شیشے سے معاشرے کے ان داغوں کو نمایاں کرتا جائے جنھیں ہماری کھلی ہوئی مصلحت کوش آنکھیں دیکھنے سے گریز کرتی ہیں اور اگر دیکھتی ہیں تو اتنی جرأت پیدا نہیں ہونے دیتیں کہ ہم ان کی نشان دہی کر سکیں۔ اس مقصد کے لیے ہمیں ہمیشہ اس مفکر کا انتظار ہوتا ہے جو حقائق کی کڑوی گولی شکر میں لپیٹ کر ہمارے گلے سے اتارے اور ہمیں اطراف و جوانب میں پھیلی ہوئی آلائشوں کا احساس دلائے۔ اس لحاظ سے مسعود مفتی کے لیے افسانہ محض ایک شغل نہیں بلکہ ایک مقصد بھی ہے اور اسی مقصد کے حصول کے لیے اس نے "مرد ہو کر زچگی کا درد سہا ہے۔"

یہاں آپ یہ سوال ضرور کر سکتے ہیں کہ جب مسعود مفتی مفکر کا فریضہ ہی سرانجام دینا چاہتا ہے تو وہ اظہار کی سیدھی راہ کیوں اختیار نہیں کرتا۔ معاف کیجیے مسعود مفتی نے ابھی تک اپنی شخصیت کا کوئی پرت بھی خودنوشت سوانح عمری کی صورت میں بے نقاب نہیں کیا۔ اس لیے اس کے قاری کو ابھی یہ سہولت

حاصل نہیں ہوئی کہ تخلیقی عمل کے محرکات کی تلاش کے لیے اس کی زندگی کے عناصر سے معاونت حاصل کر سکے۔ اس لیے اس سوال کے جواب کے لیے اس کے افسانوں کی طرف ہی رجوع کرنا پڑتا ہے۔
مسعود مفتی کے افسانوں میں مثبت اور منفی قوتوں کا واضح تصادم قدم قدم پر ملتا ہے۔ انسان کی شخصیت ریزہ ریزہ ہو کر ہزار ٹکڑوں میں بٹ گئی ہے۔ ہر شخص نے اپنے اوپر ریاکاری کا خول چڑھا رکھا ہے جس کی تہہ کے نیچے چھپی ہوئی اصلیت کو دیکھنا ممکن ہی نہیں۔ پھر بدی کی یہ قوتیں اس قدر غالب ہیں کہ وہ نیکی کو سطح پر آنے ہی نہیں دیتیں۔ اور جب بھی خیر کے غالب آنے کا خدشہ لاحق ہوتا ہے شر کی جملہ قوتیں مجتمع ہو کر اس کی کامیابی کے تمام راستے مسدود کر دیتی ہیں۔ انسان کے اس "دوغلے پن" نے سارے معاشرے کو متاثر کیا ہے۔ چنانچہ ہر وہ چیز جس کا ظاہر نظر فریب اور جس کی اصلیت آنکھوں سے اوجھل ہے اور جس پر رائے عامہ کا دبیز غلاف چڑھا ہوا ہے، بڑی آسانی سے قبول کر لی جاتی ہے۔ اس قعرِ دریا میں مسعود مفتی نے مقاومتِ کمترین (Least Resistance) کی راہ اختیار کی ہے اور وہ تمام باتیں جو کڑوی کسیلی ہیں ایک ایسے لباس میں پیش کر دی ہیں کہ کوئی بھی محتسب انہیں گردن زدنی قرار دینے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ مسعود مفتی ہی کا قول کہ "ہمارے معاشرے میں طوائف کی بستی کو ناجائز اور برقعہ پوش طوائف کے گشت کو جائز سمجھا جاتا ہے۔" ظاہر ہے کہ جب تمام منفی قوتیں مثبت ٹھہر جائیں تو تعزیر اور احتساب کے پیمانے بھی بدل جاتے ہیں اور مفکر بھی کسی ایسے پردے کی تلاش کرتا ہے جس کی اوٹ میں رہ کر وہ بے راہروی کے الزام سے بھی بچ سکے، بارشِ سنگ سے بھی اور اپنی بات بھی برملا کہہ جائے۔ سالوں پہلے خدائے سخن میر تقی میر نے بھی گھٹن کے ایسے ہی ماحول میں دم کشی کی کیفیت محسوس کی تھی اور عشق کو سخن کا پردہ بنایا تھا۔ موجودہ دور میں مسعود مفتی نے کہانی کی صنف کو اظہار کا ذریعہ بنایا ہے اور سخن کا یہی پردہ اب اس کا فن ٹھہرا ہے۔

عذرا اصغر

ڈاکٹر انور سدید کہتے ہیں کہ "ہر اچھے افسانے کی کوکھ میں حیرت موجود ہوتی ہے۔" لیکن اس کے ساتھ ہی وہ یہ شرط بھی عائد کرتے ہیں کہ "اس حیرت کو دیکھنے یا پانے کے لیے قاری کا صاحب ذوق ہونا ضروری ہے۔" مزید وضاحت یوں کی گئی کہ "جس طرح خوبصورت منظر ہر ایک ناظر کی آنکھ پر اپنا حسن آشکار نہیں کرتا اسی طرح افسانہ بھی ہر قاری پر اپنی حیرت نہیں جگاتا۔"
میں ڈاکٹر انور سدید صاحب کی رائے سے پوری طرح متفق ہوں۔ مجھ پر مسعود مفتی کے تقریباً ہر

افسانے نے حیرت کے ایسے ہی کئی در وا کیے ہیں۔ اگر ڈاکٹر انور سدید کی مندرجہ بالا رائے درست نہ ہوتی تو آج مسعود مفتی کی افسانہ نگاری کا طوطی پورے اردو ادب میں بول رہا ہوتا۔ عہد موجود میں ایک نعرہ عام ہے۔ وہ یہ کہ "اردو ادب زوال پذیر ہے اور اچھی فکشن نہیں لکھی جا رہی۔" میرے خیال میں دونوں ہی باتیں غلط ہیں۔ اصل بات قاری کی ادب سے عدم دلچسپی ہے جہاں تک مسعود مفتی کی افسانہ نگاری کا تعلق ہے تو ان کے افسانے انسانی رویوں کی تہہ داری کی کئی جہتیں اپنے قاری پر کھولتے ہیں ان کے افسانوں کے کردار ہمارے روز مرہ میں شامل ہیں۔ مفاد پرست، اعلیٰ عہدیدار، سرکاری اور نیم سرکاری مقطع چقطع بظاہر دیندار مگر گانٹھ کے پورے افسران۔ ان کے افسانوی مجموعے "ریزے" اور "رگِ سنگ" کے افسانے المیہ مشرقی پاکستان اور 1965 کی جنگ کے پس منظر میں تخلیق کیے گئے ہیں۔ انہوں نے مشرقی پاکستان کو اپنی آنکھوں اجڑتے اور ٹوٹتے دیکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سانحہ مشرقی پاکستان پر ان کی قلمکاری عروج پر ہے۔ موثر، دلگداز اور دلدوز۔۔۔ یہ تاریخ ہے۔

"توبہ" میں وطن عزیز کے اعلیٰ عہدیداروں، منصب داروں اور کارندوں کی زندگی کی پرتیں کھلتی نظر آتی ہیں۔ یہ لوگ بظاہر ایماندار، کام کرنے کے متوالے اور دوستدار لوگ ہیں۔ لیکن اندرونِ خانہ نہایت چالباز، چاپلوس، مفاد پرست، شاطر اور کام چور ہیں جو اندر ہی اندر ملک کی جڑیں کمزور کرنے پر کمربستہ ہیں۔ ہمارے اردگرد ایسے کردار اکثر ملتے ہیں۔ ہم انہیں دیکھتے ہیں، محسوس کرتے ہیں مگر خاموش رہتے ہیں لیکن مسعود مفتی نے بنفسِ نفیس میں انہیں دیکھ کر اچھل پڑتی ہے وہ مضطرب ہوتے ہیں اور پھر ان کا موقلم وہ تصویریں پینٹ کر کے اپنے ناظرین کے سامنے رکھ دیتا ہے۔ وہ اپنا مافی الضمیر اپنے قاری کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔

اس لحاظ سے "توبہ" ان کا لاجواب اور لازوال افسانہ ہے۔ یہ افسانہ معاشرے پر گہرا طنز ہے اور پاکباز مردوں کے منہ پر زوردار طمانچہ ہے جس میں انسان کے نازک احساسات کی دلگدازی بھی ہے۔ تنگ دلی اور سفاکی بھی ہے۔ زور آور انسان دوسرے کمزور انسان کو اپنے مفاد اور اپنی لذتِ طبع کی خاطر گندگی میں دھکیلتا ہے اور وہ گندگی سے باہر نکلنا چاہے تو سہارا دینے کی بجائے پھر دھکا دے کر گڑھے میں پھینکتا ہی نہیں اس کے منہ پر تھوکتا بھی ہے۔

میرے نزدیک "توبہ" مسعود مفتی جی کا ایک نمائندہ افسانہ ہے جس کے کردار جیتے جاگتے ہمارے آس پاس موجود ہیں۔ مسعود مفتی کے افسانے اپنے عہد کی تاریخ رقم کرتے ہیں۔ ان کی زبان نہایت سادہ اور عام فہم ہے۔ ہر قسم کی گنجلک سے منزا۔

عطاء الحق قاسمی

ہمارے ہاں ادیبوں اور دانشوروں کی وہ لابی سب سے زیادہ مضبوط ہے اور اس کی جڑیں حکومت کے قائم کردہ ادبی اداروں اور انگریزی پریس تک پھیلی ہوئی ہیں جو ادب میں کسی کومٹ منٹ کا قائل نہیں ہے۔ یہ گروہ تخلیقی ادیبوں اور نقادوں پر مشتمل ہے بلکہ اس گروپ کے لکھاری بھی اعلیٰ درجے کی تنقیدی بصارت سے بہرہ ور ہیں۔ بلاشبہ یہ گروہ پڑھے لکھے افراد پر مشتمل ہے اور یوں وہ دوسروں کو قائل کرنے کی صلاحیت بھی اپنے اندر رکھتے ہیں۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اپنے نظریات سے سب سے زیادہ کومٹ منٹ بھی انہیں کے ہاں پائی جاتی ہے مگر وہ اپنے اخباری انٹرویوز اور اپنی مختلف تحریروں میں کمٹمنٹ کے تصور کو RIDICULE کرنے میں لگے رہتے ہیں مجھے کبھی اس تضاد کی وجہ سمجھ نہیں آئی، ممکن ہے انہیں صرف ان نظریات کے حوالے سے کومٹ منٹ پر اعتراض ہو جو ان کے نظریات سے مختلف ہیں، بہر حال ادیبوں اور نقادوں کا یہ طبقہ اردو ادب کے منظر نامے میں بہت اہمیت رکھتا ہے اور جو لکھنے والے اس دھارے سے الگ اپنی راہ پر چل رہے ہیں وہ ان کی آئیڈیالوجی کی فریم میں فٹ نہ ہونے کی وجہ سے ان کے نظریہ التفات سے محروم رہتے ہیں۔

مسعود مفتی کا شمار بھی انہیں لوگوں میں ہوتا ہے جو ادب کو ذہنوں میں تبدیلی لانے کا سب سے موثر ذریعہ سمجھتے ہیں اور وہ اس پر معذرت خواہانہ لہجہ بھی اختیار نہیں کرتے لیکن وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ اگر نظریہ ادب پر حاوی ہو جائے تو وہ ادب پسند پراپیگنڈہ بن جاتا ہے۔ مگر وہ اس نظرِ التفات سے بہر حال محروم ہیں جس کا ذکر میں نے ابھی کیا ہے! مسعود مفتی صف اول کے تخلیقی افسانہ نگار ہیں مجھے اُن کے ہاں کوئی لفظ ایسا نظر نہیں آتا ہے جس میں کسی پیغام کی آہٹ سنائی نہ دیتی ہو مگر افسانے کی بُنت پر مضبوط گرفت رکھنے والا یہ فنکار بیشتر صورتوں میں اپنی کسی تحریر کو پراپیگنڈہ نہیں بننے دیتا۔ وہ ''افسانہ'' نہیں لکھتا اپنے قارئین کو کہانی سناتا ہے اور اس کا قاری اس کہانی کے سحر میں گم ہو جاتا ہے مگر جب وہ واپس اپنی دنیا میں لوٹتا ہے تو محسوس کرتا ہے کہ کہانی بیان کرنے والے نے اس کی سوچ کو بھی مہمیز دی ہے اور یوں وہ چاہتا ہے کہ کہانی سننے والا اس کی کہانی سے صرف حظ نہ اُٹھائے بلکہ ان راہوں سے بھی بچ کر نکلے جس پر چلنے والی قومیں ایک دن خود کہانی بن کر رہ جاتی ہیں۔

دراصل مسعود مفتی نے مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا سانحہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور اس کے دکھ کو دل کی گہرائیوں تک محسوس کیا ہے، اس کے بعد سے یہ دردمند لکھاری اپنے کہانی سنانے کے فن اور اپنی

دانش سے اپنا وہ فریضہ انجام دیتا چلا آ رہا ہے، جس فریضے کی ادائیگی ہم سب پر فرض ہے۔ مگر ہم یہ سانحے ہوتے چلے جا رہے ہیں سو مسعود مفتی یہ فرض کفایہ ادا کرتے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ انہوں نے ادبی حلقوں میں عمومی طور پر پائے جانے والے اس خیال کو بھی رد کیا ہے کہ ادیب کا عملی سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ چنانچہ انہوں نے ایک تنظیم بھی قائم کی ہے جو ملک میں جمہوری فضا کے لیے سیاسی جماعتوں میں جمہوری اقدار کو پنپتا دیکھنا چاہتی ہے۔ میں مسعود مفتی کا ایک بہت بڑا فین ہوں مجھے یہ خوش جمال اور خوش مقال شخص بہت اچھا لگتا ہے۔ میں کہا کرتا ہوں کہ ہر وہ ادب پاکستانی ادب ہے جو غیر پاکستانی نہیں ہے مگر مسعود مفتی کے ادب کے حوالے سے میں یہ کہنا چاہوں گا کہ یہ پاکستانی ادب کا ایک ایسا خوبصورت اور جامع نمونہ ہے، جس کی نظیر فی الوقت ہمارے ادب میں موجود نہیں ہے۔ سو میں اگر انہیں پاکستانی ادب کے معماروں میں نمایاں ترین مقام کا حامل قرار دیتا ہوں تو مجھے یقین ہے کہ میری اس رائے سے اختلاف کرنے والے بہت کم ہوں گے۔

ناصر زیدی

میرے خیال میں مسعود مفتی کو خاصا نظر انداز کیا گیا ہے۔ کیوں؟ وجوہ کچھ بھی رہی ہوں مگر میری ناقص رائے میں ایسا ہی ہوا ہے، جس قدر پذیرائی کے وہ مستحق ہیں، ادب کے نقادوں کی طرف سے انہیں وہ پذیرائی نہیں مل سکی۔ شاید ایک وجہ یہ بھی ہو کہ

اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں!

ترقی پسند ادب، مزاحمتی ادب، جدید ادب اور ادب برائے ادب کے غلغلے میں انہوں نے زیادہ تر قومی ادب تخلیق کیا ہے۔ ایک اور وجہ بھی ہو سکتی ہے۔ کوئی لکھنے والا اگر دنیاوی طور پر کسی بڑے منصب پر متمکن ہو تو اکثر "ناشناس" قسم کے چھوٹے لوگ اس پر تحسینِ بے جا کے اس قدر ڈونگرے برسا دیتے ہیں کہ سچ پر بھی اعتبار نہیں رہتا۔ دوسری جانب جینوئن قسم کے نقاد اس لیے مصلحتاً "سکوت سخن شناس" اختیار کیے رکھتے ہیں کہ "بڑے منصب والے کی قصیدہ گوئی" کی تہمت سے بچے رہیں۔ دونوں صورتوں میں نقصان بہر حال حقیقی ادیب کا اور حقیقی ادب کا ہوتا ہے۔ مصطفےٰ زیدی مرحوم اس نقصان کی واضح مثال ہیں، ایک عہد ساز شاعر کو ڈپٹی کمشنری مار گئی۔!

عہد موجود کے اردو ادب میں مسعود مفتی، کسی بھی زاویے سے نظر انداز کیے جانے کے سزاوار قلمکار نہیں ہیں۔ "قومی ادب" کے حوالے سے بالخصوص وہ یہ کہنے کا استحقاق رکھتے ہیں

حُسن کو حُسن بنانے میں مرا ہاتھ بھی ہے
آپ مجھ کو نظر انداز نہیں کر سکتے

(رئیس فروغ)

انہوں نے اب تک جو کچھ لکھا سوچ سمجھ کر لکھا، پوری ذمہ داری اور دیانت داری کے ساتھ لکھا۔ انہوں نے مشاہدے اور تجربے کو توانا گویائی دی، ان کی تحریریں بولتی نظر آتی ہیں۔ ''قومی ادب'' جس قدر انہوں نے تحریر کیا ہے، اتنا بہت سے لکھنے والوں نے مجموعی طور پر بھی نہ کیا ہوگا۔ وہ خالصتاً پاکستانی یا قومی ادب لکھنے پر معذرت خواہانہ رویہ نہیں رکھتے، انہیں بجا طور پر فخر و اختصاص حاصل ہے کہ انہوں نے ۱۹۶۵ء کی جنگ اور ۱۹۷۱ء کے ''سقوطِ مشرقی پاکستان'' کے المناک سانحے کے پس منظر میں ناقابلِ فراموش ادب تخلیق کیا ہے۔

آج سے لگ بھگ چالیس برس پہلے کی بات ہے۔ مسعود مفتی نے مجھے اپنا ایک افسانہ ''دوخون'' کے عنوان سے اشاعت کے لیے بھیجا، میں اُن دنوں ماہنامہ 'ادبِ لطیف' لاہور کا مدیر تھا اور مسعود مفتی لاڑکانہ کے ڈپٹی کمشنر تھے۔ افسانے کے ساتھ ٹکٹ لگا جوابی لفافہ بھی تھا۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے پس منظر میں تحریر کردہ اس افسانے کے بارے میں انہوں نے خط میں لکھا تھا کہ ''ملک کے سب سے بڑے ادبی پرچے کے بہت بڑے مدیر نے بھی کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے چھاپنے سے معذرت کر لی ہے، امید ہے آپ بھی اسے شائع کرنے کی جرأت نہ کر سکیں گے اس لیے مناسب ڈاک ٹکٹ لگا لفافہ ہمراہ ہے تاکہ آپ افسانہ رجسٹری سے واپس کرتے ہوئے زیر بار نہ ہوں۔''

میں نے وہ افسانہ بڑے تجسس کے ساتھ پڑھا۔ پھر پڑھا اور پھر پڑھا۔ اس کے بعد جوابی لفافہ واپس کرتے ہوئے مسعود مفتی کو خط لکھا کہ '' آپ اپنی ایک اچھی سی، بڑی سی، پوسٹ کارڈ سائز تصویر فوری طور پر بھجوا دیجیے! میں یہ افسانہ شائع کر رہا ہوں۔'' چنانچہ افسانہ ''دوخون'' ''ادبِ لطیف'' کے سالنامہ ۱۹۶۸ء میں نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کیا گیا۔ مسعود مفتی کی بڑی سی تصویر بھی شروع کے آرٹ پیپر کے صفحات میں سب سے پہلے چھاپی گئی۔ یہ میرا عہدِ شباب تھا اور بقول عدیم ہاشمی مرحوم عالم یہ تھا کہ

مفاہمت نہ سکھا جبرِ ناروا سے مجھے
میں سر بکف ہوں لڑا دے کسی بلا سے مجھے

افسانے کی اشاعت کے بعد مدتوں فوجی حکومت کی طرف سے مناسب کارروائی کا انتظار رہا مگر

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

دلچسپ بات یہ ہے کہ جس افسانے کو ''خوفِ فسادِ خلق'' سے ہر بڑا مدیر (بشمول محمد طفیل مرحوم ''نقوش'' احمد ندیم قاسمی ''فنون'' ڈاکٹر وزیر آغا ''اوراق'' اور الطاف حسن قریشی ''اردو ڈائجسٹ'') چھاپنے سے گریزاں رہا تھا، وہی افسانہ جب مسعود مفتی کی کتاب ''رگِ سنگ'' میں شامل ہوا تو انہی بڑے مدیران میں سے ایک آدھ کی ججمنٹ کے سبب وہ کتاب پاکستان رائٹرز گلڈ سے ''۶ ستمبر ادبی انعام'' کی مستحق ٹھہری۔!

کہنے کا مطلب یہ تھا کہ ''چہرے'' ہو یا ''رگِ سنگ''، ''ریزے'' ہو یا ''لمحے'' یا ''ہم نفس'' ہر ہر کتاب میں ''قومی ادب'' کے سلسلے میں مسعود مفتی نے ایک بات کی ہے۔ یہ بات انہیں اپنے میدانِ ادب میں یکتا و منفرد بناتی ہے۔ اردو ادب میں ان کی پانچ وقیع کتابیں اور بھی ہیں جو مختلف ہیں متنوع ہیں مگر ''قومی ادب'' کا پلڑا زیادہ بھاری ہے اور اگر مسعود مفتی کی شناخت صرف قومی ادیب یا پاکستان ادیب کی حیثیت سے ہو تو یہ بھی بہت بڑا اعزاز ہے!

کتابیات

Ashfaq Bokhari. Facts Couched in Fiction, Book Review. Dawn-18 Oct 1996

سعید انجم۔ تبصرہ چہرے، پاکستانی ادب۔ فروری 1975ء

منیر نیئر۔ تبصرہ چہرے۔ نیرنگ خیال، راولپنڈی۔

پروفیسر نظیر احمد صدیقی ۔دیدہ تر۔۔۔ سقوط سے سکوت تک کی داستان۔ ادبی جائزے 1997ء

Prof Nazeer Siddiqi.The Master Mufti, The News 10-07-1996. Book Review. Pakistan Time 21-12-1969

اختر امان۔ نئی کتابیں تبصرہ رگ سنگ۔ اوراق

Khalid Hassain-Book Review-Muhaddab Shisha-Pakistan Times. 25-04-1965

ڈاکٹر انور سدید۔ مسعود مفتی۔۔ سوشلسٹ حقیقت نگاری کی ایک مثال۔ ماہنامہ تخلیق۔ شمارہ 1-2، 1974ء

مرغوب صدیقی۔ چہروں اور رویوں کی کہانی۔ روزنامہ نوائے وقت 7 دسمبر 1974ء

منیر احمد شیخ۔ تبصرہ سر راہے۔ ادب لطیف اکتوبر 1964ء

ڈاکٹر اسد فیض۔ انٹرویو از مسعود مفتی 2007ء

یوسف عباس۔ رپورتاژ کا تجزیاتی مطالعہ۔ فنون لاہور

خالد اقبال یاسر۔ پاکستانیت اور اردو کا نثری ادب۔ فنون شمارہ 25۔ نومبر دسمبر 1986ء

ماہنامہ اردو ڈائجسٹ۔ تبصرہ محدب شیشہ۔ ستمبر 1965

طارق محمود۔ محدب شیشہ۔ کا ایک جائزہ، ہفت روزہ قندیل۔ مئی 1965ء

نذیر قیصر۔ تبصرہ رگِ سنگ۔ بازگشت جون جولائی 1970ء
انتظار حسین۔ تبصرہ چہرے۔ روزنامہ مشرق
نعیم صدیقی۔ نقوش کا عصری ادب نمبر۔ ایک تاثر۔ ماہنامہ سیارہ۔ دسمبر 1985ء
ڈاکٹر انور سدید۔ گفتنی۔ روزنامہ خبریں۔ 20 مئی 1996ء
مسعود مفتی۔ اہلِ قلم اور عصرِ حاضر۔ مونتاج لاہور۔ شمارہ نمبر 3۔ ستمبر تا دسمبر 2007ء
مسعود مفتی۔ سرِ راہے۔ قوارتیح اسلامیہ کالج لاہور۔ 1995ء

Midhat Sayyeda, TV Talk- The Star

Prof Nazeer Siddiqui Reflections on Life and literature. Sana Publications

Ashfak Bokhari - Book Review, Ham Nafs, Dawn 18 Oct 1996

محمد کاظم۔ تبصرہ ہم نفس۔ فنون لاہور

Intizar Hussain. Point of view·The Nation, 6 Sep 1996.

مسعود مفتی۔ اور پھر وہ بھی زبانی۔ فنون لاہور۔ جولائی دسمبر 1993ء
صادق نسیم۔ روشنی چراغوں کی۔ 2007ء
مکالمہ خصوصی گوشہ مسعود مفتی۔ اکادمی ادبیات شمارہ 7-6، جولائی تا ستمبر 2007ء

Professor Nazeer Siddiqi. Review on Ham Nafs. The News July 10, 1996.

Salim ur Rahman. Book Review Sar-e-Rahay. Pakistan Times. 11 Oct 1996.

Friday Review. Another Quarter, Television The Nation, 7 Oct 1994.

Intizar Hussain, The Debacle of 1971. The Dawn 6 Sep 1996.

Prof Nazeer Siddiqi. Masood Mufti's Latest Books. 10 Jul 1996.

ماہنامہ ادب لطیف۔ تبصرہ کتاب سرراہے اکتوبر 1964
نئی قدریں۔ حیدرآباد۔ تبصرہ۔ شمارہ 6-5، 1965ء
پروفیسر محمد عارف۔ فطرت نگاری اور پاکستانی افسانوی ادب
ڈاکٹر محمد احسن فاروقی۔ تبصرہ ورگ سنگ "سیپ" کراچی
میرزا ادیب۔ "ایک فلسفی غار کے دہانے پر"۔ سیپ کراچی
محمد احسن رضوی۔ "مسعود مفتی کا طنز و مزاح۔ سیپ۔ کراچی
ماہنامہ "ادب لطیف" لاہور چالیس سالہ نمبر 1975 مدیر: ناصر زیدی
ماہنامہ "ادب لطیف" لاہور (سالنامہ 1968) مدیر: ناصر زیدی
ماہنامہ "ادب لطیف" لاہور چالیس سالہ نمبر تبصرہ "چہرے" از صباحت صبا۔ مدیر: ناصر زیدی
مسعود مفتی پر کالم "بادشمال" ناصر زیدی، مطبوعہ روزنامہ "پاکستان" اسلام آباد، 7 اکتوبر 1997
محمد طفیل۔ مسعود مفتی کی تخلیقات۔ مطبوعہ لاہور 1 عاک۔ نقوش
پروفیسر فتح محمد ملک۔ تحسین و تردید
ڈاکٹر محمد احسن فاروقی۔ پاکستانی یا قومی ادب۔ نوائے وقت 29 دسمبر 1978ء
ڈاکٹر وزیر آغا۔ مسعود مفتی ایک مزاح نگار۔ اوراق۔ جولائی 1968ء
اختر امان۔ قومی ادب کیا ہے؟ نوائے وقت
انتظار حسین۔ باتیں اور ملاقاتیں۔ روزنامہ مشرق 12 جون 1977ء
خالد اقبال یاسر۔ تبصرہ چہرے۔ فنون

اشارات